ا

دینی مدارس کا نظام تعلیم

اور سید ابو الحسن علی ندوی کی فکر

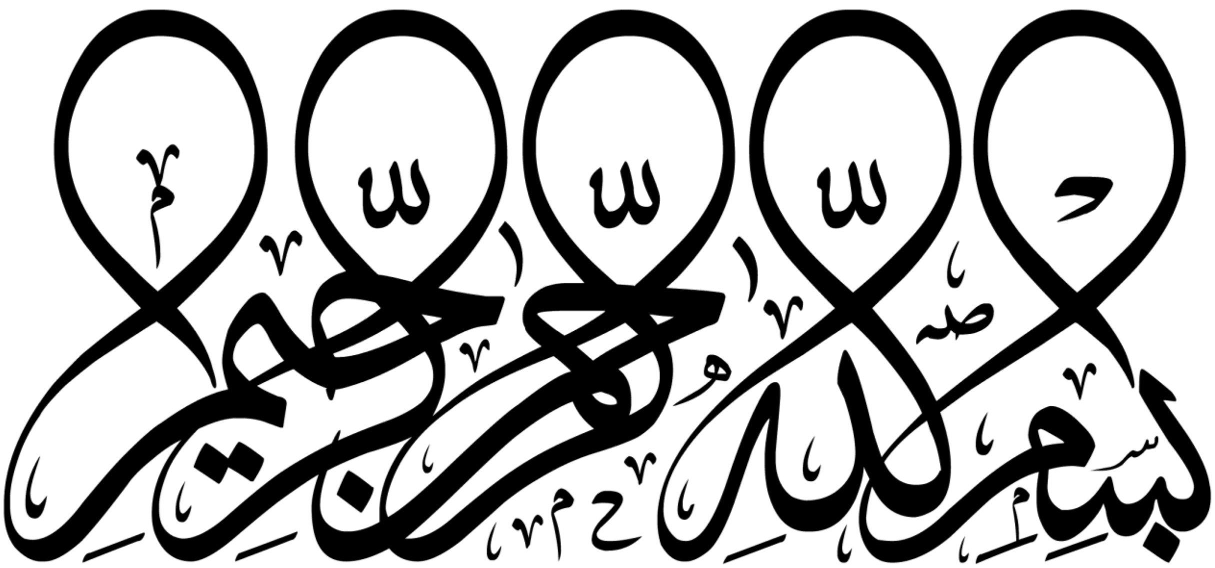
مقالہ نگار

حافظ عتیق الرحمٰن گورچانی

ایم فل اسلامیات (وفاقی اردو یونیورسٹی اسلام آباد)

مدیر جامعہ اصحاب صفہ ڈیرہ غازیخان / منتظم وحدانی نظام تعلیم فورم پاکستان

رابطہ:03135265617


بسم الله الرحمن الرحيم

انتساب

اس ذاتِ حق (باری تعالیٰ) کے نام

جس نے قلم کے ذریعہ لکھنا سیکھایا،

زبان کو بولنے کی صلاحیت دی،

بنی آدمؑ کی ہدایت کے لئے قرآن کریم جیسی عظیم کتاب عنایت کی

اور جن وانس کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا۔

اظہار تشکر

اس مقالہ کو لکھنے میں اللہ رب العالمین کا شکر گذار ہوں جس کی توفیق و عنایت کے بغیر کوئی کام کرنا ممکن نہیں ہے۔

اپنے استاد اور نگران محترم ڈاکٹر محمد عرفان کا خصوصی طور پر شکر گذار ہوں جنہوں نے مقالہ کی تیاری کے دوران مکمل رہنمائی فرمائی اور نہایت تحمل اور شفقت کے ساتھ اس کو مکمل کرنے میں ساتھ دیا۔

شعبہ علوم اسلامیہ کے دیگر اساتذہ جناب ڈاکٹر حافظ عبدالرشید(صدر شعبہ علوم اسلامیہ)،ودیگر اساتذہ جناب ڈاکٹر حبیب الرحمٰن ،اور جناب ڈاکٹر حافظ محمد سجاد کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے علم و معرفت کے دریچوں سے روشناس کرانے میں مکمل سرپرستی ور ہنمائی فرمائی۔

اس کے ساتھ ساتھ اپنے عرب اساتذہ بالخصوص مصر سے تعلق رکھنے والے جناب ڈاکٹر خالد فواد الازہری،جناب ڈاکٹر عبد المعز الازہری اور مربی و مشفق حضرت علامہ سید سلمان حسینی ندوی جن کی شفقت و محبت کے طفیل راقم علم و معرفت کی تحقیق و جستجو کے سلسلہ کو استوار کرنے میں مصروف عمل ہے۔

اس کے علاوہ والدین کریمین کی محبت و شفقت اور بیگم صاحبہ کی تائید وحمایت پر بھی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنے تعلیمی مرحلہ کی تکمیل میں معاشی واخلاقی مدد فراہم کی۔

اور اپنے دوست احباب اور محسنین کا بھی شکر گذار ہوں کہ جن کی ہمت افزائی نے تعلیم کے اس مرحلہ کی تکمیل کا باعث بنی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اساتذہ کرام،والدین، محسنین و محبین اور دوست احباب کی کوششوں کو شرف قبولیت بخشے جس کی بدولت راقم اس مقالہ کی تسوید کرنے میں کامیاب ہوا اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص کے ساتھ دین حق کی نصرت کی توفیق عنایت فرمائے۔ آمین۔

جزاکم اللہ خیر االجزاء

عتیق الرحمٰن ولد عبدالحلیم

ABSTRACT

Thoughts of Syed abu-al-Hassan Ali Nadvi regarding the education system in the religious Madaris
(Research & analysis)

The dissertation proffers a comprehensive review on the need of revision and addition to the education system prevailing in Madaris by Syed Abu-al-Hassan Ali Nadvi, a renowned scholar, intellectual and educationist of the subcontinent, who served as administrator in Dar-ul-uloom Nidwat-ul-Ulama over 50 years.

The treatise comprises to sections: preamble and five chapters. Script of the thesis is primarily based on the teachings of Syed Ali Nadvi so that the education and training system of the Madaris can be comprehended in the light of his quotes and thoughts.

Exclusively research-oriented approach has been adopted while scribing this article, so the ideas and thoughts of Ali Nadvi's predecessors, successors, contemporaries and even his students have also been taken in to account. Although the thesis writer has endeavoured to present Nadvi's thoughts and ideas in his own expressive mode, yet his original style has also been quoted within commas where need be so.

The preamble has been divided in to two parts: first one reflects the importance and need of education, while the other one portrays the intellectual and practical background of Mr.Ali Nadvi. First chapter opens up with the introduction of education system and curriculum in religious Madaris of the ancient past and occasional reforms and amendments come up, famous education centers, educational and training rendered by teachers and students. Second chapter depicts the need and impotence of curriculum and revisions necessitated therein. Third chapter incorporates review on education system of religious Madaris with true practical and practicable reforms therein. Fourth chapter elaborates educational, practical and moral services of the teachers with reference to their required guiding role for the society in true practical terms. The article is concluded with the gist of discussion, the outcome and recommendations.

Succinctly, in dissertations effort has actually been focused on elaborating such revisions in curriculum and education system as to help the teachers and students pull the Muslim community out of the whirlpool of cataclysm and introduce the eternal message of peace and reconciliation offered by Islam to the world.

فہرست عنوانات

مقدمه

مقدمہ

الحمدللہ وحدہ والصلاۃ والسلام علی سید الرسل وخاتم الانبیاء محمد وعلی آلہٖ واصحابہٖ وازوااجہٖ بناتہٖ ومن تبعھم باحسان الی یوم الدین ۔لاسیما علی الخلفاء الراشدین المھدین ۔ونحن علی ذلک لمن الشاھدین والشاکرین والحمد للہ رب العالمین۔ امابعد فاعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔اقراء باسم ربک الذی خلق ،خلق الانسان من علق ،اقراء وربک الاکرم،الذی علم بالقلم، علم الانسان مالم یعلم۔

بعد از حمد وصلاۃ!

اللہ جل شانہ نے کائنات کو تخلیق کر کے بنی نوع بشر کو اس کی قیادت وسیادت عنایت کی۔ چونکہ انسان کی فطرت ازلی کے سبب راہ ہدایت سے بھٹکنے کے امکانات زیادہ تھے اس عمل کی روک تھام وصراط مستقیم پر قائم ودائم رکھنے کے لئے رب کریم نے اپنے مقرب ترین انبیاء ورسل مبعوث فرمائے اور ان میں سے بہت سے انبیاء ورسل کو اپنے زمانہ ووقت اور علاقہ کی رہبری ورہنمائی کے لئے ہدایت نامے کتب وصحف کی شکل میں بھی عطا کر دیے۔ حضرت آدمؑ سے شروع ہونے والے سلسلہ انبیاء کو نبی آخر الزمان محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰؐ کی بعثت پر ختم کرنے کا انتظام فرمایا۔ خاتم النبیین پیغمبر حضرت محمدؐ کو تاابد تک کے انسانوں کیلئے کتاب ہدایت قرآن کریم کی صورت میں عنایت کی۔ قرآن کریم قیامت تک کے لوگوں کے لئے رہنمائی کا بنیادی مصدر وماخذ ہے تو اس کے نزول کے آغاز قرآن کریم کی سورۂ العلق کی پانچ آیات سے ہوا جس میں انسان کو پڑھنے کا حکم دیا گیا اور اس کو متنبہ کیا گیا ہے کہ علم وہ حاصل کرو جو تمہیں پیدا کرنے والے کے نام سے مرتبط رکھے۔ اور علم کے حصول کے اہم ذرائع بھی کھلے الفاظ میں بیان کر دیے گئے۔ ان آیات کے مطالعہ سے یہ امر اظہر من الشمس ہو جاتا ہے کہ امت محمدیہ کا تادم زیست سلسلہ وتعلق علم وعمل کے ساتھ جاری وساری رہے گا۔

موضوعِ تحقیق کا تعارف

سید ابوالحسن علی ندوی برصغیر کے مشہور عالم دین ہیں جنہوں نے قریباً پچاس سال تک ندوۃ العلماء کی نظامت سنبھالی اور اس کے ساتھ دنیا بھر میں داعی ومصلح کی حیثیت سے اسلام ومسلمانوں کا پیغام پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اسی بنا پر آکسفورڈ یونیورسٹی لندن، سعودیہ، شام، پاکستان اور متعدد ممالک میں اسلامی علوم کی ترویج واشاعت کے لئے مصروف عمل اداروں کے رکن وسربراہ بھی رہے۔ سید ابوالحسن اعلی ندوی برصغیر کے قدیم وجدید دینی مدارس کے نظام ونصاب اور ان کی علمی واخلاقی خدمات سے گہری شناسائی رکھتے تھے جس کی بدولت انہوں نے اصحاب مدارس، علماء ومنتظمین اور فاضلین مدارس سے خصوصی طور پر اپنی دعوتی وفکری کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے دینی مدارس کے مروجہ نصاب و نظام تعلیم میں اصلاحات کیلئے تجاویز پیش کیں۔ سید ابوالحسن علی ندوی دینی مدارس کے نظام ونصاب تعلیم کو از سر نو مرتب کرنے کے داعی تھے، تعلیم کے ساتھ تربیت کے فقدان پر شاکی تھے، مطالعہ قرآن وحدیث اور تدوین فقہ جدید کے علمبردار، علوم اسلامی کے زوال اور علماء کرام کے فکری اضمحلال پر شکوہ بلب تھے، قدیم نظام تعلیم "درس نظامی" کی خصوصیات کو بیان کر کے عہد حاضر کے مدارس کا موازنہ کرتے تھے اور اسی طرح مولانا اس امر کو بھی واضح کرتے تھے کہ علماء وفاضلین دینی مدارس کے کاندھوں پر بھاری ذمہ داری ہے کہ وہ امت کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے اشکالات و اعتراضات کے جواب دیکر ان کو مطمئن کریں۔ سید ابوالحسن علی ندوی نے برصغیر میں سرسید کے علمی نکتہ نظر، دارالعلوم دیوبند کے مؤقف، علامہ اقبال و

اکبر الہ آبادی سمیت دیگر مفکرین کی جانب سے مسلمانوں کے نظام تعلیم کے سلسلہ میں سوچ و فکر کا جائزہ بھی پیش کیا اور ملت اسلامیہ برصغیر کے اصحاب مدارس کو اپنے دائرہ کار میں اصلاحات کی ترغیب و تجویز بارہا پیش کی۔

مندرجہ بالا خصوصیات اور ان کے علاوہ دیگر بے شمار فکری و تجدیدی آراء کے پیش نظر مقالہ نگار سید ابوالحسن علی ندوی کی علمی و دعوتی سرگرمیوں پر ایم فل کا مقالہ زیب قرطاس کیا ہے۔ مقالہ نگار نے اپنی بساط کے مطابق جائزہ لے لیا تھا کہ اس موضوع پر کسی جامعہ میں علمی و تحقیقی کام نہیں ہوا تھا۔

موضوعِ تحقیق کی ضرورت و اہمیت

1۔ موجودہ دور میں ملت اسلامیہ عصر حاضر میں زبوں حالی سے دوچار ہے، اس پستی کی بنیادی وجہ نظام تعلیم کا جامع نہ ہونا ہے۔ ایک طرف تو اسلام کے نظام تعلیم و تربیت کو پسِ پشت ڈال کر مغرب کے فرسودہ نظام تعلیم کو اختیار کر لیا گیا ہے دوسری جانب مسئلہ یہ ہے کہ مروجہ نظام تعلیم صرف لکھنے پڑھنے اور کمانے کیلئے ایک آلہ کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ قرون اولی اور مسلمانوں کے عہد عروج کا نظام تعلیم زندگی کے جمیع مراحل میں رہنمائی فراہم کرتا تھا ماضی کے زریں نقوش سے شناسائی و جانکاری اور معرفت کے حصول کے لئے مجوزہ موضوع پر کام کیا ہے۔

2۔ موضوع تحقیق میں مقالہ نگار کی دلچسپی اس لئے بھی تھی کہ وہ اس موضوع پر فحص و تمحیص کے ذریعے ملت اسلامیہ کے عہد عروج کے اسباب کو پہچانا اور ان وجوہات کی کھوج لگائی کہ اہل مدارس کی جدوجہد کے راستے میں دشمن قوموں کی ریشہ دوانیاں ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ پیدا کر سکی۔ مسلمانوں نے تمام سازشی حربوں و حیلوں کے باوجود اسلام کا پھریرا سربلند کیے رکھا۔ اس سلسلہ میں یہ بھی راز منکشف ہوا کہ کسی بھی عہد میں مسلمانوں کا نظام و نصاب تعلیم تقسیم و تفریق اور انتشار کی کیفیت سے دوچار نہیں ہوا۔

3۔ مجوزہ موضوع تحقیق سے متعلق مواد بکثرت موجود تھا کہ بہت سے علماء اور اہل علم شخصیات اور علمی و تحقیقی اداروں نے کام کیا ہے۔ سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی حیات میں دینی مدارس اور اہل مدارس کے حالات و واقعات پر گہری نظر رکھنے کی وجہ سے متعدد کتب مجوزہ موضوع سے متعلق تحریر کی ہوئی تھیں جن سے استفادہ کرنے موضوع تحقیق پر کام مکمل ہوا۔

4۔ موضوع تحقیق پر کام کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس کی کہ ملت اسلامیہ کے ہر فرد کو اس موضوع سے متعلق تحقیق شدہ معلومات میسر ہو کہ دینی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم کسی بھی دور میں جامد نہیں رہا بلکہ روشن ماضی سے سبق لیتے ہوئے حال میں بھی اقبال مندی حاصل کرنے کیلئے دینی مدارس کے نظام و نصاب تعلیم کو دوبارہ از سر نو جائزہ لیکر مدون و مرتب کرنے کی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

موضوعِ تحقیق کا تاریخی پسِ منظر

یہ امر متحقق ہے کہ ملت اسلامیہ کی بقا علم سے رشتہ و تعلق کو مضبوط کرنے میں ہے تو اسی سبب چودہ سو سال سے اسلامی ممالک اور مسلم معاشرے میں علمی تحریکیں بدستور جنم لیتی رہیں ہیں جنہوں نے اپنے اخلاف کو قرآن و سنت اور اسلاف کی تعلیمات کے ساتھ ایک سلسلہ سے منسلک کیے رکھا۔ انہی علمی تحریکوں کی تاریخ برصغیر میں بھی ملتی ہے جس کا ثمر ہے کہ لاکھوں میل بلاد حرمین شریفین سے دور ہونے کے باوجود بھی یہاں کا معاشرہ اسلامی رنگ میں رنگا ہوا ہے اور مواضبط کے ساتھ دین متین پر عمل پیرا ہے۔ برطانوی استعمار کے غلبہ کے بعد انیسویں صدی عیسویں میں برصغیر کے اندر مسلمانوں کا نظام تعلیم گہری منصوبہ بندی سے متاثر کیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں ہندوستان کے ان معروضی حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے تین مختلف الجہات علمی تحریکیں ظاہر ہوئیں، دارالعلوم دیوبند جس کی قیادت مولانا محمد قاسم نانوتوی، محمڈن سکول و کالج اور بعد میں مسلم

یونیورسٹی علی گڑھ اس تحریک کی قیادت سر سید احمد خان اور ندوۃ العلماء کی سرکردگی مولانا محمد علی مونگیری نے اپنے اپنے افکار کی روشنی میں مسلم نوجوانوں کو علم وفن کے رشتوں کی لڑی میں پروئے رکھنے کا انتظام کیا۔

ندوۃ العلماء نے چونکہ اعتدال پر مبنی منہج اختیار کیا کہ قرآن وسنت اور اسلاف کی تعلیمات کی تفہیم وحفاظت کے ساتھ ساتھ وقت کے چیلنجز وحالات وواقعات سے نبرد آزما ہونے کیلئے سائنسی علوم سے بھی استفادہ کا انتظام کیا۔ اس تحریک کے ساتھ بہت سے نامی گرامی شخصیات وابستہ رہی ہیں۔ جن میں علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، حکیم سید عبدالحی حسنی ندوی، ڈاکٹر عبدالعلی حسنی ندوی وغیرہ نے ندوۃ العلماء کو علمی وفکری طور پر مستحکم کرنے میں اپنی صلاحیتیں صرف کیں۔ جب ندوۃ العلماء کی قیادت سید ابوالحسن علی ندوی کو منتقل ہوئی تو قریباً 50 سال تک وہ ندوہ کی نظامت کے فرائض انجام دیتے رہے اور ان کے عہد میں ندوہ نے شرق وغرب اور عرب وعجم پر نا صرف اپنا اثر چھوڑا بلکہ خیر وصلاح اور مفید علوم وفنون کو ندوہ قبول کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کی۔ اس کے ساتھ ہی سید ابوالحسن ندوی نے اپنی قریباً اسّی سالہ زندگی میں دنیا بھر کی علمی وفکری اور دعوتی واصلاحی تحریکوں اور تنظیموں کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ عہد جدید میں مسلم علماء ودانشوراور طلبہ کی ذمہ داریوں کو اپنی تحریر وتقریر کے ذریعہ اجاگر کرتے رہے۔ خصوصاً برصغیر کے مدارس کے نظام ونصاب تعلیم کے تغیر وتبدل اور بہتری کے داعی بھی رہے۔ اسی بناپر مقالہ نگار عصر حاضر میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کے افکار ونظریات کا تجزیاتی مطالعہ کرنا چاہتا ہے کہ وہ کون سی تبدیلیاں اور اصلاحات ہیں جن کو اختیار کرکے دینی مدارس کے طلبہ وعلماء ملت اسلامیہ کو نشاۃ ثانیہ کی شاہراہ پر ڈالنے میں معاون ومددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔

موضوعِ تحقیق کو انتخاب کرنے کی وجہ

1۔ بحیثیت طالب علم اور محقق کے رغبت تھی کہ معلوم کیا جائے سید ابوالحسن علی ندوی ماضی کے مسلمانوں کے دینی مدارس کے نظام تعلیم کو کس طرح مثالی وآئیڈیل سمجھتے تھے اور کونسی خصوصیات تھیں جن کی بدولت وہ معاشرے کی جمیع مراحل زندگانی میں زمام اقتدار سنبھالنے کی اہلیت رکھتے تھے۔

2۔ مقالہ تسوید کرتے وقت یہ معلوم ہو کہ سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر میں مسلمانوں کا قدیم دینی مدارس میں نصاب تعلیم میں جامعیت تھی کہ مدارس کے فضلاء، علم قرآن وحدیث اور علم فقہ کے ساتھ علوم عصریہ طب، ہندسہ، ریاضی، جغرافیہ اور تاریخ پر بیک وقت دسترس رکھتے تھے۔

3۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ان افکار کی بھی معرفت حاصل ہوئی کہ دینی مدارس کے نظام ونصاب تعلیم کے ساتھ تربیت واصلاح کی کوششوں میں وہ کیا انفرادیت تھی کہ ان فضلاء کو مادیت پرستی وجاہ وحشمت کی طلب خیرہ نہ کرسکی۔

4۔ مولانا ابوالحسن ندوی کی جانب سے ان تجاویز وآراء کا جائزہ لیا گیا ہے کہ موجودہ دور میں مسلمانوں کو نشاۃ ثانیہ کے قابل بنانے کیلئے مدارس اور اہل مدارس کا کیا کردار ہے۔

موضوعِ تحقیق کا بنیادی سوال

1۔ سید ابوالحسن علی ندوی بر صغیر کے دینی مدارس کے نظام تعلیم کی جامع منظر کشی کو بیان کیا گیا ہے۔

2۔ سید ابوالحسن علی ندوی نے بر صغیر کے مدارس کے نصاب تعلیم کا جو جائزہ لیا اور اس میں مطلوب ترامیم واضافہ سے متعلق جو ہدایات دیں ہیں ان کو بیان کیا گیا ہے۔

3۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کی صفات ممیزہ بیان کی ہیں جن کے سبب وہ معاشرے پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور انہوں نے بیان کیا ہے کہ اسلامی تعلیمات واخلاقیات کو اپنی زندگیوں کا لازمی جزو بنانے کی ضرورت ہے۔

4۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بر صغیر کے نظام و نصاب تعلیم پر نقد و جرح کو پیش کرنے کے ساتھ اور اس میں جمع و تطبیق کی ممکنہ صورتوں کو بیان کیا گیا ہے۔

5۔ عہد حاضر میں دینی مدارس کو کس طرح درپیش چیلنجز کا مقابلہ کرنا چاہیے اور مطلوبہ اصلاحات کو درج کیا گیا ہے۔

موضوعِ تحقیق کی تحدید

زیر بحث موضوعِ تحقیق میں بر صغیر کے مدارس کے نظام و نصاب اور تربیت و اصلاح کی کوششوں کا جائزہ لیا جائے گا جن سے متعلق مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتب میں کلام کیا ہے تا کہ کوئی محقق اس موضوع کے مشتقات پر کام کرنا چاہے تو اس کو برابر موقع مل سکے۔ اس کے ساتھ مقالہ ہذا میں مولا ابوالحسن علی ندوی کی افکار کی روشنی میں عہد حاضر میں اساتذہ وطلبہ کی ذمہ داریوں اور درپیش مسائل سے نمٹنے کے طریقہ کار پر بھی بحث کی گئی۔

موضوعِ تحقیق کے مقاصد

1۔ مقاصد تحقیق میں پہلا مقصد تو موضوع تحقیق پر کام کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام کے ذریعے تادم زیست صراط مستقیم پر گامزن رہنے کی توفیق عنایت کرے اور دین اسلام کی کماحقہ خدمت کی توفیق بخشے۔ آمین۔

2۔ اس موضوع پر کام کرنے کا ہدف و مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے عہد عروج اور عہد زوال میں دینی مدارس اور ان کے متعلقین کے کردار کی معرفت حاصل کر کے اس کو عامۃ الناس تک منتقل ہو پائے۔

3۔ مختلف طبقات کی جانب سے دینی مدارس پر عائد اتہامات کا علمی و تحقیقی انداز سے جواب پیش کیا جائے۔

4۔ دینی مدارس کے نصاب و نظام میں گزشتہ چودہ صدیوں میں جمود علمی و فکری طاری نہیں ہوا کو مدلل انداز سے ثابت کیا جائے۔

5۔ اسلامی نظام تعلیم میں کسی دور میں تقسیم و تفریق نہیں ہوئی کو ثابت کیا جائے۔

6۔ دینی مدارس کے متعلقین کی علمی و فکری اور روحانی تربیت کی اہمیت و ضرورت کو سمجھنے کی سعی کی جائے۔

7۔ موضوع تحقیق پر کام کی صورت میں فائدہ یہ ہو گا کہ اس بات کو جاننا جائے کہ مسلمان موجودہ دور کی زبوں حالی سے کیسے نبرد آزما ہو سکتے ہیں اور معاشرے میں موجود صالح کو قبول اور فاسد کو رد کرنے میں کس قدر آسانی سے فیصلہ کر سکتے ہیں۔

موضوع پر سابقہ تحقیقی کام کا جائزہ

موضوع تحقیق کو میں نے بذریعہ انٹرنیٹ اور اساتذہ سے بھی معلومات حاصل کی ہیں اب تک کی معلومات کے مطابق موضوع بحث پر جزوی و کلی طور پر کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا ہے۔ تاہم مولانا ابوالحسن علی ندوی کی دعوتی جدوجہد اور ان کی ذاتی زندگی پر تحقیقی کام بھی ہوا ہے اور کتب بھی مدون ہوئی ہیں۔

1۔ أبوالحسن علی ندوی الدعیة الحکیم والمربی الجلیل لمحمد اجتباء الندوی۔مکان الطبع:دارالقلم۔دمشق۔سن الطبع۔2001ء

2۔أبوالحسن الندوی العالم المربی الداعیة الحکیم،د۔أکرم الندوی۔مکان الطبع۔ دارالقلم۔ دمشق۔سن الطبع۔2004ء

3۔ أبوالحسن الندوی الامام المفکر الداعیة المربی الأدیب۔سید عبدالماجد الغوری۔مکان الطبع۔دارابن کثیر۔ دمشق و بیروت۔سن طبع۔2005ء

4۔ أبوالحسن علی الندوی وجہودہ فی العمل الدعوی۔محمد طاہر أحمد جان۔(رسالة ماجستیر۔الجامعة الاسلامیة العالمیة باسلام آباد)

5۔ جہود ابی الحسن الندوی النقدیہ فی مجال الادب الاسلامی۔عبداللہ بن صالح بن سلیمان الوشمی۔مکان الطبع۔مکتبة الرشید۔ریاض۔سن الطبع۔2005ء

6۔وفاق المدارس العربیہ کے نصاب کا تاریخی جائزہ، محمود الحسن، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، 2017ء

اسلوب تحقیق

1۔ موضوع تحقیق میں منہج تحقیق تجزیاتی اختیار کیا گیا ہے۔

2۔ موضوع تحقیق میں اسلوب تحقیق بیانیہ اختیار کیا ہے۔

3۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی کتب و مقالات اور خطبات مکتوبہ سے مقالہ کی تسوید کے لئے استفادہ کیا ہے۔

4۔ تحقیق کے دوران اہل علم حضرات سے بھی استفادہ کیا۔

5۔ نگران مقالہ کے مشورے اور ہدایات پر عمل کرتا رہاہوں۔

6۔وفاقی اردو یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ علوم اسلامیہ کا متعین کردہ ریسرچ فارمیٹ کی پابندی کی ہے۔

7۔ معروف لائبریریوں اور تعلیمی اداروں سے مقالہ کی تسوید کے لئے معاونت حاصل کی ہے۔

8۔ تحقیق کے دوران مکتبہ شاملہ، انٹرنیٹ اور دیگر برنامج و سافٹ ویئرز کو استعمال کیا ہے۔

خاکۂ تحقیق

باب اول دینی مدارس کے نصاب تعلیم کے بارے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ جس میں درس نظامی کے درجات، مدارس کے نصاب تعلیم اور نصاب تعلیم میں تبدیلی سے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

باب دوم، دینی مدارس کے نظام تعلیم کے بارے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ جس میں مدارس کے نظام تعلیم کی افادیت و اصلاح، نظام تعلیم میں تخصص کی اہمیت و ضرورت اور نظام تعلیم میں تبدیلی اور اس کی افادیت پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

باب سوم دینی مدارس کے اساتذہ کے کردار سے متعلق مولانا ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ جس میں مدارس کے اساتذہ کا مطلوبہ کردار، مدارس کے اساتذہ کی علمی و اخلاقی صفات اور عصر حاضر میں اساتذہ کی ذمہ داریاں پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

باب چہارم دینی مدارس کے طلباء کے کردار سے متعلق مولانا ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ جس میں مدارس کے طلبا کے اوصاف و اخلاق، طلبہ کے علمی اوصاف اور عصر حاضر میں مدارس کے طلبہ کی ذمہ داریوں پر مولانا کی فکر کا جائزہ لیا جائے گا۔

ان ابواب کے بعد موضوع تحقیق کا خلاصہ، نتائج، تجاویز و سفارشات مرتب کی جائیں گی۔ اور آخر میں مصادر و مراجع ترتیب دے کر مقالے کا اختتام کیا جائے گا۔

ابواب بندی

تمہید اول: اسلام میں تعلیم کی اہمیت وضرورت

بعثت محمدیؐ کے ساتھ ہی اسلام ومسلمانوں کا تعلق وربط علم کے ساتھ کیا ہوگا کی اہمیت کو پہلی ہی وحی میں اجاگر کردیا گیا جس میں اللہ جل شانہ نے سورت علق کی پہلی پانچ آیات میں تعلیم کے اہم ذرائع واسباب کو بیان کردیا کہ

" اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ،خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ،اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ،الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ،عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ "۔[1]

ترجمہ: توپڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، پیدا کیا انسان کو لوتھڑا سے، توپڑھ عزت والے رب کے نام سے، جس نے علم دیا قلم کے ذریعہ سے، وہ علم جس کو انسان نہیں جانتا تھا۔

گویا ان آیات میں علم ومعرفت حاصل کرنے کے لئے پڑھنے، لکھنے اور واقفیت حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ یہی نہیں کہ صرف پہلی وحی میں علم کی اہمیت بیان ہوئی یا ذریعہ تعلیم کا تذکرہ ہوا بلکہ آٹھ سو یا نو سو سے زائد مرتبہ آیات کریمہ میں علم اور اس کے مشتقات کے ذریعہ اس کی اہمیت وضرورت کو اجاگر کیا گیا ہے[2]۔ اسی طرح بہت سی احادیث نبویؐ میں بھی علم کے حاصل کرنے کی فضیلت مذکور ہے۔

تعلیم کی تعریف

برطانیہ کے ماہر تعلیم سر پرسی نین نے تعلیم کی تعریف یہ کی ہے کہ

"تعلیم کا بنیادی خیال جو پورے نظام تعلیم پر حاوی ہونا چاہیئے یہ ہے کہ تعلیم اس کوشش کا نام ہے جو بچوں کے والدین اور سرپرست اس نظریہ حیات پر اپنی نئی نسل کو تیار کرنے کے لئے کرتے ہیں، "مدرسہ" کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان روحانی طاقتوں کو جو اس نظریہ حیات سے وابستہ ہیں طالب پر اثر ڈالنے کا موقع دے اور وہ طالب علم کو ایسی تربیت دے جو اس قوم کی زندگی کے تسلسل وترقی میں طالب علم کی دستگیری کرے اور اس کے ذریعہ وہ مستقبل کی طرف اپنا سفر جاری رکھ سکے۔"[3]

فضیلت علم قرآن مجید کی روشنی میں

علم کی اہمیت وفضیلت کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں تقریباً نو سو سے زائد مرتبہ علم اور اس کے مشتق صیغوں کا ذکر کیا ہے۔ المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم کے اعداد وشمار میں درج ہے کہ قرآن کریم میں علم کا ذکر 80 مرتبہ اور علم سے نکلے ہوئے الفاظ کا ذکر سیکڑوں بار ملتا ہے۔ قرآن کریم کا ایک یہ بھی اسلوب یگانہ ہے کہ اس میں عقل کی جگہ "الباب" کا لفظ 16 بار اور "نُہیٰ" کا ذکر 2 بار آیا

---

[1]۔ سورت العلق،90/1-5

2۔ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟، سید سلمان حسینی ندوی، مجلس نشریات اسلام، کراچی، پاکستان، 2004ء، ص، 51

3۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا آرٹیکل ایجوکیشن، بحوالہ حدیث پاکستان، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام، کراچی، پاکستان، س ن، ص، 84

ہے، یہ دونوں الفاظ عقل کے معنیٰ میں استعمال ہوئے ہیں۔ عقل کے مصدر سے نکلے الفاظ قرآن میں 49 مقامات پر آئے، "فکر" کے مصدر سے نکلے الفاظ 18، "فقہ" سے نکلے الفاظ 21 بار جبکہ حکمت کا لفظ 20 بار اور برھان کا لفظ 7 مرتبہ آیا ہے۔[1]

فضیلت علم ارشاد نبویؐ کی روشنی میں

نبی اکرمؐ نے صحابہ کرام کو علم کی اہمیت اور فضیلت سے اس قدر آگاہ فرمادیا کہ صحابہ کرام اس کو حاصل کرنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہؐ کی متعدد احادیث میں علم کی فضیلت کو بیان کیا گیا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند احادیث یہاں درج کی جاتی ہیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

«من سلك طريقا يلتمس فيه علما سهل الله له طريقا إلى الجنة» [2]

ترجمہ: جو طلب علم کے راستہ پر چلے گا، اللہ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کردے گا۔

آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

«من خرج في طلب العلم فهو في سبيل الله حتى يرجع»[3]

ترجمہ: جو طلب علم میں نکلے گا، وہ جب تک واپس نہ آجائے، اللہ کے راستہ میں شمار ہو گا۔

آپؐ کا ایک ارشاد مبارک ہے کہ

" مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ، كَانَ كَفَّارَةً لِمَا مَضَى"[4]

ترجمہ: طلب علم پچھلے گناہوں کا کفارہ ہے.

اور ارشاد نبویؐ ﷺ ہے کہ

«فضل العالم على العابد كفضلي على أدناكم» [5]

ترجمہ۔ عالم کو عابد پر وہی فضیلت حاصل ہے جو مجھے ادنیٰ امتی پر۔

ایک موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا

«ألا إن الدنيا ملعونة ملعون ما فيها إلا ذكر الله وما والاه وعالم أو متعلم»[6]

1۔ تعلیم کی اہمیت سنت نبوی کی روشنی، یوسف القرضاوی (مترجم: ابو مسعود اظہر ندوی)، اسلام بک ڈپو، لاہور، 1998ء، ص7

2۔سنن الترمذی، محمد بن عيسى بن سَوْرة بن موسى بن الضحاك، الترمذي، أبو عيسى (المتوفى: 279هـ) ،(تحقيق و تعليق، أحمد محمد شاكر (جـ 1، 2) ، ومحمد فؤاد عبد الباقي (جـ 3) وغيرون)مكتبة مصطفى البابي الحلبي - مصر، 1395 هـ - 1975 م، ابواب العلم،باب فضل طلب العلم،رقم الحديث،2646، ص:28/5

3۔سنن الترمذی،ابواب العلم،باب فضل طلب العلم،رقم الحديث،2647، ص:29/5

4۔سنن الترمذی،ابواب العلم،باب فضل طلب العلم،رقم الحديث،2648،ص:29/5

5۔سنن ترمذی،ابواب العلم،باب ما جاء فی فضل الفقه على العبادة،رقم الحديث،2685،ص:50/5

6۔سنن ترمذی،ابواب الزهد،باب منه ،رقم الحديث،2322،ص:561/4

ترجمہ: دنیااور دنیا کی تمام چیزیں اللہ کی رحمت سے دور ہیں، سوائے اللہ کے ذکر، اس کے متعلقات اور عالم وطالب کے

آپ نے علم واہل علم سے متعلق جو ارشاد فرمایاان میں سے چند ارشادات یہ ہیں:

"وإن الملائكة لتضع أجنحتها رضاء لطالب العلم، وإن العالم ليستغفر له من في السموات ومن في الأرض حتى الحيتان في الماء، وفضل العالم على العابد، كفضل القمر على سائر الكواكب، إن العلماء ورثة الأنبياء، إن الأنبياء لم يورثوا دينارا ولا درهما إنما ورثوا العلم، فمن أخذ به أخذ بحظ و افر"[1]

ترجمہ: فرشتے طالب علم کے کام سے خوش ہو کر اس کے لئے اپنے پر بچھاتے ہیں، عالم کے لئے آسمان وزمین کی مخلوقات یہاں تک مچھلیاں پانی میں مغفرت چاہتی ہیں، عالم کی فضیلت عابد پر وہی ہے جو چاند کی ستاروں پر ہے، علماء انبیاء کے جانشین ہیں، انبیاء نے اپنے ترکہ میں دینار و درہم نہیں چھوڑے، انہوں نے اس علم کی میراث چھوڑی زہے نصیب جس کے حصہ میں یہ آئے۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا

" اغْدُ عَالِمًا أَوْ مُتَعَلِّمًا أَوْ مُسْتَمِعًا أَوْ مُحِبًّا وَلَا تَكُنِ الْخَامِسَ فَتَهْلَكَ "[2]

ترجمہ: عالم بنو یا طالب علم یا غور سے سننے والا، یا انس سے محبت رکھنے والا۔ جو ان میں سے کوئی نہیں وہ خطرہ میں ہے۔

اسی طرح علم کی فضیلت میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا

«العالم والمتعلم شريكان في الأجر، ولا خير في سائر الناس»[3]

ترجمہ: عالم وطالب علم دونوں اجر میں شریک ہیں، اور ان کے علاوہ کسی میں خیر نہیں۔

مندرجہ بالا احادیث کے مطالعہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیؐ نے کس قدر علم کی اہمیت کو پوری قوت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس میں وقتی مادی و سماجی مصلحت اور حکماء یونان کی عقلی موشگافیاؤں کا ذرہ بھی دخل نہیں کیونکہ یہ سب کوشش بے روح وبے اصل اور روبہ زوال ہیں جبکہ نبی اکرمؐ نے صحابہ کے دلوں میں ایمان کے شرارہ کو سلگا دیا اور ان کو علم کی افادیت واہمیت سے واقف کر دیا جس کے سبب صحابہ کرام نے اپنا سب کچھ حصول علم کی راہ میں قربان کر دیا۔[4] ذیل میں نمونہ کے طور پر چند صحابہ کرام کی علم دوستی کے نمونے درج کیے جا رہے ہیں۔

1۔سنن ترمذی، ابواب العلم، باب ما جاء فی فضل الفقه على العبادة، رقم الحديث، 2682، ص:48/5

2۔ مسند البزار المنشور باسم البحر الزخار، أبو بكر أحمد بن عمرو بن عبد الخالق بن خلاد بن عبيد الله العتكي المعروف بالبزار (المتوفى: 292ھ)، المحقق: محفوظ الرحمن زين الله، (حقق الأجزاء من 1 إلى 9)، مكتبة العلوم والحكم - المدينة المنورة، بدأت 1988م، وانتهت 2009م، حديث ابی بكرة، رقم الحديث، 3626، ص:94/9

3۔سنن ابن ماجه، ابن ماجة أبو عبد الله محمد بن يزيد القزويني، وماجة اسم أبيه يزيد (المتوفى: 273ھ)، المحقق: محمد فؤاد عبد الباقي، دار إحياء الكتب العربية - فيصل عيسى البابي الحلبي، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، رقم الحديث 228، ص:83/1

4۔ مدارس اسلامیہ کی ضرورت واہمیت، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، س ن، ص، 59

صحابہ کرام کی علم سے محبت

حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ "يا أَيُّهَا النَّاسُ عَلَيْكُمْ بِطَلَبِ الْعِلْمِ؛ إِنَّ لِلَّهِ رِدَاءَ مَحَبَّةٍ، فَمَنْ طَلَبَ بَابًا مِنَ الْعِلْمِ رَدَّاهُ اللَّهُ بِرِدَائِهِ"[1]

ترجمہ: لوگو! علم حاصل کرو۔ اللہ تعالیٰ کی ایک محبت کی چادر ہوتی ہے جو کوئی علم حاصل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے وہی چادر اُڑھاتا ہے۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک شخص نے سوال کیا جہاد سے متعلق تو آپ نے جواب دیا کہ اس سے بہتر چیز نہ بتادوں جو جہاد سے بہتر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تم ایک مسجد تعمیر کرو اور اس میں قرآن کریم کی تعلیم دو اور رسول اللہؐ کی سنتیں اور دین کی سمجھ سکھاؤ۔[2]

زر بن حبیش کہتے ہیں کہ میں صفوان بن عسال کے پاس موزوں پر مسح کرنے کا مسئلہ سننے گیا، انہوں نے مجھ سے کہا کیسے آئے؟ میں نے کہا علم کی طلب میں تو انہوں نے فرمایا کہ

" إن الملائكة لتضع أجنحتها رضاء لطالب العلم "[3]

ترجمہ: فرشتے طالب علم کے عمل سے خوش ہو کر اس کے لئے پر بچھاتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ مجھے اطلاع ملتی کہ فلاں صحابی کے پاس ایک حدیث ہے، ہو سکتا تھا کہ میں ان کو بلا بھیجوں تو وہ فوراً تشریف لے آتے اور مجھے حدیث سنا دیتے، لیکن میں خود چل کر جاتا، ان کے دروازہ پر جا کر دوپہر کے وقت پڑ جاتا، جب وہ نکلتے تو میں حدیث سنتا۔[4]

حضرت جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ مجھے ایک حدیث کی اطلاع ملی جو صرف ایک صحابی کے پاس تھی، میں نے اونٹ خریدا، اس پر کجاوہ کسا، پھر مہینہ بھر چل کر شام پہنچا، وہاں عبدللہ بن انیس انصاری کے مکان پر آیا اور ان کو اطلاع کی کہ جابر دروازہ پر حاضر ہے، انہوں نے کہلوایا کہ کیا جابر بن عبد اللہ؟ میں نے عرض کیا جی ہاں! تو وہ فوراً تشریف لائے اور ہم دونوں نے معانقہ کیا، میں نے عرض کیا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے ایک حدیث حضورؐ سے سنی ہے اور مجھے اس کے سننے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، اسی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔[5]

اسی طرح حضرت ابوایوب انصاریؓ حضرت عقبہ بن عامرؓ کے پاس ایک حدیث سننے کے لئے مصر تشریف لے گئے، انہوں نے سنا تو ملنے کے لئے آئے، حضرت ابوایوبؓ نے فرمایا کہ آپ نے آنحضرتؐ سے ایک حدیث سنی ہے اس وقت آپ کے سوا کوئی اس کا سننے والا نہیں ہے اسی کے معلوم کرنے کے لئے آیا ہوں۔[6]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں پر علم کے فضائل کو بیان کیا ہے اور اس کے حصول کی جانب مسلمانوں کو متوجہ ہونے کی تلقین کی ہے وہیں پر آپؐ نے اہل علم کو بھی ہدایت کی ہے کہ وہ علم کے منتقل کرنے میں پس و پیش سے کام نہ لیں۔ چنانچہ ارشاد نبویؐ ہے کہ

---

[1]۔ جامع بيان العلم وفضله، أبو عمر يوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر بن عاصم النمري القرطبي (المتوفى: 463هـ)، المحقق: أبي الأشبال الزهيري، دار ابن الجوزي، المملكة العربية السعودية، 1414 هـ - 1994 م، باب جامع فى فضل العلم، رقم الحديث300، ص:252/1

2۔ تعلیم کی اہمیت، ص31

3۔سنن الترمذى، باب ما جاء في فضل الفقه على العبادة، رقم الحديث، 2682، ص:48/5

4۔جامع بيان العلم وفضله، ص:188/1

5۔جامع بيان العلم وفضله، رقم 370

6۔جامع بيان العلم وفضله ، ص:1/ 187

"وإن العالم ليستغفرله من في السموات ومن في الأرض حتى الحيتان في الماء"[1]

ترجمہ: اللہ اور اس کے فرشتے آسمانوں اور زمین کی مخلوقات، یہاں تک کہ چیونٹیاں سوراخوں میں اور مچھلیاں لوگوں کو خیر کی تعلیم دینے والوں کے حق میں دعا کرتی ہیں۔

آپؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ

" لا حسد إلا في اثنتين ، رجل آتاه الله مالا ، فسلطه على هلكته في الحق ، ورجل آتاه الله حكمة ، فهو يقضي بها ويعلمها "[2]

ترجمہ: رشک کا موقع دوآدمیوں پر ہے،ایک وہ جس کو اللہ نے مال دیا اور وہ حق کے راستہ میں اس کو صرف کرنے پر اترا ہوا ہے، دوسرا جس کو اللہ نے حکمت عطا فرمائی، وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ

«نضر الله امرأ سمع منا شيئا فبلغه كما سمع، فرب مبلغ أوعى من سامع»[3]

ترجمہ: اللہ اس شخص کو تروتازہ رکھے جس نے ہم سے کچھ سنا اور جیساسنا دوسروں تک پہنچا دیا، ایسا بہت ہوتا ہے کہ جس کو پہنچایا گیا وہ اس سے زیادہ سمجھنے اور یاد رکھنے والا ہو جس نے اپنے کانوں سے سنا۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان عالی شان علم کو چھپانے والوں کی مذمت میں وارد ہوا ہے کہ

«من سئل عن علم علمه ثم كتمه ألجم يوم القيامة بلجام من نار»[4]

ترجمہ: جس سے کوئی علم کی بات پوچھی گئی اور اس نے چھپائی، قیامت کے دن اس کو آگ کی لگام دی جائے گی۔

ان ارشادات رسولؐ کا ثمر ہے کہ مدینہ منورہ مکمل طور پر غیر اصطلاحی مدرسہ کا نمونہ بن گیا تھا کہ صحابہ کرام علم کو حاصل کرنے اور اس کی تعلیم دینے میں مشغول و مصروف ہوگئے تھے۔ گویا زندگی کے جمیع شعبہ جات سے وابستگان نے خود کو کسب معاش کی ضرورت کی تکمیل اور عائلی ذمہ داریوں سے وقت نکال کر قصداً تحصیل علم میں مشغول و مصروف تھے۔[5]

مدینہ منورہ کے مضافات کی بستیوں میں بسنے والے صحابہ کرام اپنے قرب وجوار کے علمی مراکز سے استفادہ کرنے کے ساتھ آنحضرتؐ کے حلقہ تعلیم میں بھی ضرور شرکت کیا کرتے تھے بسا اوقات معاشی مجبوریوں کی وجہ سے ایک صحابی ایک روز مجلس نبویؐ میں حاضر ہوتا اور دوسرا

1۔سنن الترمذی،باب ما جاء في فضل الفقه على العبادة،رقم الحديث،2682،ص:48/5

2۔الجامع المسند الصحيح المختصر من أمور رسول الله ﷺ وسننه وأيامه = صحيح البخاري، محمد بن إسماعيل أبو عبدالله البخاري الجعفي،المحقق: محمد زهير بن ناصر الناصر،دار طوق النجاة (مصورة عن السلطانية بإضافة ترقيم ترقيم محمد فؤاد عبد الباقي)، 1422ھ،كتاب العلم،باب الاغتباط في العلم والحكمة،رقم الحديث،73، ص:/25/1

3۔سنن الترمذی،ابواب العلم، باب ماجاء فی الحث على تبليغ السماع،رقم الحديث:2657،ص:34/5

4۔سنن الترمذی،ابواب العلم، باب ماجاء فی كتمان العلم ،رقم الحديث:2649،ص:29/5

5۔ مدارس اسلامیہ، ص59-62

دوسرے روز یوں وہ تعلیمات پیغمبریؐ سے استفادہ حاصل کرتے تھے جیسا کہ سیدنا عمر فاروقؓ نے بیان کیا ہے کہ وہ اور ایک انصاری صحابی بنی امیہ بن زید دونوں باری باری مجلس حضورؐ میں حاضر ہوا کرتے تھے۔[1]

عبادت پر علم کی فضیلت

عبادت پر علم کی فضیلت یہ بھی ہے کہ بیشتر عبادات کا فائدہ صرف عبادت کرنے والوں تک ہی محدود رہتا ہے مثلاً نماز، روزہ، حج، عمرہ ،ذکر و تسبیح سے کرنے والے ہی کی نیکیاں بڑھتی ہیں اور اس کے درجات بلند ہوتے ہیں معاشرے کو اس کی عبادتوں سے براہ راست کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ جبکہ علم کا فائدہ صاحبِ علم ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ ہر سننے والے یا پڑھنے والے کو اس کا فائدہ پہنچتا ہے چاہے اس کے اور صاحبِ علم کے درمیان کتنے ہی طویل فاصلے کیوں نہ ہوں اور بیچ میں کتنے ہی صحراو سمندر اور پہاڑ کیوں نہ حائل ہوں۔[2]

منفرد علمی تحریک

اسلام نے جو علم کی اعزت افزائی کی ہے اس کی مثال کوئی اور مذہب و ملت پیش کرنے سے قاصر ہے۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ مسلمانوں نے کس طرح علم کے فروغ و حصول میں خود کو مصروف عمل رکھا کہ ان کو فنا فی العلم کہا جانے لگا تھا۔ مسلمانوں کی علم دوستی کا دائرہ زمان و مکان کی حدود و قیود سے بالاتر ہے۔ چنانچہ نامور فرانسیسی مؤرخ ڈاکٹر گستاولی اپنی کتاب تمدن عرب میں لکھتا ہے کہ:

> "عربوں نے جو مستعدی تحصیل علم میں ظاہر کی وہ فی الواقع حیرت انگیز ہے ،اس خاص امر میں بہت سی اقوام ان کے برابر ہوئی ہیں، لیکن بمشکل ان سے کوئی بازی لے سکا،جب وہ کسی شہر کو لیتے تو ان کا پہلا کام وہاں پر مسجد و مدرسہ بنانا ہوتا ،بڑے شہروں کے مدارس ہمیشہ بکثرت ہوتے ، بنجمن ولی تو ویل جو 1173ء کو مرا ہے بیان کرتا ہے کہ اس نے اسکندریہ مصر میں بیس مدرسے دیکھے ہیں۔ یہ ان کے علاوہ مدارس کی تعداد ہے جو بغداد، قاہرہ،طلیطلہ، قرطبہ وغیرہ بڑے شہروں میں دارالعلوم موجود تھے، جن میں علمی تحقیقات کے کارخانے، رصد خانے، عظیم الشان کتب خانے، غرض کل مصالح علمی تحقیقات کا موجود تھا، صرف اندلس میں ستر عام کتب خانے تھے۔ مؤرخین عرب کے اقوال کے مطابق جب الحاکم ثانی کے کتب خانے جو قرطبہ میں تھے ، چھ لاکھ جلدیں تھیں ، جن میں سے چوالیس جلدوں میں ان کی فہرست کتب تھی،اس کے متعلق کسی نے بہت درست کہا ہے کہ چار سو برس بعد چارلس عاقل نے فرانس کے شاہی کتب خانے کی بنیاد رکھی تو بمشکل وہ نو سو جلدوں سے زیادہ کتب جمع نہ کر سکا،اور ان میں مذہبی کتب کی ایک پوری الماری بھی نہ تھی۔"[3]

1۔ الجامع الصحیح البخاری،کتاب المظالم والغصب،باب الغرفة والعلية المشرفة وغير المشرفة في السطوح وغيرها،رقم الحديث: 2468،ص:133/3

2۔ تعلیم کی اہمیت، ص46-47

3۔ تمدن عرب، گستاولی،ڈاکٹر گستاولی بان،(مترجم: سید علی بلگرامی)، ص 398 تا 399،بحوالہ انسانی علوم کے میدان میں اسلام کا انقلابی و تعمیری کردار، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، پاکستان، ص 55 تا 57

علوم کی تقسیم میں نقص

علوم کی تقسیم کے لحاظ سے مسلم معاشرہ میں دو طبقے معرض وجود میں آچکے ہیں، اول طبقہ معرفت الٰہی، معرفت انبیاء، اور معرفت احکام الٰہیہ سے سراسر غفلت میں پڑا ہوا ہے، اس کو نہ صرف ان کی ضرورت کا احساس نہیں بلکہ ان کا معاند بن کر سامنے آتا ہے، دوسرا طبقہ دینی، دنیوی، شرعی و غیر شرعی اور جدید و قدیم کی خود ساختہ تقسیم میں علم کو تقسیم کر دیتا ہے اور وہ کچھ علوم اور زبانوں سے اس لئے کنی کتراتا ہے کہ وہ جدید علوم ہیں اور اس کے قدیم کو ہضم کر لیں گے اس افراط و تفریط، روایتی اثرات اور سنجیدہ غور و فکر کے فقدان نے اس مسئلہ کو جو واضح تھا مبہم کر دیا۔ [1]

علم اسماء کی تشریح

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جن اسماء کی بناپر فضیلت عنایت کی تھی ملائکہ پر ان کی شرح کرتے ہوئے امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ

> "جہاں تک معلوم کا تعلق ہے تو وہ بہت ہی اعلیٰ و ارفع ہے کیونکہ وہ اللہ رب العالمین کی ذات گرامی سے، اور اس کی تمام مخلوقات فرشتے، افلاک، عناصر، جمادات، نباتات اور حیوانات ہیں۔" [2]

اسی طرح امام رازی یہ بھی فرماتے ہیں کہ

> "اور اولاد آدم کو تمام اسماء سکھادیے، یعنی اشیاء کی صفات اور خصوصیات سکھادیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ اسم کا اشتقاق "سمۃ" یا "سمو" سے ہے، اگر سمۃ سے ہے تو اسم کے معنٰی علامت کے ہوئے اور اشیاء کی صفات و خصوصیات ان کی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں، لہذا یہ درست ہوا کہ اسماء سے صفات مراد لیے جائیں اور اگر سمو سے ہے تب بھی یہ بات ہے اور جب لغوی اعتبار سے یہ تفسیر ہے تو لازماً ماننا چاہیے کہ آیت سے یہی مراد ہے اور دوسرا قول یہ بھی مشہور ہے کہ اسماء سے مراد وہ مختلف و متنوع زبانیں ہیں جو اج رائج ہیں، جیسے عربی، فارسی، رومی وغیرہ، حضرت آدمؑ کے انتقال کے بعد جب ان کی اولاد دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل گئی، ان میں ہر ایک نے ایک زبان اختیار کرلی، تو اس خطہ میں وہی زبان رائج ہو گئی، طویل زمانہ گزر جانے کے بعد کئی نسلوں کے بعد دوسری زبانیں علاقے کے لوگ بھول گئے، اور اولاد آدم میں جو زبانوں کا اختلاف پایا جاتا ہے، اس کا یہی سبب ہے۔ [3] "

علم اسماء کے متعلق حضرت شیخ الھند محمود الحسن دیوبندیؒ فرماتے ہیں کہ خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو ہر ایک چیز کا نام مع اس کی حقیقت اور خاصیت کے اور نفع و نقصان کے تعلیم فرمادیا، اور یہ علم ان کے دل میں بلاواسطہ کلام القاء کروایا، کیونکہ بدون اس کمال علمی کے خلافت اور دنیاپر حکومت کیوں کر ممکن ہے۔" [4]

1۔ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ص57

2۔ التفسیر الکبیر، ابوعبداللہ محمد فخر الدین الرازی، 2/186، بحوالہ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟، ص58

3۔ تفسیر کبیر، ج2، ص176، دار الکتب العلمیہ طہران، ایران بحوالہ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟، ص59-60

4۔ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ص63

قرآن نے علم کے حدود ختم کردیے

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی پہلی وحی میں " اَلَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ، عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ یَعۡلَمۡ "[1] میں علم کے ذریعہ اور غیر محدود تصور کو بیان کرکے حدود و جمود کا خاتمہ کردیا ہے کہ اب کوئی فرد یہ نہیں کہہ سکتا کہ علم یہاں تک یا وہاں تک حاصل کیا جاسکتا ہے یہ یا یہ علم ہے اور یہ علم سے خارج نہیں، ہرگز علم کو محدود نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بیان کردیا ہے کہ انسان کو قلم کے ذریعہ سے علم دیا گیا اور اس بات کا علم دیا گیا ہے انسان کو جس کا اسے علم نہ تھا۔ گویا ریاضی فلکیات، طب، انجینئرنگ وغیرہ جیسے جتنے بھی علوم ہیں ان میں جو کچھ انکشافات و تطور ہو گا سبھی کا احاطہ اللہ تعالیٰ نے پہلی وحی میں کردیا ہے۔[2]

علوم وفنون انبیاء وصحابہ

اللہ جل شانہ نے قرآن کریم میں انبیاء کے علوم وفنون کا تذکرہ بھی فرمایا ہے کہ ان کو زرہیں بنانے کا حکم دیا اور اپنی شکر گزاری اور عمل صالح کی بھی تعلیم دی۔ اسلام کی بعثت کا آغاز بھی علم و قلم کے ذکر سے ہوا، جس کے سبب نبی اکرمؐ نے صحابہ کرام کو علوم نبوت کی کتابت کا حکم ملا ،غذوہ بدر کے قیدیوں کو مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کے سبب رہائی عنایت ہوئی، مسجد نبویؐ میں صفہ درسگاہ قائم کی گئی اور مدینہ منورہ میں دیگر مقامات پر بھی تعلیمی حلقے قائم ہوئے، صفہ کے طلبہ میں سکونت پذیر وغیر مقیم سبھی استفادہ کرتے تھے، صحابہ کرام نے علم کے حصول کے لئے شہروں کے سفر بھی کیے، حضورؐ کی ہدایت پر مدینہ کے قرب وجوار میں تعلیم دینے کے لئے وفود بھیجے جاتے تھے، مسجد قباء کی نگرانی خود حضورؐ فرماتے تھے، مدینہ کی مساجد میں موجود تعلیمی حلقوں کی تعلیم کا جائزہ بھی آپؐ لیا کرتے، امام کے لئے یہ شرط لازم قرار دی گئی کہ وہ صاحب علم ہو جس کی بناپر امور پیغمبریؐ پر جلد اور مؤثر عمل کیا جاتا تھا، حضورؐ نے سرکاری خط وکتابت، مردم شماری، خفیہ نامہ نگاری وغیرہ سمیت ڈھائی سو کے قریب خطوط تحریر کروائے ،صحابہ کرام کو حضورؐ نے خوشخطی کی تعلیم دی، اور خطوط پر مہر ثبت کرنے کا رواج بھی آپؐ نے شروع فرمایا، آپؐ نے صحابہ کرام کی جماعت میں سے مختلف علوم کے ماہرین کا تذکرہ بھی ملتا ہے ، حضورؐ کے زمانہ میں تعلیم مفت دی جاتی تھی اور نبی مکرمؐ نے اسلامی خلافت کی مضبوطی و تقویت کے لئے عالمی زبانوں کی مہارت حاصل کرنے کی تعلیم بھی دی تھی چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ فارسی، عبرانی اور رومی زبان کے بہترین مترجم و ماہر مشہور ہوئے۔ اسی طرح حضرت ابوہریرۃؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ حبشی زبان وفارسی پر دسترس رکھتے تھے۔[3]

عہد نبوی کا جامع نصاب

عہد نبوی وعہد صحابہ کے نصاب تعلیم کا تفصیلی تذکرہ کرنا تفصیل طلب امر ہے تاہم مدرسہ نبویؐ میں لازمی واختیاری برابر مضامین کی تعلیم کا انتظام موجود تھا۔ تاہم صحابہ کرامؓ مختلف علوم تفسیر و قرأت، حدیث، اصولِ فقہ اور فقہ، میراث وغیرہ کے علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ نشانہ بازی، تیراکی، مبادی طب، علم ہیئت، علم انساب، علم تجوید، علم لغت، علم تعبیر، علم تاریخ، علم نجوم، موسمیات وغیرہ اور قرآن کی تعلیم حاصل کرنے

1۔سورت العلق،4،5/90

2۔طالبان علوم نبوت کا مقام و مرتبہ، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، س ن، حصہ دوم، ص92-93

3۔درسگاہ صفہ کا نظام تعلیم وتربیت، تفسیر عباس، زاویہ پبلشر لاہور، 2014ء، ص273؛ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟، ص65 تا73

کے ساتھ ان کو استاد کی عزت اور طلبہ کی تکریم کا درس دینے کا اہتمام موجود تھا۔اسی طرح بچوں کی تعلیم و تربیت اور عورتوں کی تعلیم کا انتظام بھی موجود تھا کہ امہات المومنین اس فرض کو انجام دیا کرتی تھی۔[1]

اسلامی تاریخ میں علم کا فروغ

دس لاکھ مربع میل سے زائد خطہ پر محیط خلافت اسلامی میں تعلیمی مراکز موجود تھے بالخصوص حضرت عمر فاروقؓ میں نو سو مساجد میں چار ہزار سے زائد تعلیمی حلقے قائم تھے۔بصرہ کے دس ہزار سے زائد اہل علم کی تفصیلات، حضرت امیر امعاویہؓ کا تاریخ سے شغف، خالد بن یزید کا طب اور کیمیا سے ربط و تعلق حضرت عمر بن عبد العزیز نے طلبہ و اساتذہ کے وظائف مقرر کیا بنو امیہ اور بنو عباس کے دور خلافت میں تعلیمی مکاتب قائم کیے گئے اور پبلک لائبریریوں اور تجارتی کتب خانوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ خلیفہ ہارون الرشید و مامون الرشید کے زمانے میں تراجم کا اہتمام اور بیت الحکمت کا قیام عمل میں آیا اسی کی وجہ سے یونانی و ایرانی اور ہندی علوم کا تعارف مسلم معاشرہ کو ہوا اور ان کے مفسدات سے مسلمان بہت عرصہ تک نبرد آزما ہے۔[2]

مغرب کے مضر اثرات

مسلم ممالک پر مغرب کے غاصبانہ تسلط کے مضمرات کو بیان کرتے ہوئے مشہور ہندوستانی مسلمان شاعر نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا　　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

گویا اکبر الہ آبادی مغرب کے نظام تسلط کے نتیجے میں نظام تعلیم کے تبدیل ہونے سے جو مسلمان قوم کے جوانوں میں بے راہ روی جو پیدا ہوئی اس کے سبب انہوں نے کہا کہ اگر فرعون کالج بنالیتا تو بخوبی مصر کے جوانوں کو اپنے افکار و نظریات کا گرویدہ بنالیتا اس کو ہزاروں بچوں بچے قتل نہ کرنے پڑتے۔[3]

اسلامی ممالک میں اضطراب

مغرب کا نظام تعلیم دنیا کے جس بھی ملک یا جس بھی مذہب کے پیروکاروں کے پاس پہنچا تو وہاں اس طرح کی سراسمگی کی کیفیت یا پھر مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا جیسا کہ اسلامی ممالک میں مغرب کے نظام تعلیم و تربیت کو قبول کرنے کے بارے میں تردد ہوا۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شرق و غرب کے جن ممالک یا جن قوموں یا مذاہب کے پیروکار مغرب کے نظام کے با آسانی اسیر ہوئے ان کے پاس نہ تو کوئی مستقیم نظام موجود تھا یا پھر اس میں حذف و ترمیم کو قبول کرنے کی گنجائش موجود تھی جبکہ اسلامی ممالک کے پاس لاریب کتاب کتاب ہدایت کی شکل میں موجود ہونے، اور غیر متبدل عقائد و نظریات توحید و رسالت، کفر و شرک، قیادت و رہبری کے متفقہ اصولوں کی موجودگی کی وجہ سے مغرب کے غاصبانہ قبضہ کی صورت میں مسلط کیا جانے والا نظام تعلیم تربیت ہو یا نظام زندگی مسلمانوں کے لئے کسی طور پر قابل قبول نہ تھا یہی وجہ ہے کہ مغرب کے نظام حکومت و نظام

1۔ درسگاہ صفہ کا نظام تعلیم و تربیت، ص 232 تا 300، ہمار نصاب تعلیم کیا ہو؟ ص 73 تا 76

2۔ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ ص 76 تا 83

3۔ نظام تعلیم مغربی رجحانات اور اس میں تبدیلی کی ضرورت، سید ابو الحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام، کراچی، پاکستان، ص 17

تعلیم کو مسلم ملکوں میں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلمانوں کے رہبر اعظم خود خاتم النبیین سید الاولین والآخرین حضرت محمدﷺ کی ذات بابرکت تھی جیسا کہ مسلمانوں کے معروف قانون دان و مفکر علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے — غبارِ راہ کو بخشا فروغ وادئ سینا
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر — وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ [1]

جبکہ ہندوستان کے مشہور سیاستدان و پنڈت جواہر لال نہرو سے جب پوچھا گیا ان کے نزدیک ہندو کی تعریف کیا ہے تو اس نے کہا ہر وہ شخص ہندو ہے جو کہے کہ میں ہندو ہوں۔ [2]

تعلیم اور اسلامی ممالک

تعلیم ایک مسلمہ صداقت و حقیقت ہے جس کی اہمیت و ضرورت سے کوئی بھی انسان انکار نہیں کر سکتا۔ تعلیم کے ذریعہ سے اگر انسانی معاشرہ میں انتشار و فساد پنپ رہا ہے تو اس کے وجوہ کو تلاش کر کے ان کا سدباب کرنا اہل علم پر ضروری ہے۔ خاص طور پر اسلامی ممالک میں رائج جدید نظام تعلیم کے ذریعہ اگر مسلم نوجوانوں کے قلوب و اذہان میں دوری واقع ہونے کے ساتھ مسلمانوں کے مسلم الثبوت عقائد و نظریات سے دوری یا بداعتمادی پیدا ہو رہی ہے تو لازم ہے کہ اس نظام تعلیم اور طریقہ تعلیم اور مدرسین کے طرز تعلیم پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ کلیسا اور علم کی لڑائی جو تاریخی حقیقت ہے اور اس کے اثرات بد اسلامی تہذیب پر بھی مرتب ہوئے مگر وہ اپنا اثر زیادہ دیر تک قائم اس لئے نہیں رکھ سکے کہ اسلام میں علم کے حصول کی ترغیب و اہمیت تو بیان کی گئی ہے مگر اس سے تہی دامنی کو بھی قابل قبول نہیں تسلیم کیا بلکہ اسلام نے دل و دماغ کے درمیان ختم کرنے کی سعی کی تلقین کی ہے اور یہی فریضہ اسلامی ممالک کی جامعات کا ہے کہ وہ علم کی تحصیل اور اس کے مقاصد کو کھل کر بیان کریں۔ [3]

برصغیر کا امتیاز

مشرقی ممالک سے جتنے بھی لوگ مغرب کسب علم کے لئے گئے تو ان کی عددی اکثریت مغرب کے اثرات بد سے مامون نہ رہ سکی لیکن برصغیر کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں کے دانشور اہل علم نا صرف یہ کہ مغرب کے تصورات و افکار فاسدہ میں سے عرق ریزی کر کے مفید علوم و افکار حاصل کر کے واپس آئے بلکہ انہوں نے مغرب کی برائیوں کو بھی طشت از بام کر دیا جن میں سر فہرست شاعر مشرق علامہ اقبالؒ اور مولانا محمد علی جوہر شامل ہیں۔ ان ہر دو شخصیات کو مغرب کی دیدہ زیب و دلکش وضع قطع اور آزادانہ ماحول اپنا اسیر نہ بنا سکا۔ [4]

1۔ کلیات اقبال، بال جبریل، علامہ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع دہم 2011ء، ص39

2۔ نظام تعلیم، ص13-14

3۔ حدیث پاکستان، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام، کراچی، س ن، ص86 تا 90

4۔ نظام تعلیم، ص11-12

دینی مدارس کی ضرورت

مسلمہ امر ہے کہ مسلم معاشرہ کی درست رہنمائی کے لئے دین اور اس کے شرعی نظام کی حفاظت لازم ہے یہ فریضہ علماء کی جماعت سے زیادہ بہتر کوئی بھی انجام نہیں دے سکتا کہ وہ کتاب و سنت کی تعلیم و تعلم کا فریضہ بہم انجام دیتے ہیں اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی ملک ہو یا غیر اسلامی ملک میں مقیم ہر دو صورت میں مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ دینی مدارس کے قیام پر توجہ مرکوز رکھیں تاکہ ملت اسلامیہ کی زندگی کے تمام میدانوں میں رہنمائی کرنے والے افراد میسر آسکیں۔ خلافت راشدہ کے زمانہ سے لیکر مسلمانوں کے عہد عروج تک برابر تربیتی مراکز قائم رہے جہاں سے کسب فیض کرکے افراد اسلامی ریاست کو مضبوط بنانے میں اپنا کلیدی کردار ادا کرتے تھے۔ جب مسلمان غیر مسلم ملک میں مقیم ہوں تو اس کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے کہ ایسی دانش گاہ موجود رہے مسلم معاشرے میں جو اسلامی حکومت کا نعم البدل اور قائم مقام ہو سکے۔ جیسے کہ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے مغل حکومت کے زوال کے ایام میں دینی مدارس کو فعال و متحرک کرکے مسلم ریاست کو تقویت پہنچانے کے لئے اقدامات کیے۔[1]

مثالی مدرسہ

حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ و مدینہ میں صحابہ کرام کی تعلیم و تربیت کے لیے جو مدرسہ قائم کیا اسی کو مثالی مدرسہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس مدرسہ کی تاسیس ایمان و دعوت دین کے محرک جذبوں اور پختہ عقائد پر کی گئی۔ نبی اکرمؐ نے بزور قوت یا مادی پیشکش کی بجائے صحابہ کرام پر علم کی اہمیت و ضرورت کو واضح کیا اور اس کے عالم و جاہل کو فرق کو واضح کرنے کے ساتھ نہ دکھنے والے ثمر آور کلمات کی محبت اس طور پر صحابہ کے سینے میں موجزن کی کہ وہ ثواب، رضائے الٰہی، نجات اخروی اور دارین کی فوز و فلاح سے محبت کرنے میں محو اس قدر ہوئے کہ دنیا کی تمام راحتوں کو قربان کرکے حصول علم میں مگن ہو گئے۔ حضرت جندب بن عبداللہ نے بیان کیا ہے کہ

«فتعلمنا الإيمان قبل أن نتعلم القرآن، ثم تعلمنا القرآن فازددنا به إيمانا»[2]

ترجمہ: رسول اللہؐ نے ہمیں پہلے ایمان سکھایا اور پھر ہمیں قرآن کی تعلیم دی جس سے ہمارے ایمان میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔

آپؐ نے صحابہ کے دلوں میں اس قدر بہتر زندگی کی محبت بٹھادی کہ وہ صحابہ یہ سمجھ گئے کہ حقیقی راحت کے لئے ضروری ہے کہ وہ علم کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنالیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ " **قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ** "[3] کیا صاحب علم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟ اور

1۔ مدارس اسلامیہ، ص 21-22

2۔سنن ابن ماجه،ابن ماجة أبو عبد الله محمد بن يزيد القزويني، وماجة اسم أبيه يزيد (المتوفى: 273هـ)،المحقق: محمد فؤاد عبد الباقي،دار إحياء الكتب العربية - فيصل عيسى البابي الحلبي،س ن،افتتاح الكتاب في الإيمان وفضائل الصحابة والعلم،باب في الايمان،رقم الحديث:61،ص:23/1

3۔سورت الزمر،9/39

ارشاد خداوندی ہے کہ "إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ "[1] اللہ سے علم رکھنے والے ہیں ڈرتے ہیں۔اور ارشاد ربانی ہے کہ "وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ [2]" ان باتوں کو علم والے ہی سمجھتے ہیں۔[3]

مدرسہ کا مقصد

دینی مدرسہ میں داخل ہونے والے طالب علم پر لازم ہے کہ وہ اپنے پیش نظر مقصد تعلیم کو مستحضر کرلے، کسی بھی مدرسہ کی یہ تعریف درست نہیں کہ وہاں ایک خاص زبان کی تعلیم دی جاتی ہے جس سے وہ عربی کی کتب کی معرفت حاصل کرکے دنیاوی فائدہ کا سامان حاصل کیا جائے درحقیقت یہ مدرسہ کی تعریف ہرگز نہیں کیونکہ اس طرح کے مراکز تو بہت موجود ہیں، مدارس کی درست تعریف یہ ہے کہ انسان اور خدا کے درمیان ایک مضبوط رشتہ قائم ہوجائے اور سچ تو یہی ہے کہ انسان (طالب علم) اور اللہ کے درمیان بلاواسطہ کی کڑی موجود ہے جس سے انسان اللہ تعالی کی نصرت سے سرفراز رہتا ہے۔اسی نیک وایک مقصد کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے والا ہے رضا الٰہی سے فیضاب ہوسکتا ہے[4]

مدرسہ کیا ہے اور اس کی ذمہ داری

دینی مدرسہ کا مقام و مرتبہ معاشرہ میں سب سے بلند ہے کہ یہاں پر افراد سازی کا کام سرانجام دیا جاتا ہے، مدرسہ کسی بھی زمان و مکان کی حدود کا پابند رہنے اور جمود کی کیفیت اختیار کرنے کا متحمل نہیں بلکہ اس کو انسانی زندگی کو بہتر سے بہتر بسر کرنے کی رہبری کا سامان کرنا ہوتا ہے اور اس کا رشتہ نبوت محمدیؐ کے طفیل کردار عالمگیر ہے، مدرسہ نبوت محمدیؐ سے فیضیاب ہوکر انسانوں کو سیراب کرنے کا کام انجام دیتا ہے، وقت وحالات کے تھپیڑوں سے مرعوب و متاثر ہونے کی بجائے خود ان کو سدھارنے کا سامان مدرسہ ہی مہیا کرتا ہے، الغرض معاشرہ میں جمیع بدیوں کا سدباب اور تمام نیکیوں کا فروغ مدرسہ ہی کے طفیل وقوع پذیر ہوتا ہے۔[5]

مدارس کا تذکرہ قرآن میں

آج کل بہت سے لوگ یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ قرآن میں سب کچھ ہے، علوم وحقائق اور مختلف قوموں کے حالات وخبریں موجود ہیں تو کیا قرآن کریم میں مدارس و جامعات کا بھی تذکرہ موجود ہے؟ جبکہ ہمارا مطالعہ تو یہ بتاتا ہے کہ قرآن کریم میں جامعہ و مدرسہ کا نام تو موجود نہیں! تو پھر یہ مدرسے کہاں سے آئے؟ اور کب سے؟ یہ کہاں سے نکالے گئے؟ کیسے ان کو قائم کیا گیا؟ اور یہ دانش گاہیں اور جامعات کب سے قائم ہوگئے؟ یہ تعلیم و تعلم کے مراکز، یہ کتابوں کا مطالعہ، ان میں مخصوص علوم ہیں قرآن فہمی کے لئے، حدیث کے لئے ان کا پڑھنا، ان میں سالہاسال لگالینا، اپنے کو اس کے لئے وقف کردینا اور یکسو ہوجانا، اپنے گھروں پہ نہ کمائی کرنا، اور نہ کوئی دوسرا فن سیکھنا، اور نہ کسی دوسری مشغولیت کو اختیار کرنا، اس کا قرآن مجید میں کہاں ذکر آیا ہے؟ تو ہم کہیں گے اپنے مطالعہ کی بناپر اور قرآن مجید سے جو توفیق الٰہی سے فہم حاصل ہوا اس کی بناپر کہ دینی مدارس و جامعات کا

1۔سورت فاطر۔28/35

2۔سورت العنکبوت،43/29

3۔مدارس اسلامیہ، ص55 تا57

4۔پاجا سراغ زندگی، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، س ن، ص29

5۔پاجا سراغ زندگی، ص94-96

تذکرہ اس آیت میں موجود ہے "**وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ**"[1]۔اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ایمان والوں میں سے کچھ لوگ نکل کر دین کی تعلیم کا فہم حاصل کریں اور پھر اپنی قوم میں واپس آکر دین کی تعلیم دیں تاکہ وہ اللہ سے ڈر محسوس کرنے لگیں۔[2]

1۔سورت التوبہ،122/9

2۔طالبان علوم نبوت کا مقام، حصہ دوم، ص136-137

تمہید ثانی: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا تعارف

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی برصغیر کے مشہور و معروف عالم دین اور داعی اسلام تھے، مولانا نے اپنی زندگی کے شب و روز مسلم امہ کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے میں صرف کی۔ مولانا نے مسلمانوں کی فکری و نظریاتی اصلاح کے لئے ضروری قرار دیا کہ مسلم نوجوانوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی جائے اور دینی تعلیم کا انتظام تمام ضروریات زندگی سے زیادہ توجہ حاصل کرنے کا ضامن ہے۔ مسلمان کو اس بات کا حقدار سمجھتے تھے کہ مسلمان زمانہ کے لوگوں کی ہمہ جہتی بنیادوں پر انسانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا تصور تعلیم پر بحث سے قبل مولانا کی شخصیت کا اجمالی خاکہ درج کیا جانا ضروری ہے کہ پچاس سال سے زائد ندوۃ العلماء لکھنو انڈیا کے علاوہ دنیا بھر کی عظیم جامعات و تنظیمات کے رکن و سربراہ رہنے والی شخصیت کے افکار کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندی کا خاندانی پس منظر

مولانا سید علی میاں (المعروف ابوالحسن علی حسنی ندوی) 1333ھ بمطابق 1914ء میں عبدالحی حسنی ندوی اور خیر النساء کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ کے والدین شریعت مطہرہ پر زندگی بھر عمل پیرا رہے۔ ان کی دو سگی بہنیں تھیں اور ایک بھائی ڈاکٹر عبد العلی حسنی ندوی تھے۔ والد کی وفات کے وقت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی عمر 8 سال تھی۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے خود اپنی ذاتی زندگی پر کتاب بھی لکھی جس میں خاندانی پس منظر بتایا اور لکھا کہ ان کا تعلق متوسط گھرانہ سے تھا بسا اوقات طعام و شراب کی قلت سے بھی دوچار رہتا تھا۔ [1]

مولانا ابوالحسن علی ندوی کا نسبی تعلق رسول اللہؐ کے نواسے حضرت حسنؓ بن علیؓ سے ملتا ہے، مولانا کے اجداد میں سے سید قطب الدین محمد المدنی ہندوستان آئے جن کے جد امجد محمد ذوالنفس الذکیہ تھے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے خاندان کی امتیازی صفات میں سے یہ ہے کہ وہ شیعت و خارجیت کی افراط و تفریط سے دور رہتے ہوئے خالص دین وسط پر عمل پیرا رہے اور خود کو شریعت اسلامیہ کا محافظ و حمیت رکھنے والا ثابت کرتے رہے کبھی بھی اس خاندان نے شرک و بدعت اور گمراہی کے سیاہ بادلوں کو اپنے قریب بھٹکنے نہ دیا۔ مولانا کے اجداد میں برصغیر میں اسلامی تعلیمات کو زندہ و جاوید رکھنے اور محفوظ بنانے کی جدوجہد کرنے والے مجاہد سید احمد شہید بھی شامل ہیں جن کو اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد میں بالاکوٹ میں دوران جنگ شہید کر دیا گیا۔ [2]

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی شخصیت سازی

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا نسب نواسہ رسولؐ حضرت سیدنا حسن بن علیؓ سے منسلک ہونے کی وجہ سے ان کا خاندان کاربند شریعت رہا۔ آپ کے دادا سید فخر الدین اور نانا سید ضیاء النبی عالم دین، صوفی بزرگ اور باہم دوست تھے۔ آپ کے والد کی پہلی بیوی فوت ہوئی تو دادا فخر الدین

1۔ کاروان زندگی، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، س ن، ج 1، ص، 333

2۔ ایضاً، ص 29-30

سید ضیاالنبی کے پاس گئے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح عبدالحی سے کر دیں۔ سید ضیاء النبی شاہ باوجود یہ جاننے کے حکیم فخر الدین کا گھرانہ معاشی طور پر غیر مستحکم ہے، صرف دینداری کی وجہ سے انہوں نے اپنی بیٹی خیر النساء کی شادی حکیم عبدالحی حسنی سے کرادی۔[1]

مولاناسید ابوالحسن علی ندوی کے والد بہت بڑے عالم اور مشہور حکیم و معالج تھے، وہ صاحب علم و فضل ہونے کے ساتھ بہت سی تاریخی وسوانحی کتابوں کے مصنف بھی تھے، اسی طرح مولاناسید ابوالحسن علی ندوی کی والدہ بھی متبع شریعت خاتون تھیں، صوم و صلاۃ کی پابندی کے ساتھ قرآن حکیم کی تلاوت و اذکار و وظائف کا اہتمام کرتی تھیں۔ والدین کی یہ صفات حسنہ مولاناسید ابوالحسن علی ندوی میں بھی منتقل ہوئیں کہ وہ زندگی بھر اسلامی تعلیمات پر ناصرف عمل پیرا رہے بلکہ اس کو فروغ دینے میں تمام عمر جدوجہد کرتے رہے۔[2]

سید ابوالحسن علی ندوی کی تعلیم و تربیت

مولاناسید ابوالحسن علی ندوی نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر ہی سے حاصل کی کہ اپنی والدہ سے قرآن کریم کی ابتدائی سورتیں حفظ کی، اردو کی تعلیم مولوی اسماعیل میرٹھی، فارسی کی تعلیم مولوی محمود علی، عربی کی تعلیم مولوی خلیل عرب یمنی بھوپالی سے حاصل کی جبکہ انگریزی زبان کی تعلیم اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی سے حاصل کی۔ اس کے ساتھ تعلیم الاسلام، نورالاسلام، رحمت للعالمین اور سیرت خیر البشر پڑھنے کے بعد اپنے استاد شیخ خلیل عرب کے مشورہ سے جامعہ لکھنو میں داخلہ لیا اور وہاں سے 1929ء میں فاضل ادب و حدیث کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد مولاناسید ابوالحسن علی ندوی نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا اور وہاں بہت سے علماء کرام سے علمی استفادہ کیا جن میں مولانا حیدر حسن خان، علامہ تقی الدین ہلالی شامل ہیں، اسی طرح مولانا نے مولانا احمد علی لاہوری، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا اعزاز علی ندوی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور علامہ انور شاہ کاشمیری کی علمی مجالس میں بھی شرکت کرتے رہے۔ مولانا نے ان علماء کرام سے علم تفسیر، علم حدیث، تاریخ و عقیدہ وغیرہ میں اکتساب فیض کیا۔[3]

مولاناسید ابوالحسن علی ندوی نے بہت سے علماء و صوفیا کی مجالس میں شرکت کی، ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ انسان کو اپنے دل کی اصلاح کا اہتمام کرنا چاہیے کہ بجز انسان روحانی فیض سے محروم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا احمد علی لاہوری، مولانا عبدالقادر رائے پوری، شاہ یعقوب مجددی، مولانا محمد احمد بہاولپوری اور مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی کی مجالس تزکیہ و اصلاح میں شرکت کرتے تھے۔ مولانا عبدالقادر رائے پوری نے ان کو چاروں سلاسل تصوف کی خلافت دی تھی اور مولانا احمد علی لاہوری نے قادریہ سلسلہ کی اجازت خلافت دی تھی۔[4]

تدریس کا آغاز

تعلیم سے فراغت کے بعد مولاناسید ابوالحسن علی ندوی نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس کا آغاز کیا انہوں نے تفسیر حدیث و ادب کی کتب کی تدریس کی۔ مولانا نے ہندوستان میں مسلمانوں کے عائلی قوانین کی حفاظت کے لئے مسلم پرسنل لاء بورڈ قائم کیا۔ برادران وطن کے ساتھ

1۔ کاروان زندگی، ج1، ص130

2۔ سید ابوالحسن علی ندوی کی تشکیل کے اسباب، مولاناسید سلمان ندوی، بحوالہ نذرانہ عقیدت، فضل ربی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، ص150

3۔ مولاناسید ابوالحسن علی ندوی کی تشکیل کے اسباب، ص155-157

4۔ ایضاً، ص152-171

انسانی بنیادوں پر رشتہ کو مستحکم کرنے کے لئے تحریم پیام انسانیت بھی شروع کیا۔ مولانا نے اسلا کی دعوت کو دنیا بھر میں پہنچانے کا بیڑا اٹھایا تو اس کے لیے ان کو عرب و غرب کے ممالک کے دعوتی اسفار کرنے پڑے اس وجہ سے انہوں نے تدریس کو خیر باد کہا۔ انہوں نے مسلم عوام اور مسلم حکمرانوں کو اسلامی تعلیمات پر سختی سے عمل پیرا ہونے کی دعوت دی کہ اسی ذریعہ سے مسلمان اپنے عہد رفتہ کو دوبارہ واپس لے کر عظیم اسلامی حکومت قائم کرسکتے ہیں۔ [1]

دعوتی اسفار

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تبلیغی جماعت کے سربراہ مولانا الیاس سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اس تعلق کی بدولت مولانا نے اپنی زندگی کا پہلا دعوتی سفر حجاز مقدس کی طرف 1948ء میں کیا یہ سفر چھ ماہ کے دورانیہ پر مشتمل تھا اس کے بعد مولانا نے مصر کا سفر 1950ء میں کیا۔ سفر مصر سے قبل مولانا جماعت اخوان المسلمون اور اس کے بانی حسن البناء کے فکر و عمل سے بہت متاثر تھے سوئے اتفاق ہے کہ مولانا کے سفر سے پیشتر مصر کی ظالم حکومت نے شیخ حسن البناء کو بے دردی کے ساتھ شہید کر دیا تھا۔ مولانا کا مطالعہ جماعت اخوان المسلمون کے سبب یہ معلوم ہوا کہ تحریر و تقریر کی بجائے انسان کو عملی زندگی بسر کرنی چاہیے اور شریعت مطہرہ کے مطابق اپنی زندگی ڈھالنی چاہیے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ملاقات شیخ حسن البناء کے والد اور ان کے دوست و جماعت کے اراکین سے ملاقات ہوئی۔ مولانا کے دعوتی اسفار کا سلسلہ شرق و غرب کے مسلم و غیر مسلم ممالک تک پھیلا ہوا ہے کہ مسلم قوم کو دور و قریب سے باہم مرتبط رہنے اور ایک بیدار و قوی امت بنانے کی جدوجہد کرتے رہے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں میں امت کے معاشرتی و سماجی مسائل کے حل کی جستجو کو یقینی بنانے کے لئے رابطہ عالم اسلامی کی داغ بیل بھی ڈالی۔ [2]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے دعوتی دوروں کے دوران متعدد سربراہان مملکت سے ملاقات بھی کی تھیں۔ ان میں سے ایک ملاقات کے متعلق مولانا کے رفیق خاص و عزیز مولانا محمد رابع حسنی ندوی بتاتے ہیں کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ایک بار سعودی عرب کے حاکم و سربراہ مملکت شاہ فیصل سے ملاقات کی تو شاہی محل میں داخل ہوتے ساتھ ہی مولانا نے شاہ فیصل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آج یہاں آتے ساتھ ہی میرا ذہن صدیوں پہلے کے حالات و واقعات کی جانب منتقل ہوا کہ اس وقت کے بادشاہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کر کے رعایا کی تن آسانی کا سامان تیار کرتے تھے۔ اب تو حالات یہ ہے کہ بادشاہ خود تو خوشحال ہیں اور رعایا خستہ حال و غربت و افلاس کی صورت میں مبتلا ہو چکی ہے۔ مولانا رابع حسنی بتاتے ہیں کہ مولانا جب اپنی بات پوری کر چکے تو شاہ فیصل کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اس نے مولانا ابوالحسن سے کہا کہ پہلے زمانے کے بادشاہ و سربراہ اس لئے راست روی پر مواضبط اختیار کیے ہوئے تھے کہ وہ متقی و پرہیز گار تھے اور علماء حق ان کی مجالس میں حاضر ہوتے تھے۔ آپ ہم پر شفقت کیجیے کہ ہمارے پاس آتے رہا کریں تا کہ آپ کی نصیحتوں سے استفادہ کیا جاسکے۔ اس کے بعد شاہ فیصل نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لئے رقم دینا چاہی تو مولانا ابوالحسن علی ندوی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اللہ کا شکر ہے ندوۃ العلماء اللہ کی رضا کے لئے قائم کیا گیا اور اس کے اخراجات محبین اسلام و مخیر حضرت کے تعاون سے مکمل ہو رہے ہیں ہمیں اس رقم کی ضرورت نہیں۔ [3]

1۔ ایضاً، ص 152-171

2۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تشکیل کے اسباب، ص 167

3۔ ایک عظیم علمی عہد کا خاتمہ، خورشید ندیم، نذرانہ عقیدت، ص 246

عربی سے شغف

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے شیخ خلیل عرب یمنی عربی زبان سیکھی اور انہوں نے مدارج القرآۃ، مجموعہ نظم و نثر، نہج البلاغہ، مقامات حریری اور دلائل الاعجاز وغیرہ پڑھی۔ اسی دوران میں نے عربی زبان میں بات چیت شروع کر دی تھی جب کہ ان کی عمر اس وقت صرف 13 سال تھی۔ مولانا کو عربی زبان سے اس قدر لگاؤ تھا کہ وہ اپنے بڑے بھائی ڈاکٹرعبدالعلی کے حکم سے عربی اخبارات و رسائل کا ذوق و شوق سے مطالعہ کرتے تھے اور مولانا نے ہندوستان کے عظیم مجاہد حضرت سید احمد شہید کی شخصیت پر عربی میں مقالہ لکھنے کے لئے مؤرخ کبیر شیخ عزالدین ابن اثیر کی کتاب الکامل فی التاریخ سے استفادہ کیا۔ مولانا کے عربی مطالعہ کے ذوق کی بدولت ان کو عربی کتابت و خطابت پر دسترس حاصل ہو گئی تھی۔[1]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مناصب و ذمہ داریاں

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت جامعیت و ہمہ گیریت کا عملی نمونہ تھی۔ باوجود اس کے کہ مولانا نے اپنی زندگی کا زیادہ تر وقت کسی بھی ایک علاقہ میں بیٹھنے کی سعادت حاصل نہ ہوئی۔ تاہم اس کے باوجود مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے برصغیر و عرب و یورپ کے متعدد علمی و عملی مراکز کے سربراہ و رکن رہے۔ جن میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی نظامت کے منصب پر تقریباً پچاس سال تک فائز رہے، اسلامک سنٹر آکسفورڈ لندن، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن، سربراہ مجلس تحقیقات و نشر اسلام لکھنو انڈیا، عربی اکیڈمی دمشق، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے مجلس شوریٰ، مؤتمر عالم اسلامی بیروت کے رکن، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے رکن، مجلس انتظامی رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے رکن، اسلامک سنٹر جنیوا کے رکن، سربراہ مسلم پرسن لاء بورڈ، جامعہ دمشق و جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں مہمان استاد کے فرائض بھی انجام دیئے۔[2]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے اعزازات

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے اعزازات میں جہاں یہ بات شامل ہے کہ ان کا نسب نبی آخر الزمانؐ کے نواسہ سیدنا حسن مجتبیٰؓ سے ملتا ہے اور پھر مولانا کے خاندان نے ہر دور میں دین برحق کی حفاظت و سربلندی میں اپنا کلیدی کردار ادا کیا یہاں تک اس کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ بھی پیش کر دیا۔ مولانا کے والد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بانیوں میں شامل تھے، ان کے والد حکیم عبدالحی حسنی، بھائی ڈاکٹر عبدالعلی حسنی اور خود مولانا ندوۃ العلماء کے معتمد عام رہے سالہا سال تک۔ اسلامک سینٹر جنیوا، اسلامک سنٹر آکسفورڈ لندن، عربی اکیڈمی دمشق، رابطہ عالم اسلامی کے سربراہ و اساسی رکن رہے۔ وہیں پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو شاہ فیصل ایوارڈ سے سعودی عرب نے نوازا اور آزاد کشمیر کی یونیورسٹی نے ان کی علمی و دینی خدمات کے اعتراف میں ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری جاری کی اور جس سے مولانا کا وصال ہوا اسی سال دسمبر 1999ء میں متحدہ عرب امارات نے مولانا کو عالمی داعی کے ایوارڈ سے بھی نوازا تھا۔

1۔ شیخ ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت کی تشکیل کے اسباب، ص156

2۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت پر ایک نظر، سید جعفر حسینی ندوی، نذرانہ عقیدت، ص2-4؛ پرانے چراغ، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، ص2

مولاناسید ابوالحسن علی ندوی کے اساتذہ

مولاناسید ابوالحسن علی ندوی کا تعلیمی پس منظر ماسبق میں بیان ہو چکا ہے۔ تاہم مولاناسید ابوالحسن کی شخصیت سازی میں جن علماء و مشائخ کا کر دار شامل تھا ان میں علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر عبد العلی حسنی ندوی، علامہ خلیل عرب یمنی، شیخ تقی الدین ہلالی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا اعزاز علی دیوبندی، مولانا حیدر حسن خان، مولانا احمد علی لاہوری، شاہ یعقوب مجددی، غلام محمد بھاولپوری اور مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری وغیرہ قابل ذکر اساتذہ و مشائخ میں شامل ہیں۔

مولاناسید ابوالحسن علی ندوی کے شاگرد

باوجود اس کے کہ مولاناسید ابوالحسن علی ندوی نے باضابطہ تدریس زیادہ عرصہ تک نہیں کی تاہم پھر بھی آپ سے براہ راست و بالواسطہ ہزاروں کی تعداد میں علماء وطلبہ نے استفادہ کیا۔ مولانا سے علمی استفادہ کرنے والے برصغیر کے علاوہ عرب ممالک اور یورپی ممالک میں دین اسلام کی دعوت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ترکی میں اسلام پسندوں کے محسن و مربی ڈاکٹر یوسف قراچہ، ندوۃ العماء کے معتمد عام اور سربراہ مسلم پرسنل لاء بورڈ مولانا محمد رابع حسنی ندوی، مفکر اسلام، عربی و اردو زبان کے ماہر خطیب زماں اور فکر ابوالحسن کے امین حضرت علامہ سید سلمان حسینی ندوی ودیگر نے بھی مولاناسید ابوالحسن علی ندوی سے استفادہ علمی کیا۔

مولاناسید ابوالحسن علی ندوی کی وفات

مولاناسید ابوالحسن علی ندوی کو اسی سال کی عمر میں جسم کے دائیں جانب فالج کا حملہ ہوا، علاج و معالجہ کے بعد افاقہ ہوا تو مولانا نے اپنے دعوتی و علمی اسفار کا سلسلہ جاری رکھا، باوجود ڈاکٹروں اور معالجین کی تنبیہ کہ بوجہ ضعف و کمزوری روزہ و تراویح ادانہ کریں آپ نے پھر بھی رمضان المبارک کی مبارک ساعتوں سے متمتع ہونے کو لازم جانا یہاں تک کہ جمعۃ المبارک کے روز مورخہ 30 دسمبر 1999ء کو 85 سال کی عمر میں بیسویں صدی کا داعی و درویش بزرگ دنیا کو خیر باد کہہ گیا۔ انااللہ واناالیہ راجعون۔[1]

مولاناسید ابوالحسن علی ندوی کی تصانیف

ماسبق میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کا تعلق ایک علمی و ادبی گھرانے سے تھا ان کے والد و بھائی اور والدہ بھی صاحب تصنیف و تالیف تھے۔ مولانا کے والد تو برصغیر کے مشہور مؤرخ و ادیب تھے۔ انہوں نے پانچ سو سے زائد برصغیر کے علماء کی سیرت کو **الاعلام بمن فی مناقب من الاعلام** (المشہور بہ نزہۃ الخواطر)۔ اسی علمی و ادبی گھرانے کی نسبت کی بدولت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اسلامی دعوت، سیرت و تاریخ اور سوانح پر مشتمل اردو اور عربی میں سیکڑوں کتب تصنیف کیں۔ مولانا نے تصنیف و تالیف کا آغاز حضرت سید احمد شہید کی سیرت پر مشتمل اردو کتاب کے عربی میں ترجمہ سے کیا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے علامہ شبلی نعمانی و علامہ سید سلیمان ندوی کی عالمی شہرت یافتہ سیرت النبی

1۔ سید ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت کی تشکیل کے اسباب، ص 177

کتاب کی ساتویں جلد تالیف کی اور اپنے والد کی کتاب نزہۃ الخواطر اور ہندوستان اسلامی عہد میں کو بھی مکمل کیا۔ مولانا نے اپنی کتب کے ذریعہ سے اسلام کے درست فہم کو واضح کرنے اور مسلم معاشرہ کے اصلاح کی تعلیم وترغیب دی ہے۔ [1]

تصنیف و تالیف کے اصول

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے سیکڑوں کتب عربی و اردو زبان میں رقم کی ہیں۔ تاہم مولانا کے تصنیف و تالیف کے وقت کچھ اصول و ضوابط تھے جن کی پابندی لازم جانتے تھے۔ جن میں سے چند ایک خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

1۔ جب بھی مولانا کسی شخصیت یا دعوت و تحریک کے بارے میں لکھنے کا ارادہ کرتے تو اس کے اقوال اور ان کی کتب کا مطالعہ کرتے تھے، اگر معلومات میں کمی باقی رہ جاتی تو مولانا ان کے شاگردوں اور متعلقین زمانہ سے استفادہ کرتے تھے اور اسی طرح مستند کتب سے بھی ان شخصیات و تحریکات کی معلومات حاصل کرتے تھے۔

2۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جب کسی شخصیت کی سیرت لکھا کرتے تو اس شخصیت کے زمانہ وماحول کی تفصیل بھی رقم کرتے تھے تاکہ اس عالم و بزرگ کی شخصیت کا مقام و مرتبہ واضح ہو سکے کہ کس طرح کے پریشان کن حالات میں ان علماء نے اپنا کلیدی و مثالی کردار ادا کیا۔

3۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے داعیوں، مصنفوں اور مفکروں کے اقوال و کتب سے استفادہ کرتے تھے یا پھر خود ان کی معیت و تعلق کی بدولت ان کا تذکرہ درج کرتے تھے۔

4۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صرف علماء و مشائخ کی سیرت ہی درج نہیں کرتے تھے بلکہ مولانا ان کے تعلق مع اللہ اور انابت الی اللہ اور ان کے اخلاق وصفات کو درج کیا کرتے تھے۔

5۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علماء و مشائخ کی سیرت کو درج کرتے وقت صرف اس کی صفات و کمالات کو بیان نہیں کرتے تھے بلکہ اس عالم و شیخ کے متعلق معتدل معاصر اور بعد کے علماء نے جو کچھ کہا اس کو بھی مولانا درج کیا کرتے تھے اور اس امر کو بھی لازم جانتے تھے کہ اگر اس عالم کی فکر و آراء میں کچھ قابل اعتراض بات ہوتی تو مولانا خوبصورت انداز سے اس کی سوچ و فکر کو مسترد کرتے تھے۔

6۔ مولانا کا تصنیف و تالیف میں ایک خاص صفت یہ بھی تھی کہ مصادر و مراجع کا ذکر درج کر دیا کرتے تھے۔ [2]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتب

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی برصغیر کے بہت ممتاز عالم دین تھے اور ان کا شمار مخلص داعیوں میں ہوتا ہے، اسی وجہ سے مولانا نے اپنی ساری زندگی امت مسلمہ کی فکرمندی میں بسر کی ہے، مولانا نے امت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے داعی تھے اور مسلم امت میں بے اعتدالی و پستی کے اسباب و علل کو اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ اپنا موقف پیش کرتے رہے۔ مولانا کی اکثر و پیشتر تحریروں اور تقریروں کو کتابوں کی شکل میں بھی شائع کر دیا گیا کہ اس سے امت مسلمہ استفادہ کرے۔ اگرچہ مولانا کی باضابطہ تصنیفات کی بھی کمی نہیں ہے تاہم مقالات اور تقریروں کو بھی کتابوں کی

1۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مطالعہ و تصنیف کی روشنی میں، نذرانہ عقیدت، ص58

2۔ نذرانہ عقیدت، ص59-60

صورت میں شائع کر دیا گیا ان تصنیفات کی تعداد تقریباً 400 سے زائد ہے۔ مولانا کی کتب عربی، اردو میں ابتدائی طور پر تصنیف کی گئی بعد ازاں ان کے ترکی، فرانسی، پشتو، انگریزی، بنگالی و دیگر زبانوں میں ان کے تراجم بھی شائع ہوئیں۔ ان کتب میں سے بعض تصانیف کا مختصر تعارف پیش کی جاتا ہے۔

1۔ سیرت سید احمد شہیدؒ

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے جب اپنے علم و مطالعہ کی روشنی میں قلم کو جنبش دی تو انہوں سب سے پہلے برصغیر میں مشہور و معروف اصلاحی تحریک اور شرک و بدعت کے راستے مسدود کرنے اور اسلامی خلافت قائم کرنے کے سرخیل و بانی حضرت سید احمد شہیدؒ کی سیرت کو رقم کیا ۔ مولانا کا حضرت سید احمد شہید سے خاندانی و روحانی تعلق تھا اور سید احمد شہید کی تحریک کی اثر انگیزی سے متاثر ہو کر ان کی شخصیت کو منفرد انداز میں رقم کرنے کی سعی کی۔ اس میں بیان کیا گیا کہ حضرت سید احمد شہید اپنے شاگرد اور مریدین کے ساتھ اسلامی تعلیمات کو اختیار کرنے اور شرک و بدعت سے اجتناب کی دعوت دینے کے لئے عملی جدوجہد کا آغاز کیا ان کی اصلاحی تحریک کی اثر انگیزی کلکتہ، افغانستان، پشاور کے بعد بالاکوٹ تک پھیل چکی تھی جس کے سبب اہل شرک و کفر ان کے راستے میں روکاوٹ کھڑی کرنے لگے جس کے سبب ہزارہ ڈویژن کے ضلع مانسہرہ کے علاقہ بالاکوٹ میں حضرت سید احمد شہیدؒ اپنے شاگرد خاص حضرت سید اسماعیل شہید نے جام شہادت نوش کیا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ حضرت سید احمد شہید کا اخلاص اور دین سے محبت و لگن کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے پیغام کے اثر سے بڑے بڑے علماء و عام مسلمان ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے امراء اور حکام بھی فیضیاب ہوئے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ جرأت، حمیت و غیرت اور پرہیز گاری کے عملی نمونہ تھے۔ مولانا لکھا ہے کہ آج بھی اگر مسلمہ امہ خود کو اقبال مندی کے منصب پر فائز دیکھنا چاہتی ہے اور سکون و راحت کی متلاشی ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ عوام و خواص کے درمیان محبت و اخوت کا سلسلہ رواج دینے کے ساتھ دین اسلام کو حقیقی معنوں میں اپنی زندگیوں میں نافذ کریں اسی کی بدولت مسلمان دنیا میں اپنا کھویا مقام واپس آسکتا ہے۔ [1]

2۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جب عربی زبان میں تحریر کی مہارت حاصل کرلی اور عرب دنیا سے گہری واقفیت حاصل کرلی عربی اخبارات و رسائل سے کے ذریعہ سے۔ مولانا پر یہ بات منکشف ہوئی کہ باوجود اس بات کے شعائر اسلام اور مسلمانوں کے اولین مراکز ہدایت خطہ عرب سعودی عرب میں موجود ہیں اور حضورؐ کی جماعت صحابہ کرامؓ کے مبارک قدموں سے بابرکت ہوئی تھی میں بسنے والے مسلمان خواب غفلت میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ عیش و آسائش کی زندگی بسر کرنے میں محو ہیں، لہو و لعب کی مشاغل کو پسند کرتے ہیں، مادہ پرستی کے اسیر بنے ہوئے ہیں اور مال و عورتوں کی زیادتی میں وارفتگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان سب کے ہوتے ہوئے مسلمان کبھی بھی دنیا کی رہبری جو ان کا بنیادی فریضہ ہے اس کو انجام دینے کے قابل نہیں بن سکتے۔ اسی سبب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی پہلی باضابطہ تصنیف عربی زبان میں ہی تالیف کی اور اس کا نام "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" لکھی۔ اس کتاب میں مولانا نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر اچھے یا برے طور پر کیسے پڑتا ہے۔ گویا مسلمانوں کے باعمل اور صالح ہونے کی وجہ سے دنیا کیسے مستفید ہوئی تھی اور اب جب مسلمانوں نے زندگی کے دھارے میں پسپائی اختیار کرلی تو اس کے کیا برے اثرات مسلمانوں پر پڑ رہے ہیں۔ مولانا نے اس کتاب میں اسلام سے قبل انسانوں کی حالت اور بعثت اسلام اور اس کے مثبت اثرات کو بیان کیا اور پھر مسلمانوں کے زوال کے اسباب کو بیان کرنے کے ساتھ مغرب کی اقبال مندی و اس کی کمزوریوں کو بھی رقم کیا اور

1۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی مشہور کتب، پروفیسر وصی احمد صدیقی، بحوالہ نذرانہ عقیدت، ص 136

آخر میں مسلمانوں کو امید کی کرن دکھلائی کہ اب بھی وقت ہاتھ سے نہیں نکلا کہ امت مسلمہ اپنی اصلاح کرلے اور دوبارہ علم و عمل کے ذریعہ سے اپنالوہا دنیا سے دوبارہ منوالینے میں کامیاب ہوجائے۔ مولانا کی اس کتاب کی شہرت ان کے دورہ مصر و عرب سے پہلی وہاں پھیل چکی تھی، مصر کی اصلاحی تحریک اخوان المسلمون نے اپنے کارکنوں کی تربیت کے لئے اس کو بنیادی حیثیت دیتے ہوئے اس کے مطالعہ کے سرکل قائم کیے۔1950ء جب مولانا مصر کے سفر پر گئے تو مولانا کو معروف مفسر قرآن، مفکر اسلام، بلند پایہ ادیب سید قطب کی موجودگی میں اپنی کتاب کا مطالعہ کرنے والے نوجوانوں کے تاثرات سننے اور ان کے سوالوں کے جوابات کا موقع ملا۔ مولانا کی کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے لئے سید قطب نے اس کتاب کی اہمیت و ضرورت کو اجاگر کرنے کے لئے جاندار مقدمہ تالیف کیا کیونکہ اس کتاب پر پہلا مقدمہ اس کتاب کے ناشر ڈاکٹر امین مصری نے لکھا تھا جو کہ اس کتاب کے لب لباب کو درست انداز سے بیان کرنے سے عاجز رہے تھے۔ اسی سبب سے اس کتاب کو دوسرا مقدمہ لکھوایا گیا۔[1]

3۔ اسلامیت و مغربیت کی کشمکش

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک مشہور کتاب "اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" ہے۔ جس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مسلم معاشرہ میں فروغ پاتے مغربی اثرات جو کہ تہذیب و تمدن کے بگاڑ کا سبب بن رہے تھے کو بیان کیا کہ مغرب کی اندھی تقلید مسلم نوجوانوں اور مسلم معاشرہ کے لئے زہر قاتل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علمی و فنی طور پر مغرب جن ایجادات و اختراعات کا ماہر اور داعی ہے اس سے استفادہ کرنے کی اجازت بہر طور پر موجود ہے تاہم مغرب کے برے اخلاق اور اسلامی تعلیمات پر شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش سے بچنا مسلمانوں کے لئے از حد ضروری ہے۔ مولانا نے مغرب کی خصوصیات و امتیازات اور اس کے مفاسد و کمزوریوں کو بیان کرنے کے ساتھ مسلمانوں کی حالت و کیفیت من حیث القوم بیان کی۔ مولانا نے یہ بھی بیان کیا کہ اسلام کو دنیا بھر کے مذاہب پر علمی و اخلاقی طور پر کیا برتری حاصل ہے اور مغرب کے اعتراضات کو کیسے رفع کیا جاسکتا ہے اور مسلمانوں کو اپنی بالادستی دنیا پر ثابت کرنے کے لئے کن امور کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے اور کس حد تک تقلید مغرب درست اور غلط ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ سے مسلم نوجوانوں کی فکری و نظریاتی حفاظت کا فریضہ مولانا نے انجام دیا۔[2]

4۔ تاریخ دعوت و عزیمت

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے تاریخ اسلام کے اوراق میں پوشیدہ انقلابی و تجدیدی شخصیات اور اسلامی دعوت کو حرز جان بنانے والوں کی روداد کو تاریخ دعوت و عزیمت میں قلمبند کیا۔ اسلامی تاریخ کے مجددین کو متعارف کرانے کے لئے شام کی جامعہ دمشق میں علمی مقالات پیش کیے تھے اور یہی مقالات بعد ازاں مفصل انداز میں مرتب کرکے سات جلدوں میں یہ کتاب شائع ہوئی۔ اس کتاب میں خلافت بنوامیہ کے آخری خلیفہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے تجدیدی کارناموں کو درج کرنے سے شروع کیا گیا اور عالم اسلام کے علمی و ادبی اور دعوت اسلام کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے والوں کی روداد کو قلم کرنے کے ساتھ برصغیر میں فتنہ اکبری کے خلاف صف بستہ ہونے والے حضرت مجدد الف ثانی، مسلمانوں کے عہد رفتہ کو سنبھالا دینے والے، علم حدیث کی اشاعت کا اہتمام کرنے والے اور اسلام کے مکمل ضابطہ حیات ہونے کو حجۃ اللہ البالغہ میں بیان کرنے والے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور اسلامی تعلیمات کو مکمل طور پر زندہ کرنے کی سعی کرنے اور اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد کرنے اور

1۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی مشہور کتب، ص133

2۔ مقالہ نگار کی جانب سے یہ تعارف پیش کیا گیا ہے۔

الحاد و زندیقیت اور شرک و بدعت کے سامنے سد سکندری باندھنے والے حضرت سید احمد شہیدؒ کے علمی و عملی اور دعوتی کارناموں پر اس کتاب کا اختتام کیا۔ اس کتاب کے ذریعہ سے یہ بات مسلمانوں کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی کہ اگر عزم مصمم اور اخلاص اور محبت خدا اور رسولؐ دل میں موجزن ہو تو غیر معمولی کارناموں کا ظہور اسباب و وسائل کی عدم موجودگی کے باوجود بھی ممکن ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا کہ اللہ والے کس طرح فکر آخرت سے معمور ہوتے ہیں کہ ان کو دنیا کی بڑی سے بڑی آسائش بھی اپنا گرویدہ نہیں کر سکتی۔[1]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی مندرجہ بالا کتب کے علاوہ بھی سیکڑوں تصانیف ہیں جو اپنی موضوع کے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہیں اور مولانا کی تالیفات کو عرب و عجم اور یورپ میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا ہی نہیں جاتا بلکہ مولانا کی سیکڑوں کتب ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوئی ہیں۔ مولانا کی کتب میں عشق قرآن، محبت رسول اور دین اسلام کو عملی زندگی میں کامل و اکمل طور پر اختیار کرنے کی دعوت موجزن ہے۔ مولانا صرف فکر و نظری طور پر اپنا موقف پیش نہیں کیا بلکہ علماء و مصلحین کے عملی کارناموں سے استدلال کر کے نوجوانوں کے لئے مشعل راہ اصول پیش کیے ہیں جن سے استفادہ کر کے امت مسلمہ دوبارہ اپنے عہد رفتہ کو تازہ کر سکتی ہے۔

1۔ مولانا ابوالحسن کی مشہور کتب، ص 133

مولاناسید ابوالحسن علی ندوی کے بارے میں علماء کی نظر میں

ماسبق میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا خاندانی و علمی پس منظر درج کرنے کے ساتھ مولانا کی علمی و عملی خدمات کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا۔ ذیل میں مولانا کی شخصیت سے متعلق ان کے معاصرین کی فکر و آراء کو پیش کیا جارہا ہے۔

مولانا محمد رابع حسنی ندوی(ناظم ندوۃ العلماء لکھنو، انڈیا) لکھتے ہیں کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بہت بڑے عالم و داعی اسلام تھے۔ انہوں نے دعوت دین کو عرب و عجم کی عوام و خواص سب کے سامنے پیش کیا۔ سعودی عرب، یمن، اردن، لبنان، مراکش وغیرہ کے حکام سے دعوتی ملاقاتیں کیں۔ مولانا کا شعار رہا کہ اسلامی پیغام کو پہنچانے کے لئے حکمت و دانائی اور اچھے انداز تکلم کو اختیار کیا جائے۔ مولانا نے شاہ فیصل سے ملاقات کی تو اس نے مولانا کو اعزازات و اکرامات سے نوازا تو مولانا نے شکریہ کے ساتھ ان سے کہہ دیا کہ مسلم غربا میں اس کو تقسیم کرا دیجیے۔ مولانا کا یہ کہنا تھا کہ اگر علماء حکام و امراء سے مال و دولت اور مراعات لینا شروع کردیں تو ان کے سامنے کلمہ حق نہیں کہہ سکتے اور نہ ہی ان کے خلاف اسلام اقدامات کی مذمت کرسکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ میں مسلم حکام سے کسی قسم کی مالی اعانت قبول کرنے سے محترز ہوں۔[1]

مولانا محمد سالم قاسمی(مہتمم دارالعلوم دیوبند انڈیا) فرماتے ہیں کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جیسے علمی مقام میں متفوق تھے بعینہ اسی طرح وہ اخلاق میں بھی بلند مقام پر فائز تھے۔ ہمیشہ اپنے ملنے والوں سے خوش خلقی و عاجزی اور محبت سے پیش آتے تھے کہ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا کہ مولانا کا یہ انداز محبت وانس صرف اس کے ساتھ خاص ہے۔ یہی تواضع پسندی و سادگی ہے کہ جس کی بدولت مولانا کو دنیا میں بڑے بڑے عہدے اور منصب تفویض کیے گئے۔ باوجود مولانا علی میاں سے علمی طور پر کمتری کے جب کبھی مولانا سے ملنے کا اتفاق ہوا تو مولانا بحالت ضعف و تقشف کے کھڑے ہو کر استقبال کرتے تھے۔[2]

مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی(مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو، انڈیا) لکھتے ہیں کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے مسلمانوں کی بڑی تعداد نے استفادہ کیا۔ مولانا کا طریق تربیت نہایت مشفقانہ تھا، وہ امت مسلمہ کے مسائل و مشکلات سے بخوبی آگاہ و واقف تھے۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے احوال کا جائزہ لیتے رہتے اور ان کو پیش آمدہ مسائل سے علمی و عملی طور پر نبرد آزما ہونے کی تلقین کرتے تھے اوراس سلسلہ میں وہ مسلمانوں کو دعوت فکر دیتے تھے کہ دین کا پیغام دوسروں تک منتقل کرنے میں متعدد وسائل کو استعمال کرنے کے ساتھ ضروری ہے کہ حسن خلق، حکمت اور دامن اسلام کو تھامنے کی بھی ضرورت ہے اس راہ میں مشکلات آئیں تو ان پر صبر اور استقامت اختیار کرنا لازم ہے۔[3]

شیخ یوسف القرضاوی(سربراہ اتحاد العلماء المسلمین العالمی، امام اعظم قطر) نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت پر مفصل کتاب تالیف کی جس کو مطیع الرحمن عوف ندوی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے اس کتاب میں شیخ یوسف القرضاوی نے محبت و عقیدت کے موتی پروئے ہیں کہ وہ لکھتے ہیں کہ "شیخ ابوالحسن علی ندوی امام ربانی و اسلامی تھے، ان کی شخصیت قرآنی و محمدی تھے اور میں ان کو یہ متمیز انقلاب سے کیوں نہ نوازوں وہ میرے بھائی

1۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی جامع صفات، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، بحوالہ نذرانہ عقیدت، ص4

2۔ ایک عظیم شخصیت سے محرومی، مولانا سالم قاسمی، بحوالہ نذرانہ عقیدت، ص75

3۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی شخصیت کے آئینہ میں، مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی، بحوالہ نذرانہ عقیدت، ص80

تھے اور مجھے انسانوں میں سے بہت محبوب بھی تھے"۔ شیخ یوسف القرضاوی نے مولانا کو جن بلند القابات سے نوازا ان کو تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب "امت کے امام ربانی شیخ ابوالحسن علی ندوی" میں پیش کیا۔[1]

مولانا مفتی تقی عثمانی (شیخ الحدیث دارالعلوم کراچی) فرماتے ہیں کہ مولانا سید ابوالحسن بہت بڑے عظیم عالم دین تھے۔ قحط الرجال کے زمانہ میں مولانا کی رحلت عظیم نقصان ہے مسلمانوں کا جس پر دل مضطرب ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ مسلم معاشرے میں بڑے علماء، پرہیز گار وعاجز ومتواضع اور خوش اخلاق، صاحب علم و فضل ناپید ہوگئے ہیں البتہ یہ بات ضرور کہہ سکتے ہیں کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بیک مجمع الصفات والکمالات تھے کہ ایک ہی وقت میں تمام اچھی صفات اور اچھے خصائل ان میں موجود تھے۔[2]

مولانا سمیع الحق (سربراہ دارالعلوم اکوڑہ خٹک) لکھتے ہیں کہ ماضی میں جب کبھی کوئی عالم دنیا سے رخصت ہوتا تھا تو اس کی جگہ کو مکمل کرنے والے بلند پایہ علماء موجود ہوتے تھے جس کی وجہ سے معاشرہ کو اس عالم کی جدائی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ مگر اب جب کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دنیا سے رخصت ہوئے تو یہ زمانہ قحط الرجال کا ہے کہ مسلم امہ کے پاس بلند پایہ عالم، بہت بڑے داعی، مصنف و مؤرخ عظیم، صاحب علم و فضل، پرہیز گار و متقی جیسی صفات جو ان میں جمع تھیں ان کے بعد کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جو ان کے خلاء کو پر کرنا تو دور ان کے مقام و مکان کے برابری کی بھی صلاحیت رکھتا ہو۔[3]

پروفیسر خورشید احمد (مدیر ترجمان القرآن، لاہور) لکھتے ہیں کہ میں زندگی میں دو عظیم شخصیات سے بہت فائدہ اٹھایا ہے ان میں سے ایک مولانا ابوالاعلی مودودی اور دوسرے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہیں۔ ہر دو شخصیات میں جب میں غور و فکر کے بعد فرق معلوم کرتا ہوں تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ مولانا ابوالاعلی مودودی انسانیت کو خود سے بذریعہ ذہن متاثر کرتے تھے کہ ان کی بات کو دماغ جلد قبول کرلیتا تھا جبکہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی یہ خاصیت تھی کہ وہ انسانوں پر دل کے ذریعہ سے اثر انداز ہوتے تھے اور انسانوں کے دماغ کو اپنا گرویدہ بنالیتے تھے یہی وجہ ہے کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بہت سے افراد کے فکر و نظریہ کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہوئے اس سلسلہ میں ان کا ایجاز پسند اسلوب بہت اثر انگیز ثابت ہوا۔[4]

شیخ محمد المجذوب (پروفیسر جامعہ اسلامی مدینہ منورہ سعودی عرب) شام کے بہت بڑے عالم ہیں اور انہوں نے ایک کتاب "علماء مفکرون عرفتہم" (اصحاب فکر علماء جن کو میں نے جانا) انہوں نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بیانات کو سننے اور ان کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد کہا ہے کہ مولانا کی گفتگو سن اور پڑھ کر انسانوں پر جادو کا سا اثر ہوتا ہے کہ ان کے دل مولانا کی طرف کھنچتے چلے جاتے ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق و عنایت کا ثمرہ ہے کہ مولانا کے اخلاص و حسن اسلوب اور عاجزی کی وجہ سے عرب و عجم اور یورپ میں قدر کی نگاہ سے ان کی بات کو سنا جاتا تھا۔ موجودہ دور کے داعیوں کو مولانا کے بہترین اسلوب دعوت اور انداز تکلم و حکیمانہ طرز عمل سے استفادہ کرنے کی ضرورت ہے۔[5]

1۔ ربانی امت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، شیخ یوسف القرضاوی، (مترجم، مطیع الرحمن عوف ندوی)، ص86

2۔ توصیف کیا بیان کریں ان کے کمال کی، مولانا مفتی تقی عثمانی، بحوالہ نذرانہ عقیدت، ص95

3۔ موت العالم موت العالم، مولانا سمیع الحق، بحوالہ نذرانہ عقیدت، ص250

4۔ عالم اسلام کے محبوب قائد، پروفیسر خورشید احمد، بحوالہ نذرانہ عقیدت، ص238

5۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی عرب علماء کی نظر میں، محمد شاہد ندوی، بحوالہ نذرانہ عقیدت، ص111-112

شیخ محمد المبارک (پروفیسر جامعہ ام درمان الاسلامیہ سوڈان) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے بہت زیادہ محبت کرنے والے عرب عالم تھے کہ انہوں نے ایک مرتبہ مولانا کو خط لکھا اور اس میں کہا کہ بغیر کسی مبالغہ وخوشنودی اور لگی لپٹی سے یہ بات صدق دل سے اور حق سمجھ کر کہہ اور لکھ رہا ہے ہو کہ میں آپ سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں۔ جب میری آپ سے ملاقات ہوئی تھی دمشق میں اس وقت میں نے آپ کے خصائل وصفات حسن کو دیکھ کر یہ سوچا تھا کہ کیا اچھا ہو کہ قیامت کے روز آپ کی موافقت وقرب نصیب ہو جائے البتہ یہ بات اس وقت کہنے کی جسارت نہ کر سکا اور اب کہہ رہا ہوں کہ میری خواہش وتمنا اور دعا ہے کہ اللہ تعالی یوم حساب کو آپ کی رفاقت عطا کرے۔[1]

ڈاکٹر محمد عبدہ یمانی (سابق وزیر اطلاعات سعودی عرب) فرماتے ہیں کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی حمیت وغیرت دینی سے سرشار تھے اور انہوں نے کبھی بھی حق بات کے کہنے میں باک محسوس نہیں کی بلکہ مکمل صراحت کے ساتھ ہر ایک کے سامنے حق بات کہی۔ جب کبھی کسی فرد یا تحریک کی جانب سے خلاف اسلام یا اسلام کی صورت کو بگاڑنے کی کوشش ہوئی تو اس کے سامنے مولانا نے کسی مصلحت پسندی اور نرمی سے کام لینے کی بجائے اسلامی تعلیمات کے محافظ ومؤید کی حیثیت سے تنے تنہا کھڑے نظر آئے اور وہ کسی امیر وحاکم سے خائف نہیں ہوئے۔[2]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت پر برصغیر پاک وہند کے علاوہ مصر، سعودی عرب، قطر، فلسطین اور یورپ کی علمی وعملی شخصیات نے بہت کچھ تفصیل کے ساتھ لکھا اور بیان کیا ہے جن کو یہاں درج کرنے کا موقع نہیں۔

1۔ ایضاً، ص113

2۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی عرب علماء کی نظر میں، ص115

باب اول

دینی مدارس کا قدیمی نظام تعلیم اور سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل اول: علمی مراکز، قدیم نصاب تعلیم اور سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل دوم: قدیم نظام تعلیم کی خصوصیات اور سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل سوم: مشہور تعلیمی تحریکیں اور سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل اول

مسلمانوں کا قدیم نصاب تعلیم اور اس کے علمی مراکز اور مولانا سید ابوالحسن کی فکر کا جائزہ

فصل اول

مسلمانوں کا قدیمی نظام تعلیم، علمی مراکز اور سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

برصغیر میں مساجد و مدارس کے قیام کا آغاز عباسی دور حکومت کے دوران ہی ہو گیا تھا یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے علاقوں کی سیاحت کرنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ قریہ قریہ بڑی بڑی مساجد نا صرف قائم کی گئی بلکہ ان کے صحن کے اطراف میں کمروں کی بہتات اس بات کی جانب متوجہ کرتی ہے کہ یہاں پر اساتذہ و طلبہ سکونت اختیار کرتے تھے اور اسی طرح خانقاہوں میں بھی حلقہ تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ بالخصوص جب سلطان محمود غزنویؒ نے 409ء میں قنوج فتح کیا تو اس نے وہاں سے واپسی پر غزنی میں جامع مسجد و مدرسہ کی بنیاد رکھ دی۔ بادشاہ کی مساجد و مدارس سے محبت کو دیکھ کر امراء و اعیان نے بھی مساجد و مدارس کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور شہاب الدین مسعود کے دور میں تو اس قدر مساجد و مدارس تعمیر ہوئے کہ ان کو شمار کرنا بھی ناممکن ہے۔[1]

شہاب الدین غوری نے 587ء میں جب اجمیر کو فتح کیا تو اس نے بھی بے شمار مدارس کے بنیاد رکھی اور اس کے بعد ہر بادشاہ کے زمانہ میں مساجد و مدارس کی تاسیس کے ساتھ علم کی نشرواشاعت کے اہتمام کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی رہی کہ دور دراز سے علماء کو فروغ تعلیم کے لئے بلایا جانے لگا اور معاشرے کے اصحاب ثروت و اصحاب علم و فضل کی رہائش گاہوں پر بھی پرائیویٹ تعلیم کا سلسلہ اس بات پر دلیل ہے کہ برصغیر میں علم کے ساتھ عوام و خواص کا والہانہ رشتہ قائم و دائم تھا۔[2]

دینی مدارس کی اہمیت و ضرورت مسلم ہے، مسلم معاشرے میں ہی نہیں بلکہ انسانی معاشرے کی تعمیر و ترقی اور خوشحالی میں دینی مدارس نے اہم کردار ادا کیا اور دینی مدارس کی طرف تاریخ اسلامی کے ہر دور میں شرق و غرب کے ہر کونے سے مسلم و غیر مسلم کسب فیض کے لئے رجوع کرنے پر مجبور ہوئے۔ عہد نبویؐ سے لیکر زوال خلافت عثمانیہ اور مسلمان کے دور حکمرانی کا ہندوستان سے خاتمے تک ہر دور میں مسلمانوں نے علم کی نشرواشاعت کا برابر انتظام کیا اور مدارس و مکاتب اور مساجد کا ہر مفتوح علاقے میں قیام عمل میں لایا جاتا تھا۔ برصغیر (موجودہ پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش وغیرہ) کے حکمرانوں کی آٹھ سو سالہ تاریخ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطہ علمی و تعلیمی لحاظ سے معمور، خدمتگاران علم کی سوانح حیات اور بزرگان دین کے ملفوظات سے پر نور ہے، نامور اساتذہ اور مرتبین اور اس کے تعلیمی مرکزوں کی فہرست بہت طویل ہے، مسلمان سلاطین و امرا اور مخیر اور علم دوست متوسط الحال لوگوں نے قریہ قریہ اور قصبہ قصبہ مدرسے قائم کئے تھے ان کی صحیح تعداد کا تعین نہایت مشکل ہے۔[3]

نصاب تعلیم مختلف زمانوں میں واقع ہونے والی ترامیم و اضافوں کی تفصیلات کو سید ابوالحسن علی ندوی کے والد گرامی نے اپنے ایک مضمون[4] میں بیان کیا۔ جس میں حذف و ترمیم کے بعد سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمان" میں یوں درج کیا ہے کہ تاریخ کے مطالعہ سے

1۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، **ابوالحسنات ندوی**، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی انڈیا، طبع جدید، 2014ء، ص 20-21

2۔ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ مولانا سید سلمان حسینی ندوی، ص 88

3۔ مولانا سید عبدالحی حسنی نے "جنۃ المشرق" فحص و تمحیص کے بعد ان مدارس کی تفصیلات کو جمع کیا جن کا تاریخ کے صفحات میں اصالۃً بھی تذکرہ موجود تھا کو بیان کر دیا اور ان مدارس میں مدرسہ نسواں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔

4۔ ہندوستان کا نصابِ درس اور اس کے تغیرات، سید عبدالحی حسنی ندوی، ناشر، شعبہ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو انڈیا۔

ii.

معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اشاعت علم کا آغاز فاتح ہند کی آمد سے ہی ہو گیا جو علمی افکار و نظریات میں جو تبدیلیاں عراق وماوراء النہر وغیرہ میں وقوع پذیر ہوئیں ان کے اثرات ہندوستان تک برابر پہنچتے رہے۔

مبحث اول: مسلمانوں کا قدیم نصاب تعلیم

برصغیر کا نصاب تعلیم چونکہ آٹھ دہائیوں سے زائد پر مشتمل ہے تاہم یہاں نصاب تعلیم کے تغیر کے چار ادوار کو مختصر طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ جن کی تفصیل طبقات مشائخ و شعراء اور تاریخ کی کتب سے ملتی ہے۔

پہلا دور

ساتویں صدی ہجری سے پہلے دور کا آغاز ہوتا ہے اور اس کا اختتام دسویں پر ہوتا ہے اور یہیں سے دوسرے دور کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ کم و بیش دو صدیوں تک یہ علمی دور قائم رہا اور اس میں جن علوم و فنون کو لازمی سمجھا گیا تھا کہ ان کی تحصیل ہر طالب علم پر ضروری تھی وہ یہ ہیں: صرف، نحو، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، منطق، کلام، تصوف، تفسیر اور علم حدیث شامل ہیں۔ ان صدیوں کے تفصیلی حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے فی زمانہ منطق و فلسفہ کو عروج حاصل ہے اسی طرح اس زمانہ میں فقہ اور اصول فقہ کو معیار فضیلت گردانا جاتا تھا۔[1]

دوسرا دور

ملتان سے جب شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ[2] دہلی و سنبھل میں جلوہ افروز ہوئے۔ اس وقت نویں صدی اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی۔ سکندر لودھی نے ہر دو علماء کو عزت و تکریم کے ساتھ سلوک کیا اور بادشاہ وقت خود شیخ عبداللہ کے درس میں شامل ہوتے۔ بادشاہ کے التفات کی وجہ سے ان کو ملک بھر میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا اور ان کا حلقہ بھی دراز ہو گیا۔ شیخ عبداللہ نے علمی معیار کو بلند کرنے کی خاطر قاضی عضد کی تصانیف "مطامع" اور "مواقف" اور سکاکی کی "مفتاح العلوم" کو داخل درس کیا تو یہ کتابیں علمی حلقوں میں متداول ہو گئیں۔ اسی زمانہ میں میر سید شریف کے شاگردوں نے شرح مطامع اور شرح مواقف[3] کو رواج دیا، علامہ تفتازانی کے شاگردوں نے "مطول" و "مختصر[4]" کی بنیاد ڈالی اور "تلویح[5]" و شرح عقائد نسفی[6] کو رواج دیا۔ اسی دور میں شرح وقایہ[7] اور شرح ملا جامی[8] کو بھی داخل نصاب کیا گیا ہے۔ اس صدی کے آخری اور مشہور ترین عالم دین شیخ عبدالحق محدث برصغیر سے عرب میں تشریف لائے اور تین سال تک علماء حرمین شریفین سے علم حدیث میں کمال حاصل کرنے کے بعد عظیم تحفہ علم حدیث کا ساتھ لائے۔ برصغیر میں ان کی اور ان کی اولاد کی بڑی کوشش کرنے کے باوجود علم حدیث کو مناسب مقام حاصل نہ ہو سکا۔ کامیابی کا خلعت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کوشش کو ملا اور برصغیر میں حدیث کی طرف لوگ متوجہ ہو گئے۔[9]

1۔ ہندوستانی مسلمان، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، س ن، ص115

2۔ یہ دونوں حضرات تلمبہ جو اس وقت ملتان کے مضافات میں واقع تھا اب حال میں میاں چنوں اور عبدالحکیم کے درمیان میں واقع ہے اور ضلع خانیوال کا حصہ ہے۔

3۔ دونوں علم کلام کی مستند کتابیں ہیں۔

4۔ فن معانی و بیان کی دو مشہور کتابیں جو ابھی تک قدیم نصاب میں داخل ہیں۔

5۔ اصول فقہ

6۔ علم عقائد

7۔ فقہ حنفی

8۔ نحو کی ایک کتاب جس میں منطق و استدلال کی آمیزش ہے۔

9۔ ہندوستانی مسلمان، ص116

تیسرا دور

دوسرے دور میں جو تعلیمی نصاب میں تغیر و تبدل وقوع پذیر ہوا تو لوگوں نے نصاب تعلیم میں مزید اضافہ وترامیم کی خواہش پیدا کی۔ایسے میں شاہ فتح اللہ شیرازی کی آمد ہوئی اور ان کو دربار اکبری سے عضد الملک کا خطاب مل جانے کی وجہ سے ان کی قدر میں اضافہ ہوا۔شاہ فتح اللہ شیرازی نے نصاب تعلیم میں تبدیلی واضافہ کی تجویز رکھی تو اس کو علماء نے فوراً منظور کر لیا۔ شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی جو ایک واسطہ سے محقق ودانی کے شاگرد تھے سب سے پہلے متاخرین کی تصنیفات کو انہوں نے ہی رواج بخشا۔ان کے اس علمی فیضان کا شہر گجرات تک محدود نہیں رہا بلکہ وسط ہند بھی اس سے استفادہ کرتا رہا۔ قاضی ضیاء الدین نیوتنی گجرات سے علمی تحفہ لے کر آئے اور شیخ جمال نے ان سے حاصل کر کے دور دور تک علم کو پھیلایا۔ تاہم اس علمی نصاب کو شہرت شاہ فتح اللہ شیرازی کے دور میں ملی۔[1]

مفتی عبد السلام شاہ فتح اللہ کے شاگرد رشید تھے انہوں نے چالیس سال تک لاہور میں علمی دانش گاہ سجائے رکھی اور ان سے اکتساب کرنے والے ہزاروں میں سے دو کو ہی سند امتیاز اور شرف قبولیت ملا۔دیوہ کے مفتی عبد السلام اور الہ آباد کے شیخ محب اللہ نے جو علمی حلقے قائم کیے ان کا شہرہ جہاں بھر میں پہنچا۔ شیخ قطب الدین سہالوی انہیں دونوں کے یک واسطہ سے شاگرد ہیں جو ملا نظام الدین بانی درس نظامی کے والد ماجد تھے۔

شاہ ولی اللہ متوفی 1174 ہجری اس زمانہ کے آخری مگر نامور عالم تھے شاہ صاحب نے عرب کا سفر کیا اور شیخ ابوطاہر مدنی سے فن حدیث سیکھا اور برصغیر کو یہ عظیم تحفہ دیا اور اس کی اشاعت کا انتظام کیا۔ صحاح ستہ کے درس وتدریس کا برصغیر میں رواج اسی زمانہ سے ہوا۔شاہ صاحب اور ان کے اخلاف نے اس علم کی اشاعت کا بے پناہ سامان کیا۔ شاہ صاحب نے اپنے زمانہ میں درس نظامی کا ایک جدید نصاب ترتیب دیا تھا جس میں نحو، منطق، فلسفہ، کلام، فقہ، اصول فقہ، بلاغت، ہیئت وحساب، طب، حدیث، تفسیر اور تصوف وسلوک کی تعلیم کے لئے کتب کی تخصیص کی گئی مگر علم ومعرفت کا مرکز دہلی سے لکھنؤ منتقل ہو چکا تھا اور درس گاہوں میں منطق وحکمت کی چاشنی سے لوگوں کے کام وزبان آشنا ہو رہے تھے اس نصاب کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی۔[2]

چوتھا دور

بارہویں صدی ہجری میں چوتھا دور شروع ہوا اور ملا نظام الدین نے ایسے پرزور ہاتھوں سے اس کی بنیاد رکھی اور انہوں نے سابقہ نصاب تعلیم میں مزید کتب کا اضافہ فرمایا۔ملا نظام الدین سہالوی کے نصاب تعلیم کے اہل علوم میں سے جن کی تعلیم کو لازم جانا گیا علم صرف، علم نحو، منطق، حکمت، ریاضی، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، کلام، تفسیر اور حدیث تھے۔ ملا نظام الدین کے نصاب کا طریقہ درس کتاب کو بنیاد بنانے کی بجائے علم وفن کی مستقل بالذات سمجھ کر تعلیم دی جاتی اور کتاب صرف ذریعہ تعلیم ہی رہتی تھی۔[3]

1۔ ہندوستانی مسلمان، ص117

2۔ ہندوستانی مسلمان، ص118، ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ ص92

3۔ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟، ص93، یہ نصف صدی پہلے کی بات ہے، ندوۃ العلماء کی تحریک اور زمانہ کے تغیرات کے اثر سے اب جابجا قدیم نصاب میں تغیر و تبدل کا کام جاری ہے، ہندوستانی مسلمان، ص118

پانچواں دور

ہندوستان میں جب اسلامی حکومت کا خاتمہ ہو رہا تھا اس وقت میں جو نصاب تعلیم مقرر ہوا وہ اصل میں گذشتہ نصابِ تعلیم کی مسخ شدہ شکل کی صورت تھی اور یہی نصاب تعلیم آج تک رائج ہے۔ اس نصاب تعلیم میں گذشتہ نصاب تعلیم کے مضامین کے ساتھ چند نمایاں تبدیلیاں بھی ہوئی جو ان علوم کی تعلیم سے متعلق کتب کی تعین کی صورت میں منتج ہوئی، ادب، منطق، فرائض، مناظرہ، اصول حدیث اور حدیث کی تعلیم کا انتظام موجود تھا۔[1]

1۔ ہندوستان کا نصاب درس، سید عبد الحی حسنیؒ، بحوالہ، ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ ص94

مبحث دوم: برصغیر کے اہم علمی مراکز

سندھ وملتان

اسلام کی دعوت کے وصول کے ساتھ جس کا اہم ذریعہ محمد بن قاسم بنے انہوں نے دیبل پہنچ کر راجہ داہر کو شکست دینے کے بعد سندھ کے علاقوں کو فتح کرتے ہوئے ملتان تک پہنچے۔ مسلمانوں کی عظیم فتوحات جو برصغیر میں عمل میں آئیں اس سے یہاں کے بت پرست بے حد متاثر ہوئے کہ اسلامی لشکر علاقوں کو فتح کرنے کے باوجود یہاں کشت وخون کی ندیاں بہانے اور ظلم وجور کے پہاڑ توڑنے کی بجائے حسن اخلاق کا پیکر بنے ہوئے ہیں ، حق داروں کو ان کا حق دے رہے ہیں اور ظلم کو ظلم سے روک رہے ہیں۔ اس رویئے سے متاثر ہو کر بت پرستوں کی بڑی تعداد رضاکارانہ طور پر حلقہ بگوش اسلام ہو گئی۔ اسلام کی سندھ باب الاسلام سے آمد کے ساتھ ہی علم کی شمع بھی سندھ وملتان میں پھوٹ پڑی۔ علمی تحریک مسلمانوں کی جو سندھ و ملتان سے شروع ہوئی اس کے اثرات دنوں میں پورے برصغیر میں ظاہر ہو گئے۔ جب غزنوی خاندان نے برصغیر کو مسخر کیا تو انہوں نے لاہور کو اپنا پایہ تخت بنایا تو لاہور ہی علمی قمقموں سے روشن تر ہو گیا۔ [1]

دہلی

مسلم فاتحین نے جب برصغیر کے قلب دہلی کو فتح کیا تو دہلی ہی مسلمانوں کی علمی سرگرمیوں کا مرکز ٹھہرا اور بادشاہوں کی جانب سے علماء کی اس قدر قدر دانی وعزت کی جانے لگی کہ چہار جانب سے باکمال علماء کھچ کھچ کر دہلی میں جمع ہو گئے اور انہوں نے دہلی کو قرطبہ وبغداد کی شکل میں تبدیل کر دیا تھا۔

غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں شمس الدین خوارزمی، برہان الدین بلخی ،نجم الدین دمشقی جیسے علم فضل کے ماہر دہلی آموجود ہوئے، علاؤالدین خلجی کے زمانہ میں ظہیر الدین بھکری، فرید الدین شافعی، محی الدین کاشانی، وجیہ الدین رازی اور تاج الدین مقدم جیسے چھیالیس بلند پایہ علماء وارد ہوئے جن کے تذکروں سے تاریخ کے صفحات روشن ہیں اور ان کی نظیر پیش کرنے سے عاجز بھی۔

محمد شاہ تغلق کے زمانہ میں معین الدین عمرانی، شیخ احمد تھانیسری، قاضی عبد المقتدر سے علماء سے فیضیاب ہونے والے شہاب الدین دولت آبادی ملک العلماء بنے۔ فیروز شاہ کے عہد میں جلال الدین رومی تشریف لائے اور شاہی مدرسہ کے پرنسپل بنے، نجم الدین سمرقندی بھی اسی زمانہ میں دہلی آئے اور اپنے شرف وکمال سے یہاں کے باسیوں کو مالا مال کر دیا۔ [2]

سکندر لودھی کے زمانہ میں شیخ عبداللہ ، شیخ عزیز اللہ ملتان سے آئے اور ان کی آمد کے ساتھ دہلی منطق وحکمت کا مرجع و مرکز بن گیا۔ دور اکبری میں شاہ فتح اللہ شیرازی نے عضد الملک کا خطاب حاصل کیا اور پورے ملک میں ان کے علم کا چرچا ہو گیا اور حکیم شمس الدین اور ان کے بھانجے حکیم علی گیلانی کی وجہ سے علم طب کو فروغ ملا اور شیخ عبد الحق کی کوششوں سے علم حدیث کو خلعت ملا۔

1۔ ہندوستانی مسلمان، ص110

2۔ ہندوستانی مسلمان، ص111

شاہجہان اور اورنگزیب عالمگیر کے دور حکومت میں میر زاہد کو شہرت ملی اور ان کی انتھک محنت نے درس نظامی کی بنیاد میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے شاگردان رشید میں قاضی مبارک، شاہ ولی اللہ کا مشہور خاندان شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، مولوی عبدالحی، مولوی مملوک العلی وغیرہ جیسے نامور علماء ومدرسین شامل ہیں۔[1]

لاہور

اگرچہ لاہور میں علم کی شمع دہلی سے پہلے پھوٹی تھی مگر دہلی کی ترقی نے اس کو کچھ وقت کے لئے اوجھل کر دیا تھابلاآخر لاہور نے اپنا مقام پھر حاصل کیااور جمال الدین تلہ، کمال الدین کشمیری، ملاعبدالحکیم سیالکوٹی وغیر مشہور علماء کی وجہ سے دہلی میں ایک عرصہ تک علم ومعرفت کا حلقہ قائم رہاہے اور تشنگان علم اپنی پیاس بجھاتے رہے۔

جون پور

بادشاہوں کی قدردانی کی وجہ سے ابوالفتح بن الشیخ عبدالحی بن عبد المقتدر الکندی(م 858ھ)ملک العلماءشہاب الدین دولت آبادی(849ھ)، دیوان عبدالرشید، مفتی عبدالباقی، ملانورالدین جیسے علماءنے جون پور کو اپنا مسکن بنالیا۔ ان علماء کی محنت وکوشش ثمر آور ہوئی کہ سارے ملک میں ان کے شاگرد پھیل کر علم کی اشاعت کا انتظام کرنے لگے۔

گجرات

صاحب مجمع البحار شیخ محمد طاہر فتنی، شیخ وجیہ الدین علوی اور ملانورالدین نے گجرات میں خوب علم کی آبیاری کی۔ قاضی ضیاء الدین باشندہ نوتنی نے گجرات میں شیخ وجیہ الدین سے کسب فیض حاصل کیااور ان کے شاگردوں کے شاگردوں میں نامور مصنفین ومدرسین پیدا ہوئے جن میں صاحبِ نورالانوار ملاجیون اور ملاعلی اصغر اور قاضی علم اللہ سے بلندپایہ علماظاہر ہوئے جن سے طلباء فیضیاب ہونے میں اپنی سعادت جانتے تھے۔

الٰہ آباد

شیخ محب اللہ، قاضی محمد آصف، مولوی جاراللہ جیسے باکمال علماء کی بدولت الہ آباد ایک صدی تک علمی سرگرمیوں کا منبع ومرجع رہا۔[2]

لکھنؤ

لکھنؤ میں علم کی معرفت جون پور سے منتقل ہوئ اس کے بعد شاہ پیر محمد نے بزم افادہ سجائی اور ان کے شاگرد ملاغلام نقشبند نے اس کو خوب عروج تک پہنچایااور شیخ قطب الدین کی شہادت کے بعد ان کے فرزند ملانظام الدین نے علم کے دریا بہادیئے اور لکھنؤ کو علمی مرکز کے طور پر مشہور کردیا کہ آٹھ دہائیوں سے ان کا ترتیب دیا گیا نصاب تعلیم دینی مدارس کی زینت بن چکا ہے جس کو ہر دینی دانش گاہ میں بسروچشم قبول کیا جارہاہے۔ لکھنؤ کے مشہور علماء میں ملاحسن، مفتی ظہور اللہ، مولوی عبدالحلیم اور مولوی عبدالحی جیسے بلند درجے کہ مدرسین پیدا ہوئے جن کی مثال کسی اور خاندان سے ملنا مشکل ہے۔

1۔ ہندوستانی مسلمان، ص112

2۔ ہندوستانی مسلمان، ص113

اودھ کے قصبات

ملا نظام الدین کے خاندان کے تلامذہ نے برصغیر کے کونے کونے میں رسائی حاصل کر کے علمی مجلس سجائی۔ قطب الدین شمس آباد، محب اللہ بہاری، امان اللہ بنارسی، مولوی فضل حق اور ان کے فرزند مولوی عبدالحق نے اسی خاندان سے علمی اکتساب کیا۔ اودھ کے جمیع قصبات میں علمی حلقے روشن تھے کوئی جگہ قریہ ایسا نہیں تھا جہاں علم کا فیض نہ پہنچا ہو اس جیسی ہمہ گیر علمی تحریک کی نظیر کسی دوسرے ملک میں ملنا مشکل ہے۔ [1]

1۔ ہندوستانی مسلمان،114

فصل دوم

قدیم نظامِ تعلیم کی خصوصیات اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل دوم

قدیم نظامِ تعلیم کی خصوصیات اور سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر

قدیم نظامِ تعلیم نقائص اور کمزوریوں سے پاک نہیں تھا فنی لحاظ سے اس کے متعدد پہلو قابل تنقید و اصلاح ہیں۔ اس نظام کے بانی اور ذمہ دار تھے ان کے مزاج اور اس دینی روح کی بنا پر جو اس کے اندر سرایت کئے ہوئے تھی وہ بعض خصوصیات کا حامل جو اب جدید تعلیمی نظاموں میں مفقود ہیں۔ قدیم نظام تعلیم کی اہم خصوصیات کو اجمالی طور پر ذکر کیا جارہا ہے۔ اگرچہ تفصیل تو تاریخ کے ہزاروں صفحات میں بکھری پڑی ہیں مگر اس میں سے چند مثالوں کے ساتھ خاکہ کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔

اخلاص و ایثار

قدیم نظامِ تعلیم میں اساتذہ اور طلبہ کا سب سے بڑا امتیاز جذبہ اخلاص و ایثار سے معمور ہونا تھا۔ تعلیم و تعلم کو اخروی اجر و ثواب کا موجب اور استاد و معلم کی دینی فضیلت ان کا ایمان کا بنیادی حصہ بن چکا تھا۔ وہ زہد و قناعت اور فقر و فاقہ کے مراحل کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے تھے چونکہ اس سارے عمل کو عبادت و سعادت مندی سے تعبیر کرتے تھے۔ مؤرخ ہند سید علی آزاد بلگرامی نے "مآثر الکرام" میں بلگرام کے مشہور محدث اور استاد میر سید مبارک متوفی 1115ھ کا ایک واقعہ اپنے استاد میر طفیل محمد بلگرامی کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ

> "ایک روز میر سید مبارک کی خدمت میں حاضر ہوا تو وضو کے دوران وہ لڑکھڑا گئے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ تین دن سے فقہ پر ہیں، گھر جا کر کھانا تیار کروا کر پیش کیا تو فرمایا یہ طعام اشراف ہے اگرچہ فقہ میں اس کا کھانا جائز ہے مگر طریق فقر میں یہ درست نہیں، خاموشی سے کھانا اٹھالیا اور لے دروازہ کے باہر کھڑا ہو گیا کچھ دیر بعد واپس آکر کہا کہ آپ کو توقع تھی کہ یہ کھانا واپس آئے گا تو انہوں نے فرمایا نہیں تو میں نے کہا اب یہ طعام اشراف نہیں رہا، تناول فرمالیجیے تو میری ذہانت کی داد دیتے ہوئے کھانا نوش کیا"[1]

یہ واقعہ اور اس طرح کے بے شمار واقعات دینی مدارس کے نظام تعلیم و تربیت کا حسن بن کر آشکار ہوئے کہ اخلاص وللّٰہیت، ایثار و قربانی، زہد و ورع اور فقر و فاقہ کو اہل مدارس نے اپنا امتیازی وصف بنائے رکھا۔[2]

اساتذہ کے اخلاص و ایثار کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا عبدالرحیم (متوفی 1234ھ) رام پور میں درس و تدریس کا حلقہ قائم کیے ہوئے تھے۔ انگریز حاکم سمٹر ہاکنس نے ان کو بریلی کالج میں ڈھائی سو روپے تنخواہ پر ملازمت کرنے کی پیشکش کی تو انہوں نے مختلف انداز سے اس کو ٹالتے رہے یہاں تک

1۔ مآثر الکرام، غلام علی آزاد بلگرامی، ص96-97، بحوالہ ہندوستانی مسلمان، ص 121

2۔ نزہۃ الخواطر۔۔۔ مآثر الکرام، تذکرہ علمائے ہند، نظام تعلیم و تربیت۔ میں اس طرح کے انگنت واقعات موجود ہیں۔

کہ انگریز نے مولانا کی ہر بات کا توڑ و جواب پیش کر دیا تو آخر میں مولانا نے کہا کہ روز محشر میں اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دونگا کہ میں تعلیم پر اجرت لیتا رہا۔ اس پر انگریز حاکم عاجز آگیا اور اس نے مولانا پر اصرار کرنا چھوڑ دیا۔[1]

درس میں انہماک

قدیم نظام تعلیم ایسا شاندار تھا کہ اساتذہ کرام ہمہ وقت درس و تدریس میں مشغول و مصروف رہتے اور وہ اس میں اپنی سعادت مندی سمجھتے کہ وہ علم کی اشاعت میں مصروف عمل ہیں جو کسی طور عبادت و ریاضت سے کم تر نہیں۔ اسی وجہ سے ان کو اپنی عمر کی طوالت اور شب و روز علم کی شمع روشن کرنے میں باک کا موجب نہ بن پاتے بلکہ لطف و سرور حاصل ہونے کا اہم ذریعہ سمجھتے تھے۔ ملک العلماء علامہ وجیہ الدین گجراتی نے 65-67 سال تک درس دیا، مولانا عبد السلام، ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، مولانا علی اصغر قنوجی کی مدت تدریس 60 سال ہے۔ مولانا احمد امیٹھوی عرف ملا جیون نے زندگی کے آخری دن تک علم کی شمع جلائے رکھی۔ اساتذہ کرام بشری ضرورتوں کی تکمیل اور کچھ وقت راحت کرنے کے تعلیم و تعلم میں مشغول رہتے۔ ملا عبد القادر بدیوانی اپنے استاد مولانا عبد اللہ بدیوانی سے متعلق لکھتے ہیں کہ اپنے گھر کا سودا خریدنے بازار خود جاتے تھے اور طلبہ کی جماعت ان کے ہمراہ چلتی رہتی تھی کیونکہ وہ چلتے پھرتے سبق پڑھاتے رہتے تھے۔[2]

مولانا عبد الحی فرنگی محلی کا معمول تھا کہ وہ طلبہ کو نماز فجر سے پیشتر بھی سبق پڑھایا کرتے تھے، یہی معمول کئی قدیم اساتذہ کرام کا بھی رہا ہے۔[3]

طلبہ سے تعلق

قدیم اساتذہ کرام کا اپنے طلبہ سے مضبوط تعلق اور ایسا قوی رشتہ تھا کہ اس کی مثال بھی موجودہ دور میں ملنا محال ہے۔ اساتذہ طلبہ کو اپنی اولاد سے بھی عزیز رکھتے تھے، اکثر اوقات اساتذہ طلبہ کے اخراجات کو خود برداشت کرتے تھے اور ان کے قیام و طعام اور لباس کا انتظام کر دیتے تھے۔ جلال الدین اکبر کے زمانہ کے شاہی طبیب حکیم علی گیلانی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ طلبہ کو درس دیتے اور کھانا ان کے بغیر تناول نہ فرماتے تھے۔[4]

استاد الملک مولانا محمد افضل جون پوری کو طلبہ سے ایسا گہرا شغف تھا کہ ان کے شاگرد ملا محمود جون پوری کے انتقال کا علم ہوا تو وہ اس صدمہ کی تاب نہ لا سکے، چالیس روز تک کسی نے ان کو مسکراتا نہ دیکھا بالآخر اپنے شاگرد سے جا ملے۔[5]

1۔ علماء کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں، سید ابو الحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، ص 171؛ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر بحوالہ نزہۃ الخواطر ص 324، ہندوستانی مسلمان، ص 122

2۔ منتخب التواریخ، عبد القادر بن ملوک شاہ بدیوانی، مرکز تحقیقات رایانہ ای قائمہ اصفہان ایران، ص 56

3۔ ہندوستانی مسلمان، ص 123

4۔ منتخب التواریخ ص 51

5۔ مآثر الکرام۔

ملک العلماء مولانا عبد العلی بحر العلوم کو منشی صدرالدین خان نے بہار آنے کو کہا تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ میرے پاس سو طلبہ ہیں جب تک ان کے قیام و طعام کا انتظام نہ کر لیا جائے وہ نہیں آسکتے۔ چنانچہ منشی صاحب نے مولانا کی ایک ہزار تنخواہ مقرر کی جو طلبہ کی فلاح و بہبود پر خرچ ہو جاتی ۔اہلخانہ کے بارہا اصرار کے باوجود مولانا عبد العلی طلبہ پر اپنی تنخواہ کو خرچ کر دیتے تھے۔ اسلامی تاریخ اس طرح کے واقعات سے معمور ہے۔[1]

طلبہ کا اساتذہ سے تعلق

قدیم نظام تعلیم میں طلبہ کا اساتذہ کے ساتھ روحانی و قلبی تعلق مثالی رہا جس کی وجہ سے مسلمانوں کی تاریخ ایسے واقعات پر فرحاں و شاداں ہے۔ استاد العلماء ملا نظام الدین فرنگی محلی کے انتقال کی خبر مشہور ہوئی تو ان کے ایک شاگرد جن کو استاد سے گھر الگاؤ تھا سید ظریف عظیم آبادی اس خبر کو سن کر روتے روتے آنکھوں کی بینائی کھو بیٹھے، ایک دوسرے شاگرد سید کمال الدین عظیم آبادی اپنے استاد کی جدائی کو برداشت نہ کرتے ہوئے خالق حقیقی سے جاملے۔ جبکہ بعد ازاں معلوم ہوا کہ ملا نظام الدین فرنگی محلی کے وفات کی اطلاع درست نہیں تھی۔[2]

راست روی

قدیم دینی مدارس کے فضلا کی دیگر خصوصیات کے ساتھ ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ کسی طور پر غلط و باطل افکار و نظریات کے حامل افراد، جماعت اور ریاست کی تائید و حمایت کی بجائے ان کے سامنے اعلاء کلمۃ الحق کا آوازہ حق لگاتے رہتے کہ انہوں نے کسی کو غلط سیاست، ناجائز قانون سازی اور ظلم و جبر کی راہ سے دور کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا اور ان کو کوئی حکومت یا دولتمند افراد خریدنے اور خاموش کرانے میں ناکام رہے[3]۔

مقابلہ استعمار

عربی دینی مدارس کے فضلاء کی بہتر تعلیم و تربیت اور اخلاقی و جرأت و بیداری کا ثمرہ ہے کہ انہوں نے انگریزی اقتدار کے خلاف سب سے پہلے اور سب سے مؤثر جدوجہد کی اور اس کے نتیجہ میں انہوں نے مصر، مالٹا، جزیرہ انڈمان اور کالاپانی میں قید و بند کی صعوبتوں کے ساتھ جلاوطنی و شہادت کے خلعت کو اپنے سینہ سے لگایا۔ برصغیر کی سیاست اور تحریک آزادی میں منفرد و امتیازی کردار ادا کرنے والے افراد کا بھی تعلق دینی مدارس سے ہی تھا۔[4]

1۔ نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر، سید عبد الحی حسنی ندوی، (مترجم: مولانا نور الحق قاسمی)، ناشر دارالاشاعت کراچی؛ ہندوستانی مسلمان، ص125

2۔ نزہۃ الخواطر بحوالہ ہندوستانی مسلمان، ص125

3۔ مدارس اسلامیہ، ص77

4۔ مدارس اسلامیہ، ص77-78

کردار سازی

دینی مدارس کے فضلا کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ انہوں نے معاشرے کی انحطاط پذیری کے باوجود اعلیٰ کردار واخلاق کے نمونہ پیش کیے کہ ان کی کمی کا احساس عمومی معاشرہ اور خصوصاً عصری دانش گاہوں میں پایا جارہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ فضلاء مدارس کے اخلاق و سیرت کی آبیاری قرآن وسنت اور سیرت النبیؐ اور علماء سلف کے تذکروں اور اساتذہ کے عملی نمونوں سے سیر ابی کی صورت میں ہوئی۔ [1]

بادشاہوں کی علم دوستی

قدیم نظام تعلیم کی کامیابی و کامرانی کے نہاں خوانوں میں جہاں اہل علم اساتذہ و طلبہ کا کردار نمایاں رہاوہیں پر شاہان وقت اور امراء و جاگیر داروں و مخیر حضرات کی فراخ دلی کا کردار بھی کچھ کم نہیں۔ باشاہوں اور رؤسانے ہمیشہ کوشش کی کہ وہ اپنی زندگی کے ہر گوشہ سے علم اور اہل علم کی خدمت میں شب وروز مصروف رہے۔ علم کی تحصیل و تعلیم میں مصروف و مشغول علماء وطلبہ کی خدمت کرنے میں بادشاہ اور امراء اپنی سعادت مندی سمجھتے اور اس سے ان کو قلبی سکون ملتا تھا۔

ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی سخت بیمار ہوئے تو سلطان ابراہیم شرقی ان کی عیادت کو گیا اور اس نے پیالہ پانی کا بھر کر قاضی صاحب کے سر پر گھوما کر دعا کی یا اللہ جو بیماری و تکلیف ان کو لاحق ہے مجھے اس میں مبتلا کر دیں ان کو صحت عطا فرمادے۔ چنانچہ قاضی صاحب صحت یاب ہوگئے اور سلطان ابرہیم شرقی کی وفات کے بعد سنہ 840 یادو سال بعد 842 میں قاضی صاحب فوت ہوئے۔ [2]

مغل بادشاہ جلال الدین اکبر نے امیر فتح اللہ شیرازی کی وفات پر کہا کہ اگر امیر صاحب کو انگریز قید کر لیتے اور بدلہ میں مجھ سے سلطنت کا سارا خزانہ مانگ لیتے تو میں وہ پیش کر دیتا اور یہ سودا سستا ہوتا نہ کہ مہنگا۔ شاہجہان نے دوبار ملاعبدالحکیم سیالکوٹی کو چاند اور ایک بار قاضی محمد اسلم کو سونے کے ساتھ وزن کر کے اپنی علماء دوستی کا اظہار کیا۔

مولانا بحر العلوم نے مدراس کا دورہ کیا ان کا نواب آف مدراس نے شاندار استقبال کیا کہ اس نے مولانا کو پالکی میں بٹھا کر پالکی کو اپنے کاندھے پر اٹھا کر اپنی مسند کے پاس لے جاکر مسند نشین کرتے ہوئے احترامی کلمات ادا کرنے کے ساتھ خواہش کی کہ ہمارے یہاں حاضر ہوتے رہا کریں۔ [3]

ازمنہ وسطیٰ و قدیم میں اصحاب ثروت و جاگیر و جائداد نے مدارس کے قیام اور اس میں تعلیم و تعلم اور طلبہ و علماء کے تمام تراخراجات برداشت کرتے اور اس میں وہ ازلی وابدی راحت وسکون کا موجب گمان کرتے تھے۔ صوبہ اودھ اور صوبہ الہ آباد کے بڑے بڑے حصوں کے باسیوں نے پانچ پانچ کوس، دس دس کوس پر مساجد، مدارس اور خانقاہیں تعمیر کرر کھی تھیں اور وہاں پر جوق در جوق طلبہ کے قافلے تحصیل علم کے لئے حاضر

1۔ مدارس اسلامیہ، ص79

2۔ تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ، (مترجم: عبدالحی خواجہ، مشفق خواجہ)، المیزان ناشران و تاجران کتب، الکریم مارکیٹ، اردوبازار، لاہور، جلد 4، ص677؛ ہندوستانی مسلمان، ص126

3۔ اعضان اربعہ، مولاناولی اللہ فرنگی محلی، بحوالہ ہندوستانی مسلمان، ص127

ہوتے تھے اور قریہ وبستی والے ان کے قیام وطعام کا برابر انتظام کرتے رہتے تھے۔ اسی لئے شاہجہان انار اللہ نے کہا تھا کہ پورب ہماری سلطنت کا شیر از ہے۔[1]

اصلاح دل

دینی مدارس کے پرانے نظام تعلیم کی جہاں پر بہت سے خصوصیات کو اجمالاً درج بالا میں بیان کیا گیا ہے وہیں پر اس نظام تعلیم کا ایک اہم ترین وصف یہ بھی تھا کہ علماء واساتذہ اور طلبہ کو علوم وفنون میں سند امتیاز ومہارت علیا حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی ارتکاز تھا کہ ان کے دل کی دنیا بھی آباد وشاد رہے چونکہ علم کسبی سے زیادہ علم لدنی وو ہبی کو ترجیح دی جاتی تھی کہ انسان علم کے ساتھ عمل کی دنیا کے ساتھ اپنا رشتہ استوار رکھے جبھی دنیا وآخرت میں کامیابی کا سامان کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ قدیم نظام تعلیم کے اساتذہ وعلماء نے حکام وامراء کی صحبت سے احتراز و استغناء اور اہل اللہ کی صحبت کو اپنی حیات کا خاصہ بنایا۔

دہلی میں تعلیمی اور درسی شعبہ میں مشہور اور مؤثر ترین علمی شخصیات علامہ عبد المقتدر کندی تھانیسری (م791ھ) اور ان کے شاگرد مولانا خواجگی دہلوی (م809ھ) اور شیخ احمد تھانیسری (م810ھ)، یہ تینوں حضرات شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے صحبت یافتہ تھے۔ علامہ وجیہ الدین بن نصر اللہ گجراتی (م998ھ) نے 67 سال تک درس وتدریس کا گلشن آباد وشاد رکھا اور احمد آباد میں علوم عقلیہ اور نقلیہ کے مرجع سمجھے جاتے تھے، احمد آباد سے لاہور تک ان کے شاگردوں کے علمی حلقے روشن تھے۔ ان کا اصلاحی تعلق شیخ محمد غوث گوالیار کے خلفاء سے تھا اور اسی سلسلہ کے دو استاد شاہ پیر محمد لکھنوی اور مولانا غلام نقشبند سلسلہ چشتیہ میں بیعت ومجاز تھے اور مدرسہ وخانقاہ کے جامع بھی۔[2]

درس وتدریس کے جس سلسلہ اور نصاب تعلیم کو برصغیر اور اس کے ملحقہ ممالک میں اقبال مندی میسر آئی اور اس کا شہرہ ہندوستان و افغانستان اور ایران وغیرہ تک قائم رہا اس کے بانی ملا نظام الدین سہالوی (م1161ھ) سلسلہ قادریہ کے بزرگ حضرت سید عبد الرزاق بانسوی سے اصلاحی تعلق قائم کیے ہوئے تھے ان کی محبت وعقید تمندی کی جانکاری کے لئے "مناقب رزاقیہ" کا مطالعہ معاون ثابت ہوگا۔[3]

ماضی قریب کے مشہور علمی مراکز کے بانیوں نے بھی اپنے علمی تفوق وبرتری کے باوجود خود کو اصلاحی تعلق سے ماورا نہیں سمجھا یہی وجہ ہے کہ دار العلوم دیوبند جس کا شہرہ دنیا بھر میں قائم ودائم ہے۔ اس کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی (م1297ھ) اور اس کے سرپرست مولانا رشید احمد گنگوہی (م1323ھ) کا روحانی تعلق حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے تھا اور ہر دو شخصیت ان کے خلیفہ ومجاز بھی تھے۔ دوسری علمی تحریک جس کو دنیا میں اقبال مندی ملی وہ تحریک ندوۃ العلماء ہے اس کا بانی مولانا سید محمد علی مونگیری حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی کے خلیفہ تھے۔

یہاں ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ دینی مدارس کے قدیم نظام تعلیم کے علماء واساتذہ اور ان کے شاگردوں کا یہ شعار رہا ہے کہ انہوں نے تعلیم سے فراغت کے بعد دل کی دنیا کو آباد کرنے کے لئے اہل اللہ کی صحبت کو ترجیحی طور پر اختیار کیا یا تو ان کے ہاں مقیم رہ کر اصلاح دل کا سامان کیا یا پھر ان کے پاس آمد ورفت کو یقینی بنا کر ان سے مواعظت ونصائح لیتے رہے۔ اس سلسلہ کو قائم رکھنے میں یہ امر کسی بھی طرح حائل نہیں ہوا کہ وہ

1۔ مآثر الکرام، تذکرہ ملا نظام الدین سہالوی، ص222

2۔ یاد ایام بعنوان تاریخ گجرات، سید عبد الحی حسنی ندوی، ناشر شبلی بک ڈپو لکھنو، انڈیا، بحوالہ ہندوستانی مسلمان، ص129

3۔ ہندوستانی مسلمان، ص130

جن سے سلسلہ بیعت قائم کیے ہوئے ہیں، وہ ان سے علمی مقام و مرتبہ میں زیر دست ہیں۔ جیسے مولانا شاہ اسماعیل شہید، مولانا عبد الحی برہانوی نے حضرت سید احمد شہید کی بیعت کی جو عرف عام کے مطابق عالم نہیں تھے، اسی طرح ملا نظام الدین کے مرشد سید عبد الرزاق بانسوی اور مولانا قاسم نانوتوی حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے ارادتمند تھے۔

اس اصلاحی تعلق کے اختیار کرنے کے اثرات یہ ظاہر ہوتے تھے کہ علماء و طلبہ میں عامۃ الناس سے ربط قائم کرنے کا احساس اور حکام و امراء کے مناصب و اموال سے استغناء کا شعور بھی ملتا تھا۔ برصغیر میں آٹھ سو سال تک تہذیب و اخلاق اور تزکیہ نفس کو یقینی بنانے کی وجہ سے ایک طویل عرصہ تک درس و تدریس کے حلقے فعال و متحرک رہے۔ ہندوستان کے مشہور تعلیمی اداروں دارالعلوم دیوبند کے متعلقین کا اصلاحی تعلق تھانہ بھون اور تحریک ندوۃ العلماء کے فارغین و متعلقین کا روحانی رشتہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی استوار تھا۔[1]

1۔ ہندوستانی مسلمان، ص130-131

فصل سوم
دینی مدارس کے مشہور تعلیمی تحریکیں اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل سوم

دینی مدارس کے مشہور تعلیمی تحریکیں اور سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

دینی مدارس کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے جس کو اس مختصر مقالہ میں بیان کرنا نہایت مشکل ہے۔ دینی مدارس کی خدمات اور کامیابیوں کی داستان تاریخ کے ہزاروں صفحات پر محیط ہے۔ مدارس نے مسلم معاشرے کی سیاسی و سماجی اقتصادی و عسکری ہر لحاظ سے تقویت میں کلیدی کردار ادا کیا۔ متعلقین علوم دینیہ نے ذاتی منفعت کو ترک کر کے اجتماعی مصالح کے لئے بے انتہا قربانیاں دی ہیں۔ علوم و فنون کے میدان میں ان مدارس نے ہمہ جہتی تقسیم و تفریق کا خاتمہ کیے رکھا کہ متخرجین مدارس دینیہ زندگی کے ہر شعبے میں قیادت وسیادت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ اہم مدارس کا مختصر احوال یہاں درج کیا جاتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند

برصغیر میں انگریز کے غاصبانہ تسلط کے بعد مسلمانوں کو اندوہناک مسائل کا سامنا کرنا پڑا جس میں سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ انگریز برصغیر کو عیسائی ریاست میں تبدیل کرنے کے خواب دیکھنے کے ساتھ اس کو عملی تعبیر میں ڈھالنے کے لیے نظام تعلیم پر حملہ آور ہوا اور مسلمانوں کے قائم تمام اوقاف کو ضبط کر لیا گیا اور لارڈ میکالے کے نظام تعلیم کو رائج کیا گیا۔ مسلم مفکرین اس زبوں حالی کیفیت سے تڑپ اٹھے اور انہوں نے اپنی نسل کو دینی وملی حمیت پر پابند بنانے کے لیے دینی تعلیمی ادارے اپنی مدد آپ کے تحت قائم کرنے کا فیصلہ کیا جس میں مخیر حضرات نے ان اہل علم علماء و مفکرین کے دست بازو بنے۔[1]

دینی مدارس کے قیام کا آغاز سہارن پور کے قصبہ دیوبند کی چھوٹی سی مسجد چھتہ والی سے ہوا۔ دارالعلوم کا قیام حاجی محمد عابد نے 1283ھ بمطابق 1866ء میں مولانا محمد قاسم نانوتوی و دیگر کے تعاون سے کیا۔ دارالعلوم کا آغاز اگرچہ ایک چھوٹی جگہ سے ہوا مگر اس کی جڑوں میں اخلاص و للّٰہیت اور ایثار و قربانی کا جذبہ موجود تھا اس وجہ سے اس کو دنوں میں ترقی و برتری ملتی گئی اس کے اساتذہ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اس ادارہ کو چار چاند لگا دیئے اور بعد میں دارالعلوم کو مایہ ناز علماء کرام کی سرپرستی حاصل رہی۔ جن میں مولانا یعقوب نانوتوی، مولانا محمود الحسن دیوبندی، مفتی عزیز الرحمٰن ہزاروی، مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا حسین احمد مدنی و مولانا اعزاز علی وغیرہ علم حدیث و تفسیر اور علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر میسر آئے تو صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ عرب و عجم کے طلبہ اس جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے پہنچے۔ دارلعلوم کے فضلاء کی تعداد لاکھوں میں ہے اس کے فضلاء افغانستان، بخارا، قازان، روس، امریکہ، مغرب اقصیٰ، چین، جزائر، حجاز و دیگر ممالک میں علم کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ دارالعلوم کا امتیازی اوصاف میں دین کے ساتھ مضبوط رشتہ، حنفی مسلک کی پیروی، بدعات کی بیخ کنی، فرق باطلہ کا رد، سلف صالحین کی روایات کی حفاظت اور سنت کا دفاع کرنا شامل تھے۔[2]

1۔ ہندوستانی مسلمان، ص133

2۔ ہندوستانی مسلمان، ص135

دار لعلوم کے قیام کا پس منظر

بر صغیر میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تعلیمی و اصلاحی تحریک کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند تھے۔ مولانا قاسم نانوتویؒ کی جانب سے مسلمانوں کی انگریز کے ہاتھوں شکست کا اثر مٹانے مسلمانوں کے قلوب و اذہان میں انگریزی نظام سے عداوت کا درس راسخ کرنے اور مسلمانوں کے اسلام اور اسلامی تعلیمات سے رشتہ کو قوی تر بنانے کے لیے کوشش کی گئی اسی سلسلہ میں مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں کہ

"1857ء کی کشمکش کی ناکامی کے بعد قتال اور آویزش کے نئے محاذوں اور میدانوں کی تیاری میں آپ کا دماغ مصروف ہو گیا، دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نظام اسی لائحہ عمل کا سب سے زیادہ نمایاں اور مرکزی و جوہری عنصر تھا۔ شاملی میدان سے واپسی کے بعد سوچنے والوں نے نہ تو مایوس ہو کر سوچنا چھوڑ دیا تھا اور نہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے تھے بلکہ بقاء اسلام اور تحفظ علم دین کے نصب العین کو آگے بڑھانے کے لئے ان کے دماغ بھی مصروف فکر و نظر تھے اور ان کے قلوب بھی کائنات کی مرکزی قوت سے لو لگائے غیبی لطیفہ کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے۔"[1]

مولانا قاسم نانوتویؒ کے شاگرد رشید و جانشین، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے پس منظر کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ

"حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو درس و تدریس، تعلیم و تعلم کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں 1857ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے، جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تا کہ جنگ کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔"[2]

دارالعلوم دیوبند اور حمیت دینی

دارالعلوم دیوبند کے قیام کا اصل محرک تلاش کرنے پر اگر یہ کہہ دیا جائے کہ شرعی علوم کی درس و تدریس کا انتظام کرنا تھا، یا کہا جائے کہ بدعت کی بیخ کنی اور سنت کا احیاء مطلوب تھا، اخلاص وللٰہیت پر توجہ دینا، اس طرح کے اور اسباب بیان کی جائیں تو ان سے انکار ممکن نہیں بلکہ بر صغیر کے سبھی دینی مدارس کی بنیاد اسی امر پر رکھی گئی ہے اور ان امور کی طرف انتساب ہونا خوش آئند و لائق صد تحسین بھی ہے تاہم دارالعلوم دیوبند کو دوسرے مدارس سے جو شئے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے قیام کا اصل محرک دینی حمیت و غیرت اور اسلام کی حفاظت کا جذبہ دارالعلوم کے مؤسسین کے دلوں میں موجزن تھا۔[3]

1۔ سوانح قاسمی، سیرت مولانا قاسم نانوتوی، مناظر احسن گیلانی، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور، ص:2/223-224

2۔ ایضاً226

3۔ پاجا سراغ زندگی، ص130-131

مدرسہ مظاہر العلوم

سہارن پور ہی کے شہر میں مولانا محمد مظہر نانوتوی کے نام سے مولانا سعادت علی سہارنپوری نے 1283ھ میں رکھی۔ اس دانش گاہ کو بھی بلند پایہ علماء و اساتذہ کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ مظاہر العلوم سہارنپوری دارالعلوم دیوبند کی طرز پر دوسرا اہم تعلیم مرکز تھا اس کی مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا اشرف علی تھانوی نے کی۔ مدرسہ مظاہر العلوم کے اساتذہ میں مولانا خلیل احمد سہارن پوری، مولانا محمد زکریا کاندھلوی اور مولانا محمد الیاس دہلوی و دیگر ماہرین علوم و فن نے طلبہ کو فیضیاب کیا۔ مدرسہ مظاہر العلوم نے علوم حدیث پر بہت کام کیا اور جامعہ کے اساتذہ و طلبہ میں سادہ مزاجی، قناعت پسندی اور دین پر استقامت کی خصوصی صفات تھیں۔[1]

ہندوستان میں دالعلوم دیوبند اور مدرسہ مظاہر العلوم کے منہج پر ہزاروں کی تعداد میں دینی مدارس کام کر رہے ہیں۔ جن میں ایک ہی نصاب اور ایک ہی نظام تعلیم نافذ العمل ہے، معمولی ترامیم کے ساتھ تمام مدارس ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں اور علم کی اشاعت، عقائد کی اصلاح، مسلمانوں کی خدمت میں اساسی کردار ادا کر رہے ہیں، شمالی ہند میں مرادآباد کا مدرسہ شاہی، اور دربھنگہ کا مدرسہ امدادیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مختلف مسالک کے مدارس

جماعت اہل حدیث کے مدارس کا کردار بھی مسلمانوں کی تعلیم و تربیت میں کسی سے پوشیدہ نہیں، ان مدارس میں مدرسہ رحمانیہ دہلی، مدرسہ رحمانیہ بنارس اور مدرسہ احمدیہ سلفیہ دربھنگہ دینی خدمت میں مشغول رہے ہیں۔ سرکاری و نیم سرکاری دینی مدارس کا ذکر بھی کرنا ضروری ہے کہ مدرسہ عالیہ رام پور، مدرسہ عالیہ کلکتہ اور مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کہنہ مشق اساتذہ کی سربراہی میں اپنا منفرد مقام حاصل کیا۔ فرقہ اثناء عشریہ (شیعہ) کے بھی تعلیمی مراکز ہندوستان میں مصروف عمل رہے جن کا صدر مقام لکھنؤ میں ہے۔ سلطان المدارس، مدرسہ ناظمیہ اور مدرسۃ الواعظین شیعہ مسلک کے مشہور مدارس ہیں[2]۔[3]

جنوبی ہند کے مسلمانوں میں ایک خاص قسم کا دینی ذوق پائے جانے کی وجہ سے وہاں بہت سے عربی مدارس قائم ہوئے ہیں جن میں حیدرآباد کا مدرسہ نظامیہ، عمرآباد کا جامعہ دارالسلام، ویلور کا "الباقیات الصالحات" قابل ذکر ہیں۔ صوبہ کیرالا کے شہر مالابار کے لوگوں میں عربی زبان سے قدرتی مانوسیت اور محبت دیکھنے کو ملتی ہے اس کے اثرات پورے ہندستان میں منتقل ہوئے۔ ان مدارس میں روضۃ العلوم، مدینۃ العلوم، سلّم السلام موجود تھے اور صوبہ کیرالا کی خاصیت یہ ہے کہ وہاں کی حکومت نے ملیام اور انگریزی کے ساتھ عربی زبان کا نصاب تعلیم بھی تیار کروایا ہوا ہے جس سے سکول و کالج کے طلبہ بھرپور مستفید ہوتے ہیں۔ گجرات میں بھی قدیم و جدید مدارس کی کمی نہیں، ان میں ڈابھیل کا جامعہ اسلامیہ اپنے وقت کا

1۔ ہندوستانی مسلمان، ص136

2۔ برصغیر کے مسلمانوں میں علم و شعور جلائے رکھنے والوں میں اہلسنت والجماعت (بریلوی) کا بھی کردار ہے۔ معلوم نہیں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جہاں اور مکاتب و مسالک کے مدارس کا تذکرہ کیا ان سے سہواً یا قصداً بریلوی مکتب کے مدارس کا تذکرہ اپنی تحریر میں نہ کرسکے۔ واللہ اعلم (مقالہ نگار)

3۔ ہندوستانی مسلمان، ص137

مشہور ترین ادارہ تھا کہ وہاں مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے حلقہ درس کو سجائے رکھ۔ راندیر کا جامعہ حسینیہ اور جامعہ اشرفیہ چھاپی اور آنند کے مدارس بھی تعلیم اسلام کے فروغ میں مصروف ومشغول رہے ہیں۔[1]

دارلعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کی فکر کرنے والی ہستیوں میں مولانا محمد علی مونگیری بھی ہیں۔ جن کی زندگی کا بیشتر حصہ عیسائی مشنریوں سے مناظرہ میں صرف ہوا۔ ان کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ مسلمان سیکڑوں سال پرانے علم کلام ومنطق اور فلسفہ پر سختی سے عمل پیرا ہیں اور اس سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنا گناہ خیال کر رہے ہیں۔ اس صورتحال میں نقصان صرف مسلمانوں کا ہی ہو رہا ہے کہ عیسائی مناظرہ نئے اسالیب سے مسلح ہو کر اسلام پر حملہ آور ہیں ان کے سامنے سد سکندری بننے کے لیے ضروری ہے کہ پرانے نظام تعلیم کے غیر ضروری مضامین کو کم اور جدید مفید علوم کو شامل نصاب کیا جائے۔ دوسری مشکل یہ بھی تھی کہ ہندوستان کے اکثر مکاتب فکر (حنفی، شافعی، اہل حدیث) باہم دست و گریباں تھے، سطحی مسائل اور فروعی مسائل وجہ فساد وبے چینی بن چکے تھے۔ ایسے میں مولانا مونگیری نے ابتداً انجمن ندوۃ العلماء کی بنیاد 1310ھ میں رکھی اور بعد ازاں اپنے تصورات کو عملی سانچے میں ڈھالنے کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی بنیاد 1312ھ مطابق 1892ء میں رکھی۔ مولانا محمد علی مونگیری کی اس فکر کو ہندوستان کے بلند پایہ دانشوروں اور علماء نے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اس کی تعمیر وترقی کے لیے صف آراء بھی ہو گئے۔

ندوۃ العلماء کی سرپرستی ونگرانی کرنے والوں میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی، مولانا عبدالحق حقانی، قاضی سلمان منصور پوری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری، حکیم سید عبدالحی، نواب سید علی حسن خان اور حکیم ڈاکٹر عبدالعلی قابل ذکر نام ہیں۔ ندوۃ العلماء مسلمانوں میں اعتدال ورواداری کو فروغ دینے کے لیے قائم ہوا اور ندوۃ نے قدیم نظام تعلیم کے بارے میں پائے جانے والے تصور کو غلط ثابت کیا کہ پرانے نظام تعلیم میں حذف وترمیم بدعت اور تحریف ہے۔ کیونکہ ندوۃ العلماء کے منتظمین کی یہ فکر تھی کہ دین ابدی اور غیر متبدل ہے لیکن نظام تعلیم ایک تغیر پذیر شئ ہے جس میں حالات وواقعات کے پیش نظر قطع برید کرنا درست ہے۔[2]

ندوۃ العلماء کے قیام کا پس منظر

برصغیر کے مسلمانوں کو انگریز کے ہاتھوں شکست ہوئی تو مسلمانوں میں اپنی جمعیت کو سنوارنے اور سنبھالنے کے لئے دو تحریکیں وجود میں آئیں، ایک دارالعلوم دیوبند جس نے مسلمانوں کے علمی ورثہ کی حفاظت اور مسلمانوں کے ایمان کو مضبوط بنانے کا انتظام کیا تو دوسری سرسید احمد خان کی تحریک علی گڑھ جس نے مسلمانوں کے سیاسی وسماجی اور معاشی تحفظ کا انتظام کیا۔ دراصل دونوں تحریکیں متضاد اس طور پر سامنے آئیں کہ اول الذکر نے خالص اسلامی علوم کی تعلیم اور اسلامی تہذیب وثقافت کو لازم جانتے ہوئے انگریزی وعصری تعلیم کی نفی کر دی جبکہ تحریک علی گڑھ نے انگریزی نظام ونصاب تعلیم کو لازم جان کر انگریز کی تہذیب وثقافت کو اختیار کرنے کا سامان کیا۔ ایسے میں ضرورت تھیں کہ عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کو اپنے شاندار ماضی سے مرتبط کرنے کے ساتھ جدید علوم وفنون اور انگریزی زبان وادب پر بھی درک حاصل کر کے اس کو اشاعت اسلام

1۔ ہندوستان مسلمان، 138

2۔ ہندوستانی مسلمان، ص140

کے لئے کارآمد بنایا جائے۔ بانی تحریک ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیری اور ندوۃ کو جدید و قدیم خطوط پر بہتر انداز سے گامزن کرنے والے علامہ شبلی نعمانی کے اقتباسات پیش خدمت ہیں:

مولانا محمد علی مونگیری لکھتے ہیں کہ "اس زمانہ میں حالت بدل گئی ہے، وہ اعتراضات جو پہلے فلسفہ میں کئے گئے اب انہیں کوئی نہیں پوچھتا ،اور نہ وہ فرقے اعتراضات کرنے والے باقی رہے، اب ان کے اعتراضات اور جوابات سیکھنے کی ضرورت نہ رہی، اب نیا عالم، نیا دانہ، نیا پانی ہے جدید فلسفہ کی بناپر اس زمانہ کے مخالفین اسلام نے نئے نئے قسم کے اعتراضات کئے ہیں جو پہلے نہ تھے ان کا شافی طور پر جواب دینا قدیم فلسفہ کے جاننے سے نہیں ہو سکتا اگرچہ کوئی کیسا ہی دعویٰ کرے، وجہ اس کی یہ ہے کہ معترض کا جواب شافی اس وقت ہو سکتا ہے جب اس کے منتہائے اعتراض کو اچھ طرح سمجھ لیا جائے، اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ کس بناپر اس نے اعتراض کیا ہے۔"[1]

علامہ محمد شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ

> "یہ یونانی علوم نہ ہمارے مذہبی علوم ہیں نہ ہمارے مذہب کی فہم و معرفت ان پر موقوف ہے، امام غزالیؒ نے اپنے زمانہ سے ان علوم کو علماء کے نصاب میں اس لئے داخل کیا تاکہ ان یونانی علوم کے اثر سے جن کو اس زمانہ میں زیادہ تر باطنیوں نے پھیلا رکھا تھا، علماء اسلام واقف ہو کر اس زمانہ کے الحاد کا مقابلہ کر سکیں، لیکن اب نہ وہ ملحد رہے، نہ وہ یونانی علوم رہے، نہ ان کے مسائل کی صحت کا یقین عقل کے مدعیوں کو رہا، اس لئے ان کا اثر خود بخود زائل ہو گیا اور اب ان سے اسلام کو کسی گزند کا خوف نہیں رہا، اب اس کی جگہ نئے علوم ہیں، نئے مسائل ہیں، نئی تحقیقات ہیں، اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے علماء ان نئی چیزوں سے واقف ہو کر اسلام کی نئی مشکلات کا حل نکالیں اور نئے شبہات کا تحقیقی جواب دیں۔"[2]

ندوۃ العلماء کی خصوصیات

ندوۃ العلماء کی خصوصیات میں سے ہے کہ اسلامی علوم اور درسی نصاب میں حسب ضرورت ترمیم کی جاسکتی ہے، قرآن مجید کی تعلیم کا اس انداز سے اہتمام کیا گیا کہ اس کتاب ہدایت سے رہنمائی حاصل کرنا آسان ہو جائے، عربی زبان و ادب پر ندوۃ نے خصوصی توجہ اس طرح کی کہ وہ زندہ و جاوید زبان ہے اور بجز اس کے قرآن و سنت کو سمجھنا محال ہے۔ ندوۃ نے بعض علوم کو جو عصر حاضر میں قابل استفادہ نہیں تھے کو یا تبدیل کیا یا ان میں ترمیم کر دی اس کے ساتھ وقت و حالات کی ضرورت و تقاضوں کے مطابق ایسی کتب کو شامل نصاب کر دیا جن سے فائدہ اٹھانا لازم تھا۔ ندوۃ کا مقصد ایسے افراد تیار کرنا تھا کہ وہ داعی اسلام اور شارح دین حنیف بنیں اور قدیم و جدید علوم سے بیک وقت فیض حاصل کر کے اشاعت اسلام میں مشغول ہونے والے افراد تیار ہو پائیں۔ ندوۃ کے فضلاء نے اسلامی ادب، علم کلام، تاریخ اور سیرت النبیؐ پر گراں قدر کتب مہیا کیں جن سے کروڑوں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔[3]

1۔ مکاتیب محمدیہ، بحوالہ اسلامیت و مغربیت کی کشمکش، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، ص 91-92

2۔ حیات شبلی (سیرت علامہ شبلی نعمانی) سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ انڈیا، طبع جدید، 2008ء، ص26

3۔ ہندوستانی مسلمان، ص 141

ندوۃ العلماء کا امتیاز اور پیغام

ندوۃ العلماء کے قیام کا محرک اصلی یہ تھا کہ مسلم معاشرہ کو علمی و دینی مسائل پر سنجیدہ اور مؤثر انداز میں پیش کرنے اور مستشرقین و مستغربین کی جانب سے اٹھائے جانے والے سوالات جن کی وجہ سے نوجوان نسل کا اسلام پر اعتماد متزلزل ہو گیا تھا کو دور کرنا تھا۔ اس سلسلہ میں مولانا سید محمد علی مونگیری جیسی بالغ نظری، علامہ شبلی جیسے متکلم دوراں اور سیرت نگار و مؤرخ اور علامہ شبلی کے طرز پر علمی کام کا بار اٹھانے والے علامہ سید سلیمان ندوی، عبد السلام ندوی وغیرہ جیسی شخصیات نے بنیادی کردار ادا کیا۔ تاہم وقت کے گزرنے نے مسلم و غیر مسلم ممالک میں ان سے بلند پایہ ادیب و مؤرخ اور متکلم مفقود ہو گئے۔ یہ حالات خوفناک ہے ایسے میں ضروری ہے کہ متعلمین ندوہ اور مسلم ممالک کے علماء و فضلاء اس بھاری ذمہ داری کو سنبھالتے ہوئے نئی نسل جو یورپ میں تعلیم حاصل کر رہی ہے یا ان کی تہذیب و ثقافت سے متاثر ہو رہی ہے کا اعتماد اسلامی تہذیب و تمدن اور شریعت اسلامی پر قائم کرنے کے لئے مختلف میادین علمی میں خصوصی مقام حاصل کریں۔ دینی تعلیم کا اجمالی و تفصیلی طور پر دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کریں اور معاشرہ میں واقع اہل علم کی کمی کو دور کرنے کے لئے کم از کم علامہ شبلی کا طرز تحریر، علامہ سید سلیمان ندوی کی متانت، مولانا عبد السلام کی ادبیت اور مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا ناظم ندوی کا ساعربی ذوق اختیار کریں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک وقت تک فروعی مسائل علم کلام، تمدنی مسائل، باہمی اختلاف اور نظام تعلیم کی اصلاح و ترقی کی تحریک کو ٹھنڈا کر دیں تاکہ مسلم معاشرہ کی اولین ضروریات کا سامان وافر مہیا ہو سکے۔[1]

نصاب تعلیم

ندوۃ العلماء کے نصاب و نظام تعلیم کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس نے نصاب تعلیم کو تغیر و ترقی پذیر ذریعہ تعلیم و تربیت سمجھا ہے اسی بنا پر دینی تعلیم میں جہاں پر ترمیم و اضافہ کو رواج دیا اور اس کو آسان و قابل فہم بنانے کی سعی کی وہیں پر ندوۃ العلماء نے یونانی فلسفہ و منطق اور علم کلام کے رد میں موجود نصابی کتب کے بڑے حصہ کو جو غیر ضروری تھا کو حذف کر کے اس کی جگہ انسانی معاشرہ کی ضرورت اور دور جدید کے تقاضوں کے عین مطابق نئے علوم کو شامل نصاب کیا جن میں علم ریاضی، جغرافیہ اور تاریخ و دیگر جدید کتابوں سے متمتع ہونے کے لئے انگریزی کی تعلیم کا بھی انتظام کیا۔[2]

ندوۃ العلماء سے متعلق مفکرین کی آراء

دار العلوم ندوۃ العلماء کے متعلق ڈاکٹر سر محمد اقبال لکھتے ہیں کہ

"میرا ایک مدت سے عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان جو سیاسی اعتبار سے دیگر ممالک اسلامیہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے، دماغی اعتبار سے ان کی بہت کچھ مدد کر سکتے ہیں، کیا عجب ہے کہ اسلامی ہند کی آئندہ نسلوں کی نگاہوں میں ندوہ علی گڑھ سے زیادہ کامیاب ثابت ہو۔"[3]

1۔ علماء کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں، ص72-73

2۔ مدارس اسلامیہ، ص82

3۔ اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں، اختر راہی، بزم اقبال کلب لاہور، طبع اول 1978ء، ص188۔

شیخ الازہر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود نے ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن کی تقریب جو 1975 میں منعقد ہوئی سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

"آج پورا عالم اسلام ندوہ کی قابل تحسین و آفرین مسائی کا احساس رکھتا ہے، اور نشر و اشاعت کی ان کوششوں اور خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو یہاں انجام دی جا رہی ہیں، ان علماء کے کام اور مقام کا بھی اس کو احساس ہے جو غور و فکر میں مشغول ہیں، اور راہ خدا میں ہر طرح کوشش کر رہے ہیں۔"[1]

سابق جج اپیلنگ کورٹ دمشق شام، سابق پروفیسر بغداد یونیورسٹی عراق اور خطہ عرب کے ممتاز ادیب و انشاء پرداز علامہ شیخ علی طنطاوی نے ندوۃ العلماء کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ

"ندوہ ایک معتدل اور جامع رستے پر چلنے والا ادارہ ہے، یہ راستہ نہ اپنی منزل سے منحرف ہوا ہے اور نہ اس نے اس مستقیم راہ کو چھوڑا ہے، یہ قدیم مدارس جامع ازہر وغیرہ اور جدید جامعات (یونیورسٹیوں) کے درمیان ایک معتدل اور جامع راستہ ہے، جس میں نہ مدارس کا جمود ہے، نہ جدید جامعات کی جدت پسندی، اس نے ان دونوں کے درمیان کا راستہ اختیار کیا ہے اور اس میں کامیاب ہوا ہے۔ میں ایک بار ٹی وی کو انٹرویو دے رہا تھا تو مجھ سے پوچھا گیا کہ آپ بقیہ زندگی کہاں بسر کرنے کے خواہشمند ہیں تو میں نے کہا اگر دمشق نہ جا سکوں اور اور بیت اللہ کے جوار میں رہنا نصیب نہ ہو تو لکھنو جانے کو ترجیح دونگا اور ندوۃ العلماء کی درسگاہ میں قیام کروں، جو ایک پر فضا محل و مقام بھی ہے اور وہاں علماء کی صحبت بھی میسر ہے۔"[2]

مدرسۃ الاصلاح اور دارالعلوم بھوپال

اعظم گڑھ کے علاقہ سرائے میر میں مولانا حمید الدین فراہی نے مدرسۃ الاصلاح کی نو ڈالی۔ اس مدرسہ کی خصوصیت یہ رہی کہ انہوں نے تفسیر قرآن اور فہم قرآن کو اپنا اساسی موضوع بنایا اور مولانا حمید الدین فراہی کے شاگردوں نے اپنے استاد کی تفسیری انداز کو اپنی زندگی خصوصی مقام دیا۔

دار لعلوم بھوپال برصغیر کا اہم تعلیمی مرکز تھا، 1948ء میں ریاستوں کو مسخر کر لینے کے بعد یہ مدرسہ گل ہو چکا تھا، تاہم مولانا سید سلیمان ندوی کی سرپرستی میں مولانا محمد عمران خان ندوی بھوپال کی مسجد "تاج المساجد" میں دارالعلوم کے نام سے ایک مدرسہ قائم ہوا۔ اس دارالعلوم کا نصاب و طریق تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طرز پر مبنی تھا اس عالم میں یہ مدرسہ مدھیہ پردیش کا اہم دینی تعلیم کا مرکز بن چکا ہے۔[3]

جماعت اسلامی کا نصاب اور اس کی درسگاہ

اسلامی لٹریچر کی اشاعت میں جماعت اسلامی ہندوستان کا کلیدی کردار ہے، اردو ہندی میں اسلامی روح کا حامل نصاب اور درسی کتب کی تالیف مسلم طلبہ کے لئے بہتر رہنمائی کا ذریعہ بنی۔ جماعت اسلامی نے رام پور میں جماعت کے مثالی نظام و نصاب کو درس گاہ میں نافذ کیا گیا ہے۔[4]

1۔ روداد چمن، سید محمد الحسنی ندوی، مجلس صحافت و نشریات، ٹیگور مارگ ندوۃ العلماء لکھنو انڈیا، طبع دوم 2013ء، ص 141

2۔ مقدمہ کتاب مسیرۃ الحیاۃ، ص 13

3۔ ہندوستانی مسلمان، ص 142

4۔ ہندوستانی مسلمان، ص 151

دینی تعلیمی بورڈ اور دینی تعلیمی کونسل

1947ء میں برصغیر کی آزادی کے بعد ہندوستان میں سیکولر ریاست کے قیام کا اعلان کیا گیا تھا بعد ازاں مختلف حیلے اور بہانوں سے مسلمانوں کے کی دینی و تہذیبی ارتداد کا موجب بننے والے اعمال کا آغاز کیا جانے لگا جس میں نظام تعلیم میں بنیادی تبدیلیاں کر کے بت پرست جیسے اسلامی تعلیمات کو گزند پہنچانے والی باتوں کو شامل کیا جانے لگا تو دردمند مسلمانوں نے نئی نسل کے ایمان و ایقان کو محفوظ بنانے کے لئے جمیعت علماء ہند کے زیر اہتمام دینی تعلیمی بورڈ اور دیگر اہل علم کی سرپرستی میں دینی تعلیمی کونسل اترپردیش میں قائم کی گئی۔ ان ہر دو اداروں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلم نوجوانوں کو الحاد و لادینیت کے حملوں سے بچانے کے لیے دینی مدارس و مکاتب قائم کیے جائیں۔ جن کے سبب نوجوان اسلامی تعلیمات سے بہرور ہو سکیں اور اسلام مخالف سرگرمیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کمربستہ بھی ہو پائیں۔[1]

مدرسۃ العلوم (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

برصغیر میں انگریز کے ہاتھوں 1857ء کی جنگ میں شکست کے بعد مسلمان جو ایک ہزار سال تک اس خطہ کے حکمران رہے تھے کو سلطنت اقتدار سے نکال باہر کر دیا گیا اور ان کو ہر طرح کی سرکاری ملازمتوں سے دور کر دیا گیا۔ ایسے میں دردمند دل رکھنے والے مسلم رہنما سرسید احمد خان نے 1875ء میں مدرسۃ العلوم قائم کیا جو بعد میں علی گڑھ کالج کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے قیام کے مقاصد میں سے یہ تھا کہ مسلم نوجوان کو سیاسی و معاشرتی طور پر مضبوط کیا جائے اور وہ جدید تعلیم (انگریزی وغیرہ) سیکھ کر انگریزوں کا اعتماد حاصل کر کے نا صرف ملازمت کے مواقع حاصل کر سکتا ہے بلکہ سیاسی و معاشرتی اور تعلیمی طور پر مستحکم بھی ہو سکتا ہے اور اسی امر کی بدولت سرسید احمد خان کی یہ تحریک متحدہ قومیت کے مقابلہ میں مسلم قومیت کی تحریک کے قیام کی موجب بنی۔ مسلم خاندان کے امیر گھرانوں سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں نے بڑی تعداد میں اس میں تعلیم حاصل کی اور یہی کالج بعد میں 1920ء میں مسلم یونیورسٹی کے درجہ میں تبدیل ہو گیا۔ سرسید احمد خان نے انجمن مسلم ایجوکیشنل کانفرنس 1886ء بھی قائم کیا جس کا مقصد مسلم نوجوان میں علم کی اشاعت اور مسلم طلبہ کے تعلیمی مسائل حل کرنا تھا۔ اسی انجمن کے متعلقین نے 1906ء مسلم لیگ کے نام سے مسلم قومیت کی علمبردار جماعت قائم کی۔ سرسید کی یہ تحریک مسلمانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئی اور اس کے ساتھ برصغیر کی مایہ ناز شخصیات وابستہ رہی ہیں نواب وقار الملک، نواب محسن الملک، نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی، مولانا الطاف حسین حالی وغیرہ۔[2]

سرسید احمد خان کے افکار و خیالات

سرسید احمد خان نے مسلمانوں کی 1857ء کی جنگ میں شکست اور اس کے جواب میں انگریز کے معاندانہ رویہ کو بھانپتے ہوئے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم و تربیت کی راہ پر گامزن کیا جس کے اثرات دوررس ہندوستان کے باسیوں پر مرتب ہوئے کہ سرسید نے دل جمعی و اخلاص کے ساتھ اپنی اس فکر کو فروغ دینے میں مصروف رہے کہ مسلمانوں کا بھلا اسی میں ہے کہ وہ انگریزی تعلیم و تربیت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں وگرنہ اگریز ہندوؤں کے ساتھ

1۔ مسلمانوں کے موجودہ مسائل و مشکلات، سید ابوالحسن علی ندوی

2۔ ہندوستانی مسلمان، ص 143-148

مل کر مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بندیوں میں مزید بر آنگیختہ ہو گا اور انگریز کے جانے کے بعد مسلمانوں کو ہندوستان میں کوئی امتیازی مقام حاصل نہیں ہو گا بلکہ سب کچھ وہ ہندوؤں کے سپرد کر دیں گے۔ تحریک علی گڑھ اور سر سید احمد خان کی کوششوں کا ثمرہ ہے کہ برصغیر میں تحریک خلافت، تحریک آزادی جیسی مؤثر ترین تحریکیں چلیں اور تحریک علی گڑھ کے متعلقین نے تحریک آزادی کو افرادی قوت فراہم کی بلاآخر برصغیر میں مسلمانوں کو ایک الگ ملک پاکستان کے نام سے حاصل ہوا۔ اسی طرح سر سید کے علم وادب کے متعدد گوشوں میں مثبت اثرات بھی عیاں نظر آتے ہیں۔

سر سید احمد خان کی تحریک کے جہاں پر مثبت پہلو ہیں وہیں پر منفی اثرات بھی ہیں کہ سر سید احمد خان کے انگریز اور انگریزی سے مرعوبیت کو دیکھ کر دینی حلقہ میں ان کی مخالفت کو تقویت ملی کہ اول وہ انگریزی کی تعلیم بمع تہذیب وثقافت کو اختیار کرنے کے داعی بنے جس سے اسلامی تہذیب وتمدن سے نئی نسل کا ربط ختم ہو گیا اور دوسرا یہ کہ سر سید نے انگریزوں سے مرعوب ہو کر یا ان کو خوش کرنے کے لئے اسلامی تعلیمات کی من چاہی تفسیر پیش کی اور تیسرا امر یہ کہ سر سید نے خود انگریز کے ترقی یافتہ بننے میں معاون عنصر صنعتی تعلیم کی نفی کی کہ وہ مسلمانوں کے لئے صنعت وحرفت کی تعلیم کو ضروری نہیں سمجھتے تھے۔[1]

نمونہ کے طور پر عصر حاضر میں اسلامی فکر کے مصنف ڈاکٹر محمد البہی کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے کہ سید احمد خان کی تحریک علوم طبعیہ اور مغرب کے مادی تہذیب کے عشق و شیفتگی پر قائم تھی، اسی طرح جس طرح زمانہ حال کے مفکرین، سائنس اور اس کی ایجادات و فتوحات یا طبعیات سے اس قدر وابستگی اور عشق، روحانی ومثالی اقدار کی قیمت کم کر دیتا ہے، حالانکہ یہ قدریں وہ ہیں جن پر آسمانی مذاہب کی بنیاد ہے، اور جس کی نمائندگی سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اسلام نے کیا ہے، علوم طبعیہ سے یہ غیر معمولی لگاؤ بعض اوقات ہر اس چیز کے انکار تک پہنچا دیتا ہے جو انسانی حس اور مشاہدہ میں نہ آسکے، یہی چیز تھی جس کا رشتہ سید جمال الدین افغانی نے سر سید احمد خان کے الحاد اور ان کے مذہب نیچری سے جوڑا ہے، اور باوجود ان کے بار بار یہ کہنے کہ کہ وہ اسلام کا دفاع کر رہے ہیں انہوں نے ان پر الحاد کا الزام لگایا، سر سید کا کہنا یہ تھا کہ ان کی کوشش یہ ہے کہ موجودہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسا طریقہ پیدا کریں جس میں وہ اپنے اسلام پر قائم رہتے ہوئے اس جدید زندگی کو اپنا سکیں جو علوم طبعیہ کی ترقی کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے۔[2] ان جیسی وجوہات کی وجہ سے سر سید کی تحریک مسلمانوں کو منفعت پہنچانے میں ناکام رہی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چند ہونہار فضلا نے تحریک خلافت کے زمانہ میں یونیورسٹی سے علیحدگی اختیار کر کے 1920ء آزاد قومی ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے قائم کیا، اس کا سنگ بنیاد شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی نے رکھا۔ اس جامعہ کی قیادت مولانا محمد علی جوہر نے کی اور ان کی رفاقت معاونین خاص حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری میسر تھی۔ جامعہ کے اساتذہ وطن کی محبت اور جذبہ ایثار و قربانی سے لیس تھے۔ معروف ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین کی قیادت میں مخالف نظریات کا بہتر عرصہ تک مقابلہ کیا جاتا رہا اور جامعہ ملیہ نے ثقافت و تعلیم اور علم وادب کے میدان میں گراں قدر خدمت انجام دیں۔ اب یہ جامعہ مکمل حکومتی سرپرستی میں کام کر رہی ہے۔[3]

1۔ اسلامیت ومغربیت کی کشمکش، ص95تا105

2۔ العروۃ الوثقیٰ، بحوالہ اسلامیت ومغربیت کی کشمکش، ص99-100

3۔ ہندوستانی مسلمان، ص144-145

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ یہاں پر اردوزبان کو ذریعہ تعلیم بنایا گیااور دوسری زبانوں سے جدید علوم فلسفہ و حکمت، طبیعیات، طب، سیاسیات و معاشیات اور تاریخ کا بڑا ذخیرہ اردو میں ترجمہ کر کے منتقل کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ بہت سی علمی اصطلاحات کو اردو میں منتقل کرنے اور بنانے کا کام بھی اس جامعہ نے ادا کیا۔ اس جامعہ کو یہ بھی امتیاز حاصل ہے کہ لائق ترین اساتذہ اور ماہرین تعلیم کی تدریسی خدمات حاصل رہیں۔ جن میں مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبد الباری، پروفیسر الیاس برنی، ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم، ڈاکٹر حمید اللہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔[1]

1۔ ہندوستانی مسلمان، ص145-146

باب دوم

دینی مدارس کے نصاب تعلیم کے بارے میں سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل اول: دینی مدارس میں درس نظامی کے درجات اور سید بوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل دوم: دینی مدارس کے نصابِ تعلیم کے بارے میں سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل سوم: دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں تبدیلی اور اس کی افادیت پر سید ابوالحسن ندوی کی فکر جائزہ

فصل اول

دینی مدارس میں درس نظامی کے درجات اور سید ابوالحسن ندوی کی فکر

فصل اول

دینی مدارس میں درس نظامی کے درجات اور سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

برصغیر کے دینی مدارس میں درس نظامی کے جو مروجہ درجات رائج ہیں ان پر گفتگو سے پیشتر لازم ہے کہ درس نظامی کے پس منظر کو بیان کر دیا جائے۔ درس نظامی کو جو مقبولیت کا خلعت ملا ہے یہ ایک عظیم شرف سے کم نہیں ہے کہ ملا نظام الدین سہالوی کے مرتب کردہ نظام تعلیم کو برصغیر کے گوشہ گوشہ میں بالاتفاق نافذ کیا گیا جب کہ درس نظامی کے مرتب کرنے والوں میں ان کے علاوہ بھی اہل علم شخصیات نے نظام تعلیم کے مناہج کو مدون کیا جیسے بارہویں صدی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ماضی قریب میں مولانا ابوالکلام آزاد، تحریک ندوۃ العلماء وغیرہ نے مسلم معاشرے کی دینی تعلیم و تربیت کے لئے نصاب تعلیم تیار کیا جس سے استفادہ ضرور کیا گیا ہے مگر گذشتہ سات آٹھ صدیوں سے جو نام درس نظامی کا قائم ہے اور اس کو برصغیر کے جمیع ممالک کے علاوہ بھی پسندیدگی اور قابل قدر نگاہ سے نا صرف دیکھا جاتا ہے بلکہ اس کو افغانستان، ایران، خراسان وغیرہ میں نافذ بھی کیا گیا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے درس نظامی کے نصاب پر جو اظہار خیال کیا اس کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

درس نظامی کی خصوصیات

برصغیر میں جو نظام تعلیم کئی صدیوں سے رائج ہے جس کو "درس نظامی" سے منسوب کیا جاتا ہے یہ نظام و نصاب تعلیم ایران و ترکستان وغیرہ میں بھی نافذ العمل رہا ہے۔ موجودہ دور کے نظام تعلیم کی خامیوں اور عیوب سے پاک تھا اس میں درس نظامی کے علاوہ کوئی بھی منہج تعلیم نہ تھا۔ جس کا بدیہی نتیجہ یہ نکلا کہ درس نظامی کے فضلا شرعی علوم میں سوسائٹی کی رہبری کے ساتھ انتظامی و عسکری، معاشی و معاشرتی میادین میں بھی قیادت کی باگ ڈور سنبھالتے تھے۔ اب جب مسلم ممالک میں نظام تعلیم میں دوئی و ثنویت در آئی ہے کے سبب مسلم سوسائٹی علمی و فکری، تعلیمی و تحقیقی اور اخلاقی و اجتماعی الجھنوں کا شکار ہو چکی ہے۔ [1]

درس نظامی کا نصاب جب رائج ہوا تو وہ اپنے وقت کی تمام تر ضرورتوں کو پورا کرتا تھا، نصاب تعلیم چونکہ زمان و مکان کے اثرات کے تابع ہوتا ہے اور انسانی زندگی پر اپنے اثرات کو مرتب کرتا ہے خواہ مثبت ہوں یا منفی۔ البتہ مثبت اثرات مرتب ہونا خوش آئند ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دینی مدارس کے فضلا معاشرے کی تعمیر و ترقی اور اصلاح میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں اور اگر یہ اثرات برے ہوں تو پھر لازم ہے کہ اہل علم اپنے نصاب تعلیم کا جائزہ لیں تاکہ کمی کو دور کیا جا سکے۔ ماضی کے علماء کی تصنیف و تالیفات شاہد ہیں کہ ان کے ہاں اپنی بات کو منوانے کی صلاحیت موجود تھی اور وہ اپنے مخالفین کو چت کرنے میں مختلف اسالیب کو اختیار کرنے میں باک محسوس نہیں کرتے تھے۔ انہی اثرات کا تقاضہ و نتیجہ تھا کہ وہ جب کسی بات کو ثابت کرنا چاہتے تو اس کو پورے لوازمات کے ساتھ متحقق کر دیتے تھے۔ اور ماضی بعید و قریب کی کتب تفاسیر کا جائزہ لیا جائے تو معلوم پڑ جاتا ہے کہ اہل عرب کا مزاج تفسیر اور اہل عجم کا مزاج تفسیر کیا ہے۔ اہل عرب کے ہاں مقصدیت، سادگی اور علمیت کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ بعد کی تفاسیر میں یہ بات اس لئے نہیں نظر آتی کیونکہ وقت و حالات کی کیفیت تبدیل ہو چکی تھی۔ [2]

1۔ نظام تعلیم، ص69 اور 88

2۔ نظام تعلیم، ص88-89

نصاب میں معقولیت کا غلبہ

دینی مدارس میں رائج درس نظامی میں عقلی علوم کو مرکزیت حاصل ہوگئی جو ماضی میں صرف شمسیہ اور صحائف کی تعلیم پر اکتفاء کی صورت میں موجود تھی اب اس کے لئے درجنوں کتب اور پھر منتہیات، حواشی، شروح اور تعلیقات کا ایک طویل سلسلہ قائم ہوگیا کہ ان کے پڑھے بغیر انسان کا علم، علم نہیں سمجھا جاتا، اسی طرح شروحات کی کثرت بھی اور حواشی کی کثرت نے بھی رواج پایا۔[1]

دینیات کی تعلیم

ہندوستان کے دینی مدارس میں جو نصاب تعلیم رائج ہوا درس نظامی کے نام سے اس میں دینیات کی صرف تین کتب کی تعلیم دی جاتی تھی علم حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح، علم تفسیر میں جلالین، اور بیضاوی کی صرف ایک سورہ سورہ بقرہ، فقہ میں شرح وقایہ کی اولین اور ہدایہ کی آخرین گویا ایک ہی کتاب علم فقہ کی۔ اسی طرح فضل والے نصاب میں بھی جلالین، مشکوٰۃ، شرح وقایہ و ہدایہ کے ساتھ مختصر القدوری کے علاوہ چالیس کے قریب دیگر جن کتب کی تعلیم دی جاتی ہے ان کا تعلق اگرچہ دیگر علوم سے ہے مگر ان پر معقولیت کا رنگ جابجاغالب نظر آتا ہے۔ علم نحو کو سمجھنے کے لئے جو کتاب درس نظامی میں درج ہے شرح ملاجامی اس میں معقولیت کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ کتاب علم نحو کی بجائے علم منطق کی معلوم ہوتی ہے یہی کیفیت دیگر دیگر علوم اصول فقہ و کلام کی بھی ہے۔ اسی طرح عربی زبان و ادب کو سمجھنے کے لئے مختصر المعانی اور مطول کی تعلیم کے ذریعہ سے بجائے علمی ذوق سلیم طالب علم کو حاصل ہو، اس کی ذہن کو لذت صرف حاصل ہو پاتی ہے۔[2]

عصری علوم سے تعلق

جیسا کہ مندرجہ ذیل بحث سے معلوم ہوا ہے کہ دینی مدارس میں رائج درس نظامی کے نصاب تعلیم میں دینیات کی صرف تین کتب شامل تھیں باقی سب معقولیت و منطوقیت سے تعلق رکھتی تھیں اور یہ ایرانی و یونانی علوم کو برآمد کرنے کے سبب ہوا۔ البتہ یہ امر دو باتوں سے خالی نہیں کہ یونانی و ایرانی تہذیب و ثقافت کی یلغار کا جواب مسلمان اہل علم کے پاس نہ تھا اس لئے نسل بعد نسل یہ نصاب برابر جاری رہا یا پھر اہل علم نے دینی علوم کو ضرورت کی حد تک شامل نصاب کر کے عصری علوم کی جانب اپنی نظر کو ملتفت کیے رکھا تا کہ مسلم نوجوان وقت کے تقاضوں سے لاعلم نہ ہو پائے اگرچہ اس کے مسلم معاشرے پر سخت منفی اثرات ہی کیوں نہ مرتب ہوئے ہوں۔[3]

1۔ پاک و ہند کے مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، مناظر احسن گیلانی، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور، ج2، ص273 تا274، بحوالہ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ ص95

2۔ پاک و ہند کے مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ص315، ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ ص96-97

3۔ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟، ص97

طلبہ کے القاب اور علوم

دینی مدارس میں رائج نصاب تعلیم میں معاشرے کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے علم حاصل کرنے والوں کی درجہ بندی ان کے ذوق علمی سے وابستہ تھی اور ان کو معاشرے میں مخصوص القاب سے پکارا جاتا تھا جن میں منطق و حکمت کے ماہر ،دینیات کے کم تعلیم یافتہ کو فاضل کہاجاتا تھا،جو شخص محض دینیات پر مکمل دسترس رکھتا اس کو فاضل کہاجاتا اور جو فنون ادبیہ پر مہارت رکھتا اس کو قابل کے القاب سے نوازاجاتا تھا۔[1]

درس نظامی اور آکسفورڈ کا طالب علم

دینی مدارس کی تعلیم کے نصاب میں باوجود کمی بیشی کے اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان کے نصاب تعلیم کے متعلق خود انگریز مبصر جنرل سلیمان نے یہ اعتراف کیاہے کہ دینی مدارس کا نصاب تعلیم عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہی نہیں بلکہ ان کو سمجھنے اور ان سے نبرد آزماہونے کا جذبہ رکھتاہے۔اس نے کہاہے کہ

> "جو علوم ہمارے بچے لاطینی اور یونانی زبانوں میں اپنے کالجوں میں حاصل کرتے ہیں وہی یہ لوگ (ہندوستانی مسلمانوں کے بچے)عربی و فارسی میں سیکھتے ہیں،،سات سال کے درس (یعنی درس درجہ فضل) کے بعد ایک ہندوستانی طالب علم اپنے سر پر آکسفورڈ کے فارغ التحصیل طالب علم کی طرح علم سے بھرا ہوتاہے،دستار فضیلت باندھتاہے،اور اسی طرح وانی سے سقراط و بقراط،ارسطو،جالینوس اور بوعلی سینا پر گفتگو کرسکتاہے جس طرح ایک آکسفورڈ کا طالب علم کرتاہے،ایک تعلیم یافتہ مسلمان فلسفہ،ادبیات،اور دوسرے علوم وفنون پر قابلیت سے گفتگو کرسکتاہے،اور علی العموم ان مضامین پر گفتگو کرنے اور موجودہ زمانہ میں جو ان تبدیلیاں ہوئی ہیں انہیں سمجھنے کا بہت خواہشمند ہوتاہے۔"[2]

زعماء مدارس کا مقصد تاسیس

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ،مولانا محمد علی مونگیریؒ اور علامہ شبلی نعمانیؒ کے سامنے مدارس کی تاسیس کے وقت جو مقاصد پیش نظر تھے اور جس نظام کے وہ داعی تھے، آج کے دینی مدارس ان سے بہت دور جاچکے ہیں،انہوں نے جس نظام کو رائج کیا وہ وحی الٰہی نہ تھا،اپنے عہد میں خوب سے خوب تر کی تلاش تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ایسی مسلم نسل کی پرورش کی جائے اور ایسے علماء تیار کیے جائیں جو زمانے کے چیلنج کا جواب دے سکیں اور ملت کو صحیح قیادت فراہم کرسکیں،ان کا فہم دین راسخ ہو،اور ان میں داعیانہ صفات بھی موجود ہوں،وہ زمانہ کی نبض کو پہنچاسکتے ہوں اور اپنے عوام کے سامنے اسلام کے پرزور ترجمان ہوں جو ذہن و دماغ کی آسودگی اور اطمینان کا سامان کرسکتے ہیں اور ان کی ترجمانی سے یہ تاثر ہر گز نہ پیدا ہوتا ہوں کہ اسلام موجودہ دور کی رہنمائی نہیں کرسکتا،بلکہ نئی نسل کو اس ترجمانی سے یہ یقین حاصل ہو کہ دینی نظام ہی دنیا کی راہ نجات ہے،اور اسی سے ہمارے تمام سماجی ،معاشرتی،سیاسی اور اقتصادی مسائل حل ہوسکتے ہیں۔[3]

1۔ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ص98

2۔پاک وہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت،ص293

3۔ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ص120

قافلہ علمی سے بچھڑنا

برصغیر میں انگریزوں کی آمد و غلبہ کے نتیجہ میں دو اسباب کی وجہ سے مسلمانوں کا نصاب تعلیم کمزوری و ناکامی سے دوچار ہوا۔ اول یہ کہ مسلمانوں سیاسی زوال اور اس کے سبب ذہنی و عقلی اور فکری انحطاط و پست ہمتی اور دین و دنیا کی محدود تشریح و تعبیر ٹھہرا تو دوئم امر یہ ہوا کہ انگریز نے بڑی عیاری و چالاکی سے مسلمانوں کو ان علوم سے دور رکھنے کی کوشش کی جو ترقی کی راہ میں معاون ثابت ہوں اور ان کے ذریعہ کائنات کو مسخر کیا جاسکتا ہو۔[1]

علماء و تعلیم یافتہ

تعلیم کو دو حصوں میں بادل ناخواستہ تقسیم کر دیا گیا ہے، دینی و عصری علوم، جس کی بنا پر دونوں کے الگ الگ تعلیمی مراکز بھی قائم کر لیے گئے ہیں، ہر ایک اپنے نصاب کو جامع اور صحیح تصور کرتا ہے جبکہ دوسرے کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے، اسی وجہ سے معاشرہ میں تعلیم یافتہ اور علماء کی الگ حیثیت مختص کر دی گئی ہے اور معاشرہ متحیر ہے کہ اصل میں اس کی زمامِ رہنمائی کس نے سنبھالنی ہے جبکہ علماء کی جانب سے بے دین و ملحد اور فسق و فجور کے لقب سے دنیوی علوم کے فضلا کو پکارا جاتا ہے جبکہ دوسری جانب تاریک خیال، ناواقفیت و ابلہی پن کا طعنہ علماء کو تعلیم یافتہ طبقہ کی جانب سے دیا جاتا ہے جس کی بدولت مسٹر و ملا میں دوری روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ اسی بناپر چالیس پچاس سال سے ایک دوسرے سے دونوں طبقوں کو دور ہو چکے ہیں۔[2]

اسلامی علوم کی تدوین میں حکمت

اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کی حفاظت کا ذمہ خود اٹھایا ہے تو اس کا بدیہی تقاضا ہے کہ رب تعالیٰ قرآن کریم اور اس کے متعلق تمام علوم کی حفاظت کا بھی انتظام فرمادے چنانچہ تدوین حدیث ہو یا تدوین فقہ یا پھر مرور زمانہ کے ساتھ اسلامی معاشرے کو درپیش چیلنجز ان سب کے سدباب کا غیبی انتظام اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ تدوین حدیث کا آغاز یوں تو عہد نبوی و عہد صحابہ میں ہی ہو گیا تھا اور عہد تابعین میں بھی اس پر وقیع کام ہوا ہے، البتہ باضابطہ طور پر اس میں جو تاخیر ہوئی تدوین حدیث میں تو اس میں حکمت الٰہی کو بڑا دخل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حدیث کی حفاظت کا انتظام ترکستان و خراسان کے ذہین و بیدار اور مضبوط حافظہ کے حامل لوگوں سے کرایا، امام بخاریؒ کا امتحان اہل بغداد نے لیا تو انہوں نے ایک ہی مجلس میں سو احادیث جن کے متن و سند کو خلط ملط کر دیا گیا تھا کو درست کر کے پیش کر کے وہاں سے سرخرو ہوئے۔[3]۔ اسی طرح علم حدیث کی پرکھ و سمجھ کے لئے علم اسماء الرجال، فن روایت وغیرہ پر زیرک کام کا اہتمام بھی اہل علم نے کیا تو اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی طرح علم حدیث کی حفاظت کا انتظام کیا۔[4]

1۔ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟، ص102

2۔ پاک وہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ص237-238

3۔ تاریخ دعوت و عزیمت، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلامی کراچی، جلد1، ص78

4۔ حدیث کا بنیادی کردار، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، ص24-25

فقہ کی تدوین میں بھی ائمہ اربعہ اور ان کے مایہ ناز خلفاء شاگردوں کا باریک بین کام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے کسی قانون سازی و زندگی کے مسائل کو سلجھانے کی اس طرح کوشش نہیں ہوئی جس طرح ائمہ اربعہ کے تلامذہ نے جدوجہد و محنت کی۔ یونانی فلسفہ کی آمد کے سبب مسلم معاشرہ میں جو بے چینی الحاد و بداعتقادی کی صورت میں پیدا ہوئی اس کے سدباب کا انتظام بھی اللہ تعالیٰ نے امام ابوالحسن اشعری، امام ابو منصور ماتریدی، امام غزالی، شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کے ذریعہ سے لیا۔[1]

مدارس کا فیض

دینی مدارس اور ان کے متعلقین علماء وصوفیا کی ایک روشن تاریخ ہے کہ انہوں نے برصغیر میں اسلام و مسلمانوں کی بے مثال خدمت کی ہے اور دینی مدارس کا نصاب تعلیم اس قدر جامع تھا کہ انہوں نے قاضی، وزراء اور محتسب، اور امور سلطنت کی باگ ڈور سنبھالنے والے افراد کو تیار کیا اور اس کے ساتھ قرب وجوار کے ممالک میں مروج جدید طرق تعلیم اور علوم وفنون کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا اور بحیثیت مسلمان انسانی معاشرہ کی ضرورت کی تکمیل کا انتظام دینی مدارس نے کیا۔ خود ہندوستانی علماء کی علمیت کا اس قدر شہرہ ہوا کہ عرب ملکوں کے علماء بھی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ اہل مدارس نے مسلم معاشرہ کی تکلیف کو اپنے لئے سوہان روح بنایا کہ محمد تغلق کی وفات کے بعد فیروز تغلق حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے اصرار پر زمام اقتدار سنبھالنے پر تیار ہوا اور مسلمانوں کی حکومت کی زبوں حالی کے ایام میں امام شاہ ولی اللہ دہلوی نے سیاسی و اقتصادی گتھیوں کو سلجھانے کی سعی کی مرہٹوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی سے مدد بھی طلب کی۔ انگریز کے غلبہ ہندوستان کے بعد مسلمانوں نے اسلام اور تعلیمات کی حفاظت کی خاطر دینی مدارس کے قیام کا فیصلہ کیا اسی سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء وغیرہ اس لئے قائم کیے گئے کہ انگریز منظم انداز سے اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن پر حملہ آور ہوا اور علماء نے مسلم معاشرہ کے ایمان و ایقان کی حفاظت کا عزم مصمم کرتے ہوئے دینی مدارس کا ملک کے طول عرض میں جال بچھا دیا جس کے سلسلہ تادم زیست جاری ہے۔[2]

1۔ یورپ، امریکہ اور اسرائیل ایک اظہار حقیقت، انکشاف اور تنبیہ، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، پاکستان، ص16-17

2۔ مدارس اسلامیہ، ص117 تا119

فصل دوم

دینی مدارس کے نصابِ تعلیم کے بارے میں سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل دوم

دینی مدارس کے نصابِ تعلیم کے بارے میں سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

دینی مدارس میں جاری درس نظامی نصاب تعلیم کا ذکر مندرجہ بالا فصل میں ہو چکا ہے تاہم اب ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں ترجیحات وعدم ترجیحات کا ذکر بھی کیا جائے کہ نصاب تعلیم میں کون سے علوم کو اولیت دی گئی اور کن سے بے رخی کا معاملہ روا رکھا گیا ہے۔ اگرچہ زمان ومکان کی ضروریات ایسا کرنے کا داعیہ پیش کیوں نہ کرتے ہوں۔ ذیل میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے افکار کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

مدارس عربیہ کے نصاب کا صحیح مفہوم

جس نصاب کی تعلیم کے لئے مدارس قائم کیے جاتے ہیں سب سے پہلے اس کے مفہوم کے تعین کی ضرورت ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں کہ

"یہ وہ علمی وکتابی وسیلہ ہے جو اسلام سے گہری اور براہ راست واقفیت اور اسلام کے مستند علمی اور تاریخی ماضی سے ربط پیدا کرتا ہے اور ایسے اشخاص کے پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے جو مسلمانوں کی مکمل رہنمائی کے اہل ہو سکتے ہیں۔"

دینی مدارس میں ان علوم وفنون کو جگہ نہیں دی جاسکتی جو روبہ زوال یا پھر کسی گروہی وقومی کوشش کا ثمرہ ہوں۔ دراصل مدارس عربیہ کے استمرار وبقاء کے لئے اہل اسلام سے امداد حاصل کی جاتی ہے اور یہ مسلم معاشرہ پر ضروری ہے کہ وہ مدارس کو معاشرہ میں فعال رہنے کے لئے ہر ممکن معاونت کرے۔ مگر ایسے میں یونانی وایرانی علوم یا فرسودہ فانی تصورات کو مدارس میں جگہ دینے کی کوشش کی راہ ہموار کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "فاما الزبد فیذھب جفاء واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض"[1]

علماء اسلام کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن وسنت کو اپنا اول وآخر مرجع بنائیں اور دینی مدارس کے طریقہ تعلیم میں اصلاح، زمانہ کے تقاضوں کی موافق نصاب کی تیاری، کتب کی تصنیف وتالیف، عربی زبان کی زندہ وجاوید تعلیم کا انتظام، اور بہت اچھا ہو گا کہ ہندوستان کے دینی مدارس میں نصاب ونظام تعلیم ایک ہی باہمی اتفاق سے رائج کیا جائے۔[2]

نصاب تعلیم کا دائرہ عمل

دینی مدارس کے نصاب تعلیم کا ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ یہ نصاب اپنی جمیع خوبیوں اور ممیزات کے باوجود انسان کی ضروریات کی تکمیل نہیں کرتا اور اس حقیقت سے کوئی منصف مزاج انکار نہیں کر سکتا، درست بات تو یہ بھی ہے کہ ہمارے نصاب نے اس بات کا دعویٰ بھی نہیں کیا کہ وہ انسانی ضروریات کی تکمیل کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی استعداد رکھتا ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ نصاب تعلیم اس بات کا ضامن ضرور ہے کہ وہ انسان کی قدم

1۔سورت الرعد۔17/13

2۔ مدارس اسلامیہ، ص36-37

قدم پر رہنمائی و قیادت کر سکے اور انسان اس نصاب کی روشنی میں کنایوں سے نتائج اخذ کر پائے۔ تاہم قدیم نصاب تعلیم یا موجودہ نصاب تعلیم نے اس بات کا کوئی وعدہ و دعویٰ نہیں کیا کہ وہ انسان کی ضروریات کی تکمیل کرے گا۔ہاں یہ ضرور ہے کہ نصاب تعلیم انسان میں ملکہ و مہارت ضرور پیدا کر سکتا ہے لیکن اس کا بھی داعی نہیں۔ عصر حاضر میں مغرب و مشرق کے سبھی ماہر تعلیم حیران و سرگردان ہیں کہ نصاب تعلیم کے علاوہ کس بات کو طلبہ پر لازم کر دیا جائے کہ ان کا ربط و تعلق معاشرہ و سماج اور اس کی ضروریات و تقاضوں سے بہتر انداز میں نبرد آزما ہونے کی قوت و استعداد پیدا کر دے۔[1]

نصاب تعلیم کے تغیرات

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے دارالعلوم دیوبند مارچ 1954ء میں ایک موقع پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

> "خود آپ کا نصاب تعلیم اس حقیقت کا گواہ ہے کہ علماء اسلام نے کسی ضرورت کے تسلیم کرنے اور کسی مفید و ناگزیر چیز کو قبول کرنے میں کبھی پس و پیش سے کام نہیں کیا، یہ نصاب عہد بہ عہد تبدیلیوں اور مختلف علمی و عقلی رجحانات کا نمائندہ ہے ،اس نصاب میں ہر دور میں اضافہ و ترمیم ہوتی رہی ہے، صرف یہ سو برس کا زمانہ ایسا ہے جس میں اس نصاب میں کم سے کم تبدیلی ہوئی حالانکہ یہ ہی زمانہ اپنی سیاسی و ذہنی تبدیلیوں کی بنا پر جائز و ضروری تبدیلیوں کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔"[2]

علوم اسلامی کا زوال اور علماء کا فکری اضمحلال

مسلمان ممالک کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ فکری و نظریاتی طور پر مغرب و مستشرقین کے اسیر ہو چکے ہیں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم انہی کی نگرانی میں حاصل کی چنانچہ مغرب اور مستشرقین کی پوری کوشش اس امر پر مرکوز ہے کہ وہ اسلام کو ماضی کے اوراق میں لپیٹ کر مسلم نوجوانوں کو یہ یقین دلا دے کہ اب عہد حاضر میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا عبث و بے فائدہ ہے۔ اس سوچ و فکر کی نفی کے لئے مرکزی کردار دینی مدارس نے ادا کرنا ہوتا ہے کہ وہ اپنی نسل نو کی فکری و نظریاتی حفاظت کا انتظام کرے ،بدقسمتی ہے یا کچھ اور کہ علوم اسلامیہ کا قدیم نصاب تعلیم وقت و حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ برابر تبدیل ہوتا رہے اس میں افادیت و صالحیت کو پیش نظر رکھا جاتا تھا اور ماضی میں انقلابات بہت کم اور دیر سے وقوع پذیر ہوتے تھے کہ حکومت ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہوتی تھی یا ایک گروہ سے دوسرے گروہ میں مگر اب انیسویں صدی سے انقلابات کی تیز ترین لہر اٹھ چکی ہے کہ یہ اشخاص و حکمرانوں کے انقلاب کی بجائے فکر و نظریہ اور تہذیبی انقلابات بپا ہیں جن سے نمبرد آزما ہونا مسلم علماء کرام کا کام تھا اور ہے مگر اب مدارس کا نصاب تعلیم مخصوص کتب و مضامین اور طرز تعلیم پر آکر ٹھہر گیا ہے جس کی بدولت اب مسلم نونہالوں کے فکری طور پر منتشر اذہان کو راست روی پر گامزن کرنے کا کام مفقود ہو چکا ہے۔ علماء کرام کا فریضہ ہے کہ وہ اجتہاد کے ذریعہ سے انسانیات کی رہنمائی کریں۔ بقول ڈاکٹر مصطفیٰ الزرقاء (استاد فقہ اسلامی جامعہ عمان و سابق وزیر قانون حکومت شام) "علماء کے نزدیک اس دروازہ کو کھولنا تو (شرعاً) ممنوع نہیں تھا، مگر جس کنجی سے وہ کھل سکتا تھا وہ عرصہ سے گم شدہ تھی"۔ اسلامی علوم، معارف قرآنی اور شریعت اسلامی کے لئے طاقتور، مؤثر، خوبصورت تشریح و تعبیر اور اس کے لئے زبان و ادب کے جدید اسالیب وغیرہ کی جو ضرورت ہیں وہ نایاب نہیں تو کمیاب

1۔ پاجا سراغ زندگی، 67-68

2۔ پاجا سراغ زندگی، ص117

ضرور ہو چکی ہے۔ ایسے علماء جن کی ضرورت ہے وہ بہت کم تعداد میں پائے جاتے ہیں کہ وہ دینی حقائق کی ابدیت، زندگی کی صلاحیت اور اسلام کی برتری کا نقش جدید قلوب واذہان پر قائم کر پائیں اور اپنی علمی تنقیدوں اور ماہرانہ تحلیل وتجزیہ سے تہذیب جدید کے طلسم کو توڑ پائیں۔[1]

مولانا عبد الحق کی قدیم نصاب پر تنقید

مولانا عبد الحق صاحب لکھتے ہیں کہ

"فن تاریخ وجغرافیہ کو ہمارے بڑے قابل علماء جو جعل مولف اور جعل بسیط کی موشگافی میں شیخ بو علی کے کان کاٹنے کو تیار ہیں، محض بیکار سمجھتے ہیں، جس کا نتیجہ قرآن واحادیث اور فقہ پڑھاتے وقت ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ فرعون اور اس کی قوم قلزم میں غرق ہوئی تھی، یا رود نیل میں اور مصر قلزم سے کس طرف واقع ہے اور رود نیل کس طرف ، اور نہ وہ کتاب الجزیہ پڑھتے وقت حدود عرب کو سمجھ سکتے ہیں، فن تاریخ سے بھی بے خبر ہیں، اسی طرح فن ادب سے ناآشنائی ان کو قرآن وحدیث کے غوامض اور اسرار بلاغت نہیں سمجھنے دیتی اور نہ ان کو خود اس قدر استعداد ہوتی ہے کہ وہ قلم برداشتہ کچھ لکھ سکیں، اسی طرح ریاضیات کے فنون سے بھی بے بہرہ ہوتے ہیں، ادیان منسوخہ سے بھی محض ناآشنا ہوتے ہیں، انہیں نہیں معلوم کہ توریت موجودہ کیا ہے، اور انجیل کیا ہے اسی طرح باوجود یہ کہ ہندوستان کے رہنے والے ہیں ہنود کے مذہب سے محض ناآشنا۔"[2]

علمی موضوعات اور علمی محاسبہ

عصر حاضر میں مغرب کی آشیر باد کے سبب مستشرقین نے اس قدر وقیع کام کیا ہے مسلمانوں کے بہت سے اہم ماخذ انہی کی کوششوں سے منصہ شہود پر آئے جن میں طبقات ابن سعد، تاریخ طبری، تاریخ کامل ابن اثیر، انساب سمعانی، فتوح البلدان بلاذری، کتاب الہند للبیرونی وغیرہ کی سب سے پہلے اشاعت یورپ میں پھر مصر میں اشاعت ہوئی۔ مستشرقین کا قلم دوران کتابت انتہائی محتاط انداز سے چلتا ہے کہ وہ قاری کو اپنا اسیر بنالینے کے بعد مختصر جملہ سے اس کے ایمان کو چھیڑتا ہے کہ متوسط درجہ کے مسلمان کا اس فتنہ سے بچ نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مستشرقین کی علمی و تحقیقی اہمیت اس قدر بڑھ چکی ہے کہ بہت بڑے بڑے مسلمان علماء اور خالص مسلم علمی ادارے بھی ان کی رکنیت کے بغیر نہیں پیش قدمی کر رہے جیسے مصر کے احمد امین، احمد زیات، المجمع اللغوی مصر، المجمع العلمی العربی شام اور المجمع اللغوی بغداد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسی پر بس نہیں مسلم ممالک کی خالص دینی جامعات میں اسلامی وعربی موضوعات پر مستشرقین کے قلم سے نکلی ہوئی کتب کو مرکزی طور پر شامل نصاب کیا گیا ہے۔ مثلاً تاریخ عرب واسلام ڈاکٹر ی ہٹی، تاریخ ادبیات اسلامیہ بروکلمان، تاریخ ادبیات نکلسن اور دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے متعدد ایڈیشن امریکہ ویورپ سے نکل چکے ہیں جس میں بہت کم مسلم مقالہ نگار شامل ہیں مگر اسی کو بنیاد بنا کر مصر وپاکستان میں اسلامی علوم سے متعلق مواد کو اردو وعربی میں ترجمہ کیا جارہا ہے۔ اس کے تدارک کے لئے ضروری ہے کہ مسلم علماء ومفکرین اپنے قلم کو جنبش دیں اور اسلامی علوم وفنون کی تدوین کا بار گراں اپنے کاندھوں پر اٹھانے کی سعی مسلسل کریں تا کہ مسلم نوجوان اور دنیا کو اسلام کا حقیقی وغیر محرف چہرہ بالکل روح اسلام کے ساتھ دکھایا جاسکے اور دوسرا فریضہ یہ بھی علماء کو

1۔ اسلامیت ومغربیت کی کشمکش، ص269-270

2۔ مضامین ثلاثہ، ص28 بحوالہ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ ص151

ادا کرنا ہو گا کہ وہ مستشرقین کے قلم سے نکلنے والی کتب جو مسلم نوجوان کو فکری و نظریاتی طور پر مرتد بنانے کا موجب بنتی ہیں ان کا علمی محاسبہ تحقیق کے ساتھ کریں اور ان میں موجود تنقیحات کو عیاں اور ان کے غلط ماخذ و غلط استدال کو مدلل و محقق انداز میں پیش کریں۔ اس کے بغیر نسل نو کے ایمان و ایقان کی حفاظت کا فریضہ لابد ادا نہیں ہو سکتا۔[1]

فقہ اور قانون

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ نصاب و نظام تعلیم سے متعلق بات کرنے سے پیشتر زمان و مکان کا لحاظ و پاس رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی طور پر جب مسلمان برصغیر قیادت و منصب ریاست پر فائز تھے۔ جس بنا پر ان کو ریاستی امور کی انجام دہی کے لئے آئین و قانون سمجھنے سمجھانے کی ضرورت کا سامنا تھا بنابریں اس وقت کے نصاب تعلیم میں علم فقہ کی اہم کتب کو غیر معمولی اہمیت دی گئی اور اس کے بعد فقہ کو سمجھنے کے لئے اصول فقہ کا فن بھی ایجاد ہوا۔ اصول فقہ کا ایران اور اس کے قرب و جوار میں بڑا گہرا اثر قائم ہوا۔ علامہ وجیہ الدین گجراتی، مولانا عبداللہ اور مولانا عزیز اللہ ملتانی ایران گے اور وہاں کے علماء سے حکمت کی تعلیم حاصل کر کے آئے اور اسی زمانہ میں امیر فتح اللہ شیرازی اور حکیم علی گیلانی ایران سے تو ان کا گہرا علماء ہندوستان پر پڑا جس کے سبب جب نصاب درس ملا نظام الدین سہالوی نے تیار کیا تو اس میں امیر فتح اللہ شیرازی کے ایرانی و فکری اور ادبی اثرات جابجا غالب نظر آتا ہے۔[2]

قانون اسلامی کی تدوین جدید

اگرچہ عالم اسلام میں ایسے علماء موجود ہیں کہ ان کی کوششوں سے بہت بڑا طبقہ مسلم مرتد ہونے سے محفوظ ہوا ہے جیسے استاد مصطفیٰ زرقاء کی کتاب المدخل الفقھی العام، ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی کی کتاب الاحوال الشخصیہ اور شیخ محمد ابوزہرہ کے بعض فقہ کے موضوع پر مضامین وغیرہ۔ تاہم یہ کوشش ناکافی ہے کہ عصر حاضر میں نوجوانوں کو مغرب و استشراق کی بھٹی سے محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ فقہ و قانون اسلامی کو ایک جدید لباس میں پیش کیا جائے اور اسلامی علوم کی حقیقت کو ثابت کرنے کا امتیازی کام ہو سکے اور فقہ جو کہ ترقی پذیر اور وسیع قانون ہے میں جمود و تعطل کو درآنے کی اجازت ہرگز نہ دی جائے بلکہ وقت و حالات کی ضروریات کی انجام دہی کے طرق کو قرآن و سنت کے بیان کردہ اصولوں کی رہنمائی میں نئی جزیات کے استنباط و استدلال کا عمل شروع کیا جائے۔ اسی وحید ذریعہ سے اسلامی معاشرہ ذہنی و معاشرتی ارتداد سے محفوظ ہو سکتا ہے۔[3]

علامہ اقبالؒ نے اسی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص زمانہ حال کے جورس پروڈنس (اصول قانون) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہو گا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہو گا، قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یا قوانین اسلامیہ پر غور کر رہے ہیں، غرض یہ وقت عملی کام کا ہے، کیونکہ میری

1۔ اسلامیت و مغربیت کی کشمکش، ص255-269

2۔ نظام تعلیم، ص86-87

3۔ اسلامیت و مغربیت کی کشمکش، ص270-271

رائے ناقص میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانہ کی کسوٹی پر کسا جارہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا"۔[1]

فقہ پر خصوصی توجہ

دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں شرعی علوم کے تین اہم مضامین کی تعلیم ہر دور کے نصاب تعلیم میں لازم رہی علم تفسیر، علم حدیث اور علم فقہ۔ موجودہ دور میں دیگر معاون علوم شرعی کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ علم تفسیر، علم حدیث اور علم فقہہ پر خصوصی توجہ اور اس میں عبور حاصل کیا جائے۔ فقہ کے علم کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ مدرسے کا فیض یافتہ جہاں بھی اور جس جگہ بھی بیٹھے گا تو معاشرہ اس کی طرف اپنی نظریں ملتفت کرکے روزمرہ کی زندگی کو شریعت کے مطابق بسر کرنے کے لئے استفسارات کرینگے یعنی طہارت، نماز، زکوۃ اور میراث، نکاح وطلاق، عہد جدید میں کاروباری مسائل وغیرہ جاننے کی کوشش و سعی کرینگے۔ اور بدقسمتی ہے کہ آج کل دینی مدارس کے فضلا علم فقہ سے غافل ہو چکے ہیں۔ ایسے میں لازم ہے کہ سماج میں سب سے زیادہ ضرورت کا احساس دلانے والے اس علم یعنی علم فقہ کی معرفت یکسوئی سے حاصل کرکے معاشرے کی درست رہنمائی کا انتظام کیا جائے۔[2]

علوم قرآن میں مہارت

دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں علوم قرآن کو اس طور پر تعلیم دینے کی ضرورت ہے کہ وہ صرف کتابی علم معلوم نہ ہو بلکہ وہ زندہ و جاوید علم معلوم ہو اور اس کو عملی طور پر زندگی پر نافذ کرنے کا جذبہ بیدار ہونا چاہئے، یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کا معاشرہ انسانی جس تکلیف و اذیت سے دوچار ہے اس کی بنیادی وجہ ہی یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کے اظہر من الشمس معجزوں کی طرف سے روگردانی اختیار کرلی ہے جبکہ یہ حقیقت بین ہے کہ دنیا و آخرت کی زندگی کی دائمی نصرت و فلاح قرآن کریم کے علوم سے وابستگی اور قرآنی احکامات پر عمل کرنے میں مضمر ہے۔ دینی مدارس میں ایسے اساتذہ کی شدید ضرورت ہے کہ وہ طلبہ کو قرآن کی تعلیم کتابی علم کی بجائے زندہ و جاوید علم کے طور پر دینے کا انتظام کریں اور ان کی عملی قرآنی احکامات کی عملی تفسیر معلوم ہو۔[3]

علم حدیث کا اختصاص

موجودہ دور میں دینی مدارس میں جس علم کی طرف التفات کم ہو رہا ہے وہ علم حدیث ہے کہ ایک زمانہ تھا کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی و شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شیخ عبدالعزیز محدث دہلوی نے عرب ممالک سے علم حدیث حاصل کرکے برصغیر میں اس علم کی تعلیم و تعلم کو چار چاند لگادیئے تھے۔ اب اس علم کی تعلیم میں زوال آرہا ہے کہ ماہر علم حدیث کمیاب ہوتے جارہے ہیں ایسے میں لازم ہے کہ دینی مدارس میں علم حدیث کی تعلیم اس طور پر دینے کا انتظام کیا جائے ماہر معلم تیار ہو سکیں اور اساتذہ و طلبہ کو بھی اس بات کا پابند ہونا چاہئے کہ وہ سبق پڑھنے سے پیشتر اور

1۔ اقبال نامہ، حصہ اول، ص50-51

2۔ طالبان علوم نبوت، ص152-153

3۔ طالبان علوم نبوت، ص153

بعد از درس مطالعہ و تکرار کا اہتمام کریں اور علم حدیث کو منتقل کرنے والوں کے احوال کو بھی جاننے اور یاد کرنے کی کوشش کریں،اس کے ساتھ مشتقات علم حدیث علم الرجال وعلم جرح وتعدیل اور علم مصطلح الحدیث وغیرہ پر بھی دسترس حاصل کریں۔[1]

صرف ونحو میں رسوخ

دینی مدارس کا نصاب تعلیم طلبہ میں صرف ونحو جو علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ضروری علم ہیں پر کامل گرفت کی صلاحیت پیدا کرنی چاہیے تاکہ طلبہ کسی بھی عالم یا اہل علم کے سامنے بآسانی عبارت درست پڑھنے کی بجائے صرف ونحو کی توجیہات اور تصحیحات کی باریکیوں اور نزاکتوں پر مکمل عبور رکھتے ہوں۔ موجودہ دور میں استعداد علمی کی کمی ہے اس کے ازالہ کے لئے ضروری ہے کہ ابتدائی تعلیم میں محنت ولگن اور شوق سے علوم میں دسترس حاصل کرنے کے لئے بہترین مشق وتمرین کی جائے۔[2]

عربی زبان پر توجہ کی ضرورت

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی یہ شان مقرر کی جاچکی ہے کہ یہاں پر عربیت پر زور دیا جاتا ہے اور یہاں کے فضلا عربی تکلم وکتابت کے ماہر ہیں اس کا مقصد صرف عربی زبان دانی حاصل کرنا نہیں بلکہ علم تفسیر، علم حدیث اور علم تفسیر و دیگر علوم وفنون کے مصادر اساسی سے اخذ کرنے کا وحید ذریعہ عربی ہے اس لئے دینی مدارس کے نصاب میں عربی زبان کو غیر معمولی اہمیت دینا ضروری ہے کہ اس کے بغیر علوم کی کامل معرفت حاصل ہی نہیں ہوسکتی اور موجودہ دور میں جس قدر شد ومد سے امریکہ ویورپ میں اہل عرب کے خلاف منصوبہ بندیاں ہورہی ہیں کہ ان کو اسلامی تعلیمات سے ناموس ودور کردیا جائے اس کا عشر عشیر بھی ہندوستان، پاکستان وایران کے خلاف منصوبہ بندی وصف بندی نہیں کی جارہی ایسے میں دینی مدارس کے طلبہ میں یہ صلاحیت ولیاقت پیدا کردینے کی حاجت ہے کہ وہ فساد وسازشوں کے اس عفریت میں اہل عرب کا ایمان اسلام اور اسلامی تعلیم پر استوار رکھنے کی تعلیم ودعوت کا فریضہ انجام تقریر وتحریر کے ذریعہ انجام دے سکیں۔[3]

دینی مدارس کا کام

مولانا سید اابوالحسن علی ندویؒ نے دینی مدارس کے فرائض منصبی کو بیان کرتے ہوئے لکھاہے کہ دینی مدارس کے کرنے کے تین کام ہیں۔ پہلا کام یہ ہے کہ وہ ایسا نصاب تعلیم وضع کریں کی جس کی بدولت انسان کا رشتہ علم کے ساتھ اس طور پر قائم ہوجائے کہ علم صاحب علم کو خالق کے ساتھ منسلک کردے اور وہ اس احساس کی بدولت علم کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی منشاء کے حصول اور پیغمبروں کے بیان کردہ تعلیمات پر اپنی عملی زندگی کو ڈھال کر بسر کرے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ موجودہ دور کا علم انسان کو وسائل تومہیا کردیتاہے مگر مقصد علم اور اس کے استعمال کے طریقہ کو واضح نہیں کرتا چنانچہ لندن یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کے صدر ڈاکٹر سی ایم گڈ کہتاہے کہ:

1۔ طالبان علوم نبوت، ص154

2۔ طالبان علوم نبوت، ص155

3۔ طالبان علوم نبوت، ص155-156

"طبعی علوم (فزکس و سائنس) نے ہم کو وہ طاقتیں بخش دی ہیں جو خدا کے لائق تھیں، لیکن ہم ان کو بچوں اور وحشی قوموں کی سطح کے دماغوں کے ساتھ ان کا استعمال کر رہے ہیں"[1]۔

معلوم یہ ہوا ہے کہ سائنس و علم کے حامل انسان سے دوسرا خوف زدہ ہو جاتا ہے کہ وہ علم بجائے فائدہ پہنچانے کے انسان کو دوسرے انسان کے نقصان پر آمادہ کرنے کا موجب بن رہا ہے۔ ایسے میں دینی مدارس کا یہ کام ہے کہ علم کے صحیح مقصد اور اس کی تکمیل کے وسائل کے درست استعمال کا جذبہ پیدا کرے۔ تیسرا امر یہ ہے کہ دینی مدارس ایسے افراد تیار کریں جو صرف صاحب علم نہ ہوں بلکہ وہ علوم و فنون کے ماہر بھی ہوں کہ دنیا ان کی جانب اپنی نظر کو ملتفت کر لے۔ دنیا میں تعلیم یافتہ افراد کی کمی نہیں ہے البتہ ماہر افراد نایاب ہیں۔ دینی مدارس کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو نان ونفقہ کے حصول کا ہنر سکھا دیں جو فی نفسہ غلط نہیں ہے، یہ صلاحیت تو دیگر مقامات سے بھی پیدا کی جاسکتی ہیں عربی مدارس کا اصل کام یہ ہے کہ وہ معاشرے کی ضروریات جو پروفیشنل لوگوں کے ذریعہ حل نہیں ہو سکتی بلکہ اکسپرٹس سے نظام زندگی چل رہا ہے اسی طور پر دینی مدارس کو اپنے یہاں علوم وفنون اسلامیہ کے ماہر اور اکسپرٹس تیار کرنے ہوں جو انسانی معاشرے کو لسانیات، ادب، صرف ونحو، عقلیات اور علوم دینی کے ماہر تیار کر کے دے سکیں۔[2]

مدارس کی اہمیت وضرورت

مہذب ومتمدن انسانی معاشرہ کی دو بنیادی ضرورتیں ہوتیں ہیں کہ وہاں پر ہسپتال اور تھانہ موجود ہونا چاہیے کہ انسان کی جسمانی صحت کی خرابی کی صورت میں اس کے علاج ومعالجہ کا انتظام ہو سکے اسی طرح معاشرہ کی ایک یہ بھی ضرورت ہے کہ اس میں تھانہ موجود ہو تاکہ انسان اپنی فطرتی طبع کی وجہ سے سرکش وغلطی کے راہ پر چل نکلے تو اس کی تادیب کا انتظام ہو پائے۔ تاہم ان دونوں ضرورتوں سے زیادہ اہم ترین ایک ضرورت بھی ہے وہ یہ ہے کہ معاشرہ میں دینی تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا جائے۔ بیماری وبرائی کو قابو کرنا آسان ہے مگر جس کی روح میں بگاڑ آگیا ہو اور وہ دین کی تعلیم سے بے بہرہ ہو چکا ہو کہ اس کو دنیا میں آنے کا مقصد ہی معلوم نہ ہو اور وہ حلال وحرام کی تمیز کیے بغیر زندگی بسر کرتا ہو تو ایسے میں اس کی دنیا و آخرت دونوں اس کے لئے نرگ بن جانے میں کوئی شک نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دینی تعلیم کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ "**یاایھاالذین آمنوا قوا انفسکم واھلیکم ناراً**، الخ" ترجمہ اے ایمان والو! بچاؤ اپنی جانوں کو اور اپنے گھر والوں کو ایسی آگ سے جس کا ایندھن آدمی وپتھر ہیں، اس پر مقرر ہیں تند خو فرشتے جو زبردست ہیں اور وہ نافرمانی نہیں کرتے اس سے جس کا ان کو حکم ہو۔[3] جہنم کی آگ سے بچنے کا ذریعہ یہی ہے کہ خود بھی دین کی سمجھ حاصل کی جائے اور اپنے اہل خانہ کو بھی دین کی تعلیم دی جائے جس کی بدولت اللہ کی معرفت حاصل ہو گی اور جائز و ناجائز، صحیح وغلط کا فرق واضح ہو گا، توحید وشرک کا فرق ظاہر ہو جائے گا۔ دین کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دینی تعلیم کے مراکز مساجد ومدارس قائم ہوں۔[4]

1۔ Guide to Modern Wickedness P.261

2۔ مدارس اسلامیہ، ص102 تا105

3۔ سورت التحریم، آیت6/66

4۔ مدارس اسلامیہ، 124 تا131

دینی مدارس میں دماغی و قلبی انحاط

دینی مدارس کے کردار کا زمانہ معترف رہاہے کہ زندگی کے جمیع نواحی کے سلسلہ میں رہبری کی صلاحیت اس کے فضلا میں پیدا ہوتی تھی کسی بھی طرح کی کہنگی و افسردگی کا شائبہ بھی محال تھا تاہم موجودہ دور میں ان انقلاب انگیز شخصیات کی جستجو عنقا ہو چکی ہے کہ حضرت خواجہ معین اجمیری اور سید علی ہمدانی جیسے بے نوالوگوں کی آواز پر ملک بھر کے باسیوں میں قلوب نور ایمان سے مزین ہو جایا کرتے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی نے مغلیہ سلطنت ک انحرافات پر ایسی روک لگائی کے اکبر کی سلطنت پر اور نگزیب عالمگیر جیسافقیہ بیٹھا، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے برصغیر کے طول و عرض پر اتنا گہرا اثر چھوڑا کہ ملک کا نظام فکر و نظام تعلیم ان کا ممنون ٹھہرا، مولانا قاسم نانوتوی نے انگریز کے غلبہ سے مایوسی و پسپائی میں ڈوبی ہوئی عوام کو امید کی رمق دیکھائی اور دارالعلوم دیوبند قائم کیا اور اسلامی علوم کو تازہ زندگی عنایت کی اور مولانا محمد الیاس دہلوی کی دعوتی تحریک نے انسانی معاشرے میں زبردست روح ایمانی پھونک دی کہ دنیا کا کوئی خطہ بھی اس سے محروم نظر آتا ہو، مگر افسوس ہے کہ آج کے مدارس کے فضلا اس روح ایمان اور یقین سے تہی دامن ہی نہیں ہو چکے بلکہ وہ احساس کہتری و تقلید کے حامل بن چکے ہیں۔[1]

مدارس کی افسردہ فضا

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ دینی مدارس نے موجودہ دور میں بڑی تیزی سے ترقی کی ہے کہ نصاب و نظام تعلیم میں تبدیلیاں واقع ہونے کے ساتھ طلبہ کا ان کی طرف بہت بڑی تعداد میں التفات بھی ہے مگر قضیہ یہ ہے کہ مدارس کے اندر کی زندگی کا دھارہ سست پڑ چکا ہے کہ ان کے دل دھڑکن سے عاری اور احساس ذمہ داری و درمندی سے خالی نظر آتے ہیں، اسی لیے شاعر نے کہاہے کہ:

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کردے — کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو — کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

دینی مدارس میں ایک یہ بھی مرض طلبہ مغربی تعلیمی اداروں کی نقالی کرنے کے متمنی نظر آتے ہیں اور وہ دینی تعلیم کو کہنہ پسند و فرسودہ سمجھنے لگے ہیں جبکہ حقیقت میں انہی کو زمانے کا محتسب، امام اور صاحب ایمان و دعوت بننا تھا کہ دنیا کو بتاتے تمہارے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ بھی نہیں اگر دین کی محبت اور جستجو نہیں۔ اسی کو شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

کر سکتے تھے جو اپنے زمانہ کی امامت — وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

گویا موجودہ دور میں دیکھا دیکھی کو دل سے قبول کر بیٹھے ہیں اور لادینی درسگاہوں کے مقلد و متبع بن بیٹھے ہیں جو کسی بھی لحاظ سے مسلم معاشرہ کے بقاواستمرار کے لئے سم قاتل سے کم نہیں۔[2]

عصر حاضر کا چیلنج

1۔ پاجاسراغ زندگی، ص100
2۔ پاجاسراغ زندگی، ص101-102

مسلمانوں کی تاریخ میں دو مشکل دور آئے ہیں اول صلیبی حملہ جس میں بیت المقدس کو مسخر کرنے کے ساتھ بیت اللہ پر قبضہ حاصل کرنے کی عیسائیوں نے دلجمعی سے ے کوشش کی اور اس کو اللہ کی توفیق سے سلطان صلاح الدین نے ناکام بنادیا اور دوسری تاتاریوں کی یورش جس کے نشانہ پر عراق و ایران اور ترکمانستان بنے تھے اور ان وحشی قوم کا دیوانہ وار مقابلہ مصر کے جنرل الظاہر بیبرس نے اور اہل دعوت نے کمال مہارت سے کیا۔ تاہم عصر حاضر کا چیلنج زیادہ خطرناک اس لئے ہے کہ ماضی کے مصائب کے پیچھے کو منظم داعیہ و سبب کارفرما نہیں تھا اور نہ ہی مستقبل کا کوئی ان کے پاس پلان تھا البتہ موجودہ اسلامی تہذیب پر جو یلغار ہے وہ مکمل منصوبہ بدنی کے ساتھ اسرائیل سے کی جارہی ہے ے جس میں یہودی و عیسائی باہم متحد ہو کر سیاسی و معاشی اور صحافتی ذرائع کو استعمال کرکے مسلمانوں اور مسلم ممالک کے حکمرانوں کو اس پیغام کو جاگزیں کرنے میں مصروف عمل ہیں کہ اسلام کا ماضی یقیناً شاندار و قابل فخر ہے مگر عصر حاضر کے جدید تقاضوں کے ساتھ اس کا چلنا ناممکن ہے، اسلام نے دختر کشی کا خاتمہ کیا، علم کی خدمت کی یہ سب درست ہے مگر موجودہ دورہ کا اسلام ساتھ نہیں دے سکتا ہے اس لئے اس کو عملی زندگی سے خارج کر دیا جائے۔ اور معاشرہ و ریاست سیکولرزم کو قبول کرلے۔ یہ زہر بہت زیادہ خطرناک ہے لہذا اہل مدارس کی اس باب میں خدمت کی اشد ضرورت ہے کہ وہ عربی و انگریزی زبان میں کمال مہارت حاصل کرنے کے ساتھ جدید علوم و فنون میں درک حاصل کرکے عصر کے چیلنج سے اسلام کے نبرد آزما ہونے کے ساتھ موجودہ انسانی زندگی کو پر سکون و پر راحت بنانے کا واحد راستہ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے میں مضمر ہے کو ثابت کرنے کی محنت کریں۔[1]

اصل مسئلہ محنت کا ہے

نصاب تعلیم میں اصلاح و ترمیم کی ہر قلب سلیم تقاضا کرتا ہے کیونکہ وقت و زمانہ کی تیزی و سرعت کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دینی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم ان اصولوں پر قائم ہو کہ مسلم نوجوان وہ خود کو زندگی کے دھارے سے الگ سمجھنے یا اس کے پیچھے آنکھیں بند کرکے دوڑنے کو مقصد حیات نہ بنالے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قدیم نصاب تعلیم کے فضلا اس قدر عالی مرتبت ظاہر ہوئے کہ انہوں نے علوم و فنون اور دعوت دین کے میدان میں یگانگت و امتیازی مقام حاصل کیا ان میں سے بعض نام علامہ زبیدی، مولانا غلام علی بلگرامی، شیخ محسن بن یحیٰ ترہتی اور نواب صدیق حسن خان، مولانا صدالدین آزردہ اور مولانا مسعود عالم ندوی اور میں نے (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) ان ہی مدارس کے نصاب تعلیم سے استفادہ کیا اور عربی نثر کی کتب کی عدم دستیابی کے باوجود ماسوائے نفحتہ الیمن اور مقامات حریری کے پھر بھی علوم و فنون اور عربی ادب میں اپنا امتیاز پیدا کیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ نصاب تعلیم دینے والے اساتذہ ماہر علم و فن اور علم دوست و مخلص تھے اور طلبہ بھی جنہوں نے قدیم نصاب میں تعلیم حاصل کی وہ بھی عزم و ہمت کے پیکر اور جذبہ علم سے معمور اور محنت سے اپنے دل کو چور کر دیتے تھے جس کی بدولت ان کو ناموری نصیب ہوئی۔[2]

1۔ مدارس اسلامیہ، 109 تا 113

2۔ پاجا سراغ زندگی، ص 173-174

فصل سوم

دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں تبدیلی اور اس کی افادیت پر سید ابوالحسن ندوی کی فکر جائزہ

فصل سوم

دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں تبدیلی وافادیت پر سید ابوالحسن ندوی کی فکر جائزہ

دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں تبدیلی اور اس کی افادیت پر مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی فکر کو جاننے کی ضرورت مسلم ہے۔نصاب تعلیم میں تبدیلی اور اس کے فوائد کو جاننے کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ معلوم ہو سکے کہ اس باب میں جو سعی کرنے کا مطالبہ ہوتا ہے فی الحقیقت اس سے کس قدر مسلم معاشرہ کو فائدہ حاصل ہوگا اور کن کن تبدیلیوں کی فی الفور اور کن کن امور میں بتدریج تبدیلی لائی جانی چاہیے۔اسی امر کو واضح کرنے کے لئے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی فکر کو بیان کر کے اس کا جائزہ لیا جائے گا۔

اصلاح نصاب تعلیم

دینی مدارس کے داخلی فرائض میں اہم ترین امر نصاب تعلیم اور اس میں اصلاح وترمیم کا اہمیت کا حامل ہے۔اس سلسلہ میں پہلی پیش رفت تحریک ندوۃ العلماء کے آغاز کے بعد ہوا۔لیکن موجودہ دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں وہ جمودی کیفیت موجود نہیں ہے۔اب مدارس میں نصاب کے زمانہ ووقت کے ساتھ تبدیل کرنے کی بات کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔البتہ یہ بات ضرور ہے کہ نصاب میں وقت وحالات کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کو نافذ کرنے کا عمومی مزاج پیدا نہیں ہوا ہے۔یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ کہ نصاب میں ترمیم و تبدیلی جلد بازی اور وقتی مصلحت کی بنا پر کرنے کی بجائے ملت اسلامیہ کی اجتماعی ضروریات،علماء کے جماعتی فرائض،اسلام کی مخصوص تعلیم وثقافت اور ماضی کے ضروری علوم وفنون کو باقی رکھنا لازم ہے۔[1]

نصاب تعلیم بدلتا رہا

دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجتماع کی صدارت کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بیان کیا کہ ہمارے اسلاف ہم سے زیادہ حقیقت پسند اور دوراندیش تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے زمانہ میں سو سو سال میں نصاب تعلیم تبدیل ہوتا رہا اور انہوں نے معیار فضیلت کو وقت کی ضرورت کے مطابق تبدیل کیا ہے جیسے پہلے فقہ،پھر اصول فقہ اور پھر اصول حکمت بہت بعد علم حدیث کو فضیلت کا معیار کر درجہ بنایا گیا۔علم حدیث کو برصغیر میں متعارف کرانے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا اساسی کردار ہے۔تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے جب مسلمان قوت اور طاقت میں تھے تو انہوں نے نصاب تعلیم کو زمان ومکان کے مطابق ڈھالا مگر جب حکومت ہاتھ سے نکل گئی تو جمود کا شکار ہو گئے کہ اسلاف نے فلاں علم یا فلاں کتاب پڑھی اب بھی اسی کو پڑھنا ہوگا۔یہ مستحسن امر نہیں ہے کہ طلبہ اور معاشرہ کی ضروریات کو ایک طرف کر کے اسلاف کی پڑھی یا پڑھائی جانے والی کتاب کو تبدیل کرنا ناممکن بنا دیا جائے۔[2]

1۔مدارس اسلامیہ،ص34-35

2۔نظام تعلیم،ص90-92

نصاب تعلیم کا مسئلہ

نصاب تعلیم ایک اہم ترین مسئلہ ہے کہ مسلم نوجوانوں کو کیا اور کیوں پڑھایا جائے۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ جذباتیت اور عجلت میں کچھ کتابوں کو نصاب میں رکھنے اور کچھ کو خارج کرنے کا فیصلہ کر لیا جائے۔ در حقیقت نصاب تعلیم ایک ایسا اہم مسئلہ ہے جو انسانی زندگی کے ساتھ مرتبط ہے اور زمان و مکان کے اثرات کے تابع ہوتا ہے اور اس کی اہمیت اس لئے بھی دوچند ہے کہ یہ جسم میں روح کی مثل حیثیت و مقام انفرادیت رکھتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے حامل نصاب سماج کے علمی و فکری مطالعہ اور ذہن کی وسعت کا علم حاصل ہوتا ہے۔[1]

نصاب تعلیم پر ایرانی اثرات

ہندوستان میں جو درس نظامی رائج ہے یہ اس نصاب کی ترقیافتہ یا جدید شکل ہے اس کی جس کے بانی ملا نظام الدین سہالوی تھے۔ برصغیر میں جب نہ نصاب و نظام تعلیم متعارف کرایا گیا تو اس وقت سیاسی و عسکری طور پر حکومت و سیادت تو ترکی و افغانیوں کی تھی مگر علمی و فکری باگ ڈور ایرانیوں کے ہاتھ میں موجود تھی۔ ایرانیوں میں جہاں بہت سی خصوصیات اور صفات متمیزہ موجود تھیں ان میں دو اہم کمزوریاں بھی تھیں ایک یہ کہ بات کرنے اور سمجھنے میں ایجاز کی بجائے دقت پسندی اور دوسرا سوال کے جواب میں بے جا تنوع پیدا کرنا۔ گویا عرب قوم جو علمی و فکری طور پر بات کو انتہائی اختصار کے ساتھ سمجھ لیتے اور مختصر انداز میں سمجھا دیتے تھے ان کے برخلاف ایرانی قوم مزدک و مجوسیت کے سبھی ادوار کو دیکھا جائے تو وہ بات کی گہرائی کو تلاش کرنے میں طوالات سے کام لینے کے ساتھ بلاوجہ سوالات اور ان کے متعدد جوابات پیش کرنے میں مصروف رہتے گویا عجمیوں (ایرانیوں) کی سرشت میں افراط و تفریط اختیار کرنا داخل ہے۔[2]

حدیث سے بے رخی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ جن ممالک میں اسلام کی دعوت عرب قوم کے ذریعہ پہنچی وہاں پر علم حدیث کی خوب اشاعت ہوئی جب کہ جن علاقوں میں اسلام کی دعوت غیر عرب کے ذریعہ سے پہنچی وہاں پر حدیث کا تعارف بہت بعد میں ہوا۔ اس کی وجہ ہے کہ عرب فطری طور پر مبالغہ آمیزی و غلو سے دور تھے، ابن رشیق قیروانی کی کتاب "العمدۃ" میں ہے کہ کسی نے حضرت سعید بن المسیبؒ سے کہا کہ **"ان اناسا یکرھون انشاد الشعر فی المسجد"** تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ **"لقد نسکو نسکا عجمیا"** یہ لوگ عجمی زہد ہے۔ اس نسک عجمی کا تعلق عبادات ہی سے نہیں بلکہ نسک عجمی کا تعلق علوم سے بھی ہے، حقائق سے بھی، ترجمانی سے بھی، مقدار کی تعین سے بھی، کتنی چیز ہو اور کس مقدار ہو۔ اس سب میں عرب دماغ درست چلتا ہے جبکہ عجمی دماغ میں عدم تناسب کی طرف چلتا ہے۔ جیسے قرآن کہتا ہے **"کان امرہ فرطا"**[3] یعنی وہ افراط اور تفریط میں مبتلا ہو جاتا ہے۔[4]

1۔ نظام تعلیم، 81-82

2۔ نظام تعلیم، ص82-85

3۔ سورت الکہف، آیت۔ 28/18

4۔ نظام تعلیم، ص84

اسلامیات کی تعلیم پر توجہ کی ضرورت

اس میں شک وشبہ نہیں ہے کہ اسلامیات کے شعبہ میں بہت زیادہ کام ہو چکا ہے اور مزید کرنے کی ضرورت بھی ہے کیونکہ اسلام کا تعلق زندگی سے ہے اور وقت و حالات کے بدلنے سے زندگی کی ضروریات اور اس کے تقاضے بھی بدل جاتے ہیں۔اسی بناپر ضروری ہے اسلامیات پر برابر کام ہوتا رہے۔تاہم کچھ نادان دوست سالہاسال سے ایک اعتراض کرتے آرہے ہیں ان پر افسوس ہوتا ہے کہ وہ حافظہ پر یقین رکھتے ہیں ذہن پر نہیں کہ وہ جانکاری حاصل کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے کہ اسلامیات کے شعبہ میں کس قدر زیاد وسیع و عمیق کام ہو چکا ہے اور ہورہاہے۔مثلاً مستشرقین کے نت نئے سوالوں کا برابر جواب دیا جارہاہے۔ندوۃ العلماء اپنے پیش نظر مقاصد میں اگرچہ پورا نہیں اترا لیکن ستر برس بیت جانے کے باوجود اس کے تصورات میں کہنگی پیدا نہیں ہو پائی ہے۔[1]

جامع نصاب کی تیاری

جہاں پر موجودہ دور میں دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں تبدیلی وتغیر کی بات ہر طرف سے کی جاتی ہے،وہیں پر اہل مدارس کی جانب سے عصری علوم کے اداروں کے نصاب پر بھی سوال اٹھائے جاتے ہیں کہ وہ بھی مسلم نوجوانوں کو ایمان وایقان پر قائم رہنے کی دعوت سے خالی ہے۔ایسے میں دینی مدارس کے طلبہ کو عصری علوم کی کس قدر لازمی ضرورت ہے اس کی تحدید کا حق عصری علوم کو حاصل ہے جبکہ دینی تعلیم کس قدر ضروری ہے مسلمان نوجوان کے لئے اس کو متعین کرنے کا اختیار بھی علماء کرام کو حاصل ہے۔اس کے ساتھ دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں تغیر کے وقت اس امر کو ملحوظ خاطر رکھا جائے کہ علوم مقصودہ اور علوم ضروریہ کیاہیں۔ماضی میں درس نظامی میں اساسی طور پر دینیات کی تعلیم کے لئے علم تفسیر،علم حدیث اور علم فقہ کو بنیاد بنایا جاتا رہاہے اب بھی اسی کو قائم رکھا جانا چاہیے اور منطق وعقلیات کی جگہ پر عصر حاضر کے ضروری علوم کو ذہن ودماغ کی ورزش کے لئے مقرر کرلیا جائے۔[2]

تخصص واختیار

دینی مدارس کے نصاب تعلیم کے فضلا کے لئے مختلف علوم وفنون سے مانوسیت کی بناپر تبحر وتخصص کی دعوت وترغیب دی جائے جیسے عصری علوم میں خصوصی کلاسز کے ذریعہ سے یہ انتظام کیا جاتا ہے اور اسی طرح دینی مدارس کے نصاب میں دینیات کے اساسی علوم کے ساتھ اصول فقہ،کلام،بیان ومعانی اور بدیع اور عربی ادب کو بطور اختیار کے شامل نصاب رکھا جانا چاہیے تاکہ طلبہ حسب ذوق ان علوم سے بھی برابر استفادہ کرسکیں۔[3]

1۔نظام تعلیم،72-73

2۔ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ص110

3۔ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ص112

جدید نصاب

دینی مدارس میں جدید نصاب کے اجراء کی اشد ضرورت ہے تاوقتیکہ مسلم نوجوانوں کے اصلاح عقائد و معاملات اور ماحول پر قدرت نہ حاصل کرلی جائے۔ ان مدارس میں عصری تقاضوں سے ہم آہنگ جدید نصاب تعلیم کا نا صرف اجراء کیا جائے بلکہ اس کی تعلیم کے لئے خود مدارس سے افراد تیار کیے جانے چاہیے۔ ملحد مسلمانوں پر غیر مسلم اساتذہ کو ترجیح دی جائے اور اس کے ساتھ خود مسلم نوجوانوں کی تیاری کی برابر کوشش جاری رکھی جائے کہ وہ قدیم وجدید علوم وفنون کی تعلیم کا بہتر سبق حاصل کر کے خدمت انجام دے سکیں۔[1]

میٹرک، ایف اے، بی کا نصاب دینیات

دینی مدارس میں تعلیم کی اگر مدت وہی قائم رہے جو عصری جامعات میں ہے تو کوشش یہ کی جانی چاہیے کہ طلبہ میٹرک تک قرآن کریم کے معانی اور مختصر تشریح ومطلب کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں اور ایف اے کے مرحلہ پر مشکوٰۃ المصابیح یا اسی قسم کا مجموعہ حدیث کی تعلیم حاصل کریں اور بی اے کے مرحلہ پر فقہ کی تعلیم ہدایہ یا شرح وقایہ سے حاصل کر سکیں۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ قرآن کی تعلیم براہ راست قرآن سے ہی ہو اور حدیث وفقہ کی تعلیم کا معیار مقرر کر کے کوئی بھی کتاب اختیار کر لینے میں مضائقہ نہیں۔[2]

طریق تعلیم

دینی مدارس میں مروجہ طریقہ تعلیم کتاب بنی ہے۔ تاہم عصر حاضر کے جدید اسلوب تدریس املاء لیکچر (تقریر) سے بھی استفادہ فائدہ سے خالی نہیں اگرچہ یہ اہل علم و معلم پر منحصر ہے کہ وہ کس ذریعہ سے علم کی تعلیم کو مؤثر گردانتا ہے وہی انداز وطریقہ تعلیم و تدریس اختیار کرنے میں حق بجانب ہے۔[3]

دینی تربیت کی ضرورت

مغربی طرز تعلیم کے اداروں میں دینیات کی تعلیم کو لازم کرنے کے ثمرات سے متعلق چہ مگویاں کی جاتی ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر معلم مؤثر و با عمل ہو تو نقارہ خانوں سے بھی موحد پیدا ہو سکتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا محمد علی، علامہ اقبال اور مولانا عبد الماجد دریابادی پر اہل خلوص اور دردمند اساتذہ کی تربیت کا اثر ہی تھا جس نے ان کے ایمان کو غیر متزلزل بنا دیا تھا۔ اسلامی نظام حیات (فقہ) کی تعلیم سلیم الفطرت قلوب کو با آسانی متاثر کر سکتی ہے۔[4]

1۔ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ص114

2۔ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ص116

3۔ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ص116

4۔ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟، ص113

نصاب کے مقرر کرنے میں شورائیت

مولاناعبد الحی حسنی ندویؒ نے لکھاہے کہ قدیم نصاب تعلیم کو کسی کمیٹی یا کسی فرد کی تحریک سے فروغ نہیں ملا بلکہ علم و فن اور کتاب کی تعلیم دین والا استاد کے گرد جمع ہونے والے طلبہ نے اس علم و فن کو دوسروں تک منتقل ہی نہیں کیا بلکہ اس علم یا صاحب علم کی جانب انتساب کو عزت و شرف کا موجب بھی سمجھتے تھے۔ گویا کہ یہ نصاب ارادتاً مدون نہیں کیا گیا بلکہ خود بخود پھیلتا چلا گیا اس کے مضمرات میں سے یہ ہے کہ فرد کے خاص رجحانات کو بھی عزت و احترام کا مقام حاصل ہو گیا اور شورائیت و اجتماعیت کی برکات سے یہ نصاب خالی رہا۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی مدارس کا نصاب وضع کرتے وقت قرآن کریم کے حکم "وامر ھم شوریٰ بینھم" کو بنیاد بناتے ہوئے اصحاب علم و فضل دل جمعی کے ساتھ اس نازک کام کو سرانجام دیں۔[1]

تعلیمی خود مختاری نہیں علمی قیادت کی ضرورت

اہل علم اور اسلامی دانشوروں پر لازم ہے کہ وہ مسلمان بچوں کے لئے اس طور پر نیا نصاب و نظام تعلیم ترتیب دیں کہ اس کو پڑھنے سے مسلمان نا صرف خود مختار نظام تعلیم کا حامل ہو جائے بلکہ مسلم معاشرے علمی و عملی میدان میں قیادت و رہبری کا فریضہ انجام دینے کے قابل ہو جانا چاہیے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے کہ اس کو پلک جھپکنے میں سرانجام دیا جاسکتا ہے بلکہ اس کے لئے محنت و جانفشانی اور باصلاحیت افراد اور جماعتوں کی ضرورت کے ساتھ اس سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ خود حکومت وقت یہ فریضہ اپنی نگرانی میں انجام تک پہنچائے۔ ایسے افراد تلاش کیے جانے چاہئیں جو اسلامی علوم و فنون کی حقانیت و ابدیت کے معترف و مؤید ہونے کے ساتھ جدید عصری علوم کی ضرورت و اہمیت سے بھی واقف ہوں اور پھر وہ نئے نصاب تعلیم کے ذریعہ سے ان تمام جدید چیلنجز سے نبرد آزمائی کا کام لیں جن کے سامنے مغرب اپنے ہتھیار ڈال چکا ہے۔ دنیا کو پاک و صاف اور امن و محبت، ایثار و قربانی کے جذبہ سے سرشار انسان دوست معاشرہ پیش کیا جائے کہ وہ مسلمانوں کے تہذیبی و ثقافتی اور معاشی و معاشرتی طور طریقوں کو اختیار کیے بغیر دائمی راحت کو محسوس نہ کر پائیں۔[2]

نظام تعلیمی کی دو ضرورتیں

معروف علمی و دینی شخصیت، مذہبی سکالر اور صدارتی ایوارڈ یافتہ مولانا زاہد الراشدی لکھتے ہیں کہ تعلیمی نظام کی دو لحاظ سے ضرورت ہے ایک ہر فرد کی بنیادی شخصی ضرورت ہے کہ اس کو علاقائی زبان، قومی زبان اردو، دینی زبان عربی، عالمی زبان انگریزی وغیرہ سے اس قدر واقفیت کا ہونا لازم ہے کہ وہ باآسانی ان میں لکھ پڑھ اور سمجھ سکتا ہو تاکہ وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے میں ماہر ہو سکے اور عربی زبان سے اتنی شناوری ضروری ہے کہ وہ قرآن و حدیث کا فہم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ اس کے ساتھ وہ باعزت و غیرت مند مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائے اس کے لئے اس کو عقائد و عبادات اور معاملات و اخلاقیات کی تعلیم حاصل کرنی ہوگی۔ روز مرہ کی زندگی بہتر گذارنے کے لئے اس کو حساب و کتاب سے بھی مانوسیت ہونے کے ساتھ قومی و بین الاقوامی تقاضوں کو جاننے کی صلاحیت اور سائنس و جدید علوم کی ابتدائی واقفیت سے بہرہ ور ہونا

1۔ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ ص 119

2۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، ص 352

ہر فرد بشر کے لئے ضروری ہے۔اس سب کے لئے نرسری سے میٹرک تک کا نصاب تعلیم مدون کرکے ہر فرد پر اس کا حصول لازم قرار دیا جائے۔ جہاں تک تعلق ہے تعلیمی نظام کی قومی ضرورت کا تو اس کے لئے یہ بات ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ جس طرح معاشرہ کو اچھا ڈاکٹر میسر ہونا چاہئے، ماہر انجینئر کی ضرورت ہے بعینہٖ اسی طرح دیگر شعبہ ہائے زندگانی میں بھی ماہرین کی ضرورت ہے بلکل اسی طرح مسلم معاشرہ کی یہ بھی ضرورت ہے کہ اس کے اندر دینی علوم پر کامل دسترس رکھنے والے ماہر علماء موجود ہوں تا کہ اسلامی زندگی گذارنے سے متعلق گاہے بگاہے ان علماء کے ذریعہ رہنمائی ملتی رہے۔[1]

ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ اور جدید تعلیم کی تشکیل

مسلم ممالک کے نظام تعلیم کے بارے میں ہر درد رکھنے والا صاحب وعلم و فضل متفکر تھا اور ہے بھی کہ وہ مسلم نوجوانوں کی صلاحیتوں کو بہتر انداز سے استعمال کرکے اس کے ذریعہ مسلم معاشرہ کو بہرور کرکے اس کو دوسروں کے لئے بطور نمونہ چھوڑنا چاہتے تھے کہ اس کو اختیار کیے بنا جدید ترقی ناقص و نامکمل ہے۔یہی وجہ ہے کہ سابق وفاقی وزیر مذہبی امور حکومت پاکستان، سابق صدر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ نے اکیسویں صدی میں مسلمانوں کے لئے مثالی و مثبت اور تعمیری نظام تعلیم کا ایک خلاصہ پیش کیا۔وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے نظام تعلیم میں حسب ذیل اہداف کو مکمل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ مغربی تہذیب اور مغربی علوم وفنون کی تنقید و تنقیح اور اس کا مکمل جائزہ لیا جائے۔اسلامی بنیادوں پر تمام علوم کو از سر نو مدون و مرتب کیا جائے، جن میں تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، اسلامی سیاسیات و دستوریات، اسلامی معاشیات، تصوف اور علم النسف وغیرہ کی تشکیل جدید پر کام کیا جائے۔قدیم علوم و معارف کی تدوین نو کا اہتمام کیا جائے، ایک ہمہ گیر اسلامی ثقافتی انقلاب کا آغاز 2001ء۔ قرآن کی بنیاد پر ایک نئے تہذیب و تمدن کی تعمیر کا آغاز۔علاقائیت و لسانیت کے کے حقیقی و وہمی مسائل کو سمجھنے کا اہتمام کیا جائے۔عالمی سازشوں کی جانکاری حاصل کی جائے کہ یہود وہنود کیا منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔فرقہ واریت کا خاتمہ بذریعہ تعلیم ہی ممکن ہے۔اسلامی تنظیموں اور تحریکوں میں باہمی ربط و تعلق استوار ہونا چاہئے۔ایک ایسی بھرپور ترغیبی تحریک بپا کی جائے کہ جو تحریک پاکستان کی طرح لوگوں کو اس نئے کردار کے لئے تیار کرنے کی موجب بن جائے۔ان دس اصولوں کی تکمیل کے لئے دس طرح کے اقدامات کی ضرورت ہے۔ مضمون کی طوالت کے باعث صرف عنوانات درج کیے جارہے ہیں۔[2] وہ اہم امور یہ ہے:۔ تنسیق، تدریج، توازن، واقعیت پسندی، جامعیت، تعمق، تخصص، توسع، توسیع اور تکمیل۔ان دس نکات پر عمل سے ہی مندرجہ بالا اصولوں کی تکمیل ممکن ہے اور اسی ذریعہ سے بہتر نظام تعلیم مسلم سماج کو میسر آسکے گا اور اس سے دنیا بھی متمتع ہونے پر فخر محسوس کریگی۔[3]

علامہ اقبال اور تعلیم

مسلم ممالک میں موجود بے چینی و اضطراب کے پھیلنے کا ایک بنیادی سبب یہ بھی تھا کہ وہاں کے تعلیمی اداروں میں معاشرے کے حقیقی مسائل کو جاننے اور ان کا حل تلاش کرنے کا جذبہ مفقود ہونے کے ساتھ وہ تعلیمی ادارے باہم ایک دوسرے پر اپنی فوقیت جتلانے پر مصر ہوئے تو سماج

1۔ماہنامہ الشریعہ، جنوری، 1992ء بحوالہ اسلام اور نظام تعلیم، آفتاب علی، ادارۃ المعارف کراچی، ص1179-180

2۔ مزید تفصیل کے لئے مسلمانوں کا دینی وعصری نظام تعلیم ملاحظہ کیجیے۔

3۔ مسلمانوں کا دینی وعصری نظام تعلیم، ص172 تا179۔ بحوالہ اسلام اور نظام تعلیم، ص171 تا178

میں انتشار و افتراق پھیلتا چلا گیا اسی بات کو دیکھ کر علامہ اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کو اپنا از سر نو نظام تعلیم تیار کرنے کے داعی بنے، انہوں نے کہا ہے کہ

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو   ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب   سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا اک ڈھیر [1]

1۔ نظام تعلیم، ص18

باب سوم

دینی مدارس کے نظام تعلیم کے بارے میں سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل اول: دینی مدارس کے نظام تعلیم کی افادیت اور سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل دوم: دینی مدارس کے نظام تعلیم میں تخصص کی اہمیت وضرورت سید ابوالحسن ندوی کی فکر جائزہ

فصل سوم: دینی مدارس کے نظام تعلیم میں تبدیلی اوراس کی افادیت پر سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل اول

دینی مدارس کے نظام تعلیم کی افادیت کے بارے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل اول

دینی مدارس کے نظام تعلیم کی افادیت کے بارے میں سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

دینی مدارس کے نظام تعلیم کی افادیت مسلم ہے کہ اس کے بجز اچھے سے اچھا نصاب تعلیم بھی مفید نہیں ہو سکتا۔ جب تک اساتذہ و طلبہ کو ایک مربوط اور مثالی نظام تعلیم فراہم نہ کر دیا جائے کہ اس میں رہ کر منظم انداز سے تعلیم و تعلم کا سلسلہ استوار رکھیں۔ نظام تعلیم کا تعلق نصاب تعلیم کے ساتھ ساتھ مدارس کی آب و ہوا، رہن سہن، ماحول، اوقات کی پابندی، تربیت و اخلاق، ہاسٹل، تفریح وغیرہ سے بھی جوڑا ہوا ہے۔ جس کا اہتمام ماضی کے جامعات میں پورے اہتمام کے ساتھ لحاظ و پاس رکھا جاتا تھا۔ تاکہ اساتذہ و طلبہ کی طبیعتوں میں ہیجان و بوجھ کی کیفیت پیدا نہ ہونے پائے۔

دینی مدارس کا نظام تعلیم

ہندوستان کے دینی مدارس اور دور ماضی میں اسلامی ملکوں میں موجود مدارس کا نظام تعلیم ایک مربوط انداز سے تیار کیا گیا تھا۔ جہاں پر طلبہ کی تعلیم کے لئے بہترین نصاب مدون و مرتب کرنے کا اہتمام تھا وہیں پر طلبہ کی بہتر تعلیم و تربیت کے لئے مناسب و بہتر ماحول اور نظم و نسق بھی قائم کیا گیا تھا۔ اسی سلسلہ میں دینی مدارس کے مختلف شعبہ جات کے لئے الگ عمارتوں کا قیام مثلاً درسگاہیں، اساتذہ و طلبہ کے لئے اقامت خانے، کتب خانے، شفاخانے وغیرہ کے قیام کا نظام عمل میں لایا جاتا وہیں پر اساتذہ و طلبہ کو علمی پیاس کو بجھانے کا اس طور پر موقع عنایت کیا جاتا تھا کہ ان کے گذر بسر طعام و شراب اور روزمرہ کا خرچ وقف شدہ املاک کے ذریعہ پورا کیا جاتا تھا تاکہ اساتذہ و طلبہ اپنی تمام تر محنت علم و فن میں مہارت کاملہ حاصل کرنے پر صرف کریں اور ان کی مادی ضروریات او قاف و امراء و روسا نے اپنے کاندھوں پر لے رکھی تھی۔[1]

ذوق تعلیم پیدا کرنے کی ضرورت

عصر حاضر کے ماہر تعلیم جس امر پر متفکر ہیں کہ وہ طلبہ اور سماج کا رشتہ کس طور پر مضبوط و قوی بنا سکتے ہیں کہ دینی و عصری تعلیم حاصل کرنے والا زندگی کے دھارے سے نہ کٹ سکے اس کے لئے ضروری ہے کہ طلبہ میں علمی ذوق اور علمی استعداد پیدا کیا جائے۔ دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کے مابین موجود رسمی تعلق جو درسگاہ تک محدود ہے کو غیر محدود کرنے کی ضرورت ہے کہ طلبہ اساتذہ سے بغیر خوف و دہشت کے علم و عمل کے متعلق استفادہ کرنے کے حامل ہوں۔ اساتذہ کرام طلبہ کو علمی و ادبی کتب کے مطالعہ کی تعلیم و ترغیب دیں اور انتخاب کتب میں رہنمائی فرمائیں۔ اس کے ساتھ جدید و قدیم نظام تعلیم کے ماہرین کو تعلیم گاہ بلا کر ان کی خصوصی مجالس علم و فن کی معرفت و پہچان سے متعلق منعقد کرائی جائیں اور طلبہ ان بڑے علماء و مفکرین کی زندگیوں کے نچوڑ سے استفادہ کرنے کی کوشش کریں یہی عمل شرق و غرب کی عصری جامعات میں بھی کیا جاتا ہے کہ علم و فن ادب شاعری وغیرہ کے موضوعات کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے علماء و شعراء اور ادبا سے استفادہ کیا جاتا ہے اور اسی طرز سے استفادہ کی بدولت علامہ سید سلیمان ندویؒ میں وہ ذوق سلیم پیدا ہوا اور وہ علامہ شبلی نعمانی کی مجالس میں شرکت کرنے کا ثمرہ ہے اس کے ساتھ یہ کہنے میں باک

1۔ اسلامی نظام تعلیم، ریاست علی ندوی، الفیصل نشران و تاجران، اردو بازار لاہور، ص58-80

نہیں کہ دینی وملی موضوعات کے ساتھ مدارس کے طلبہ کو جدید علوم سائنس وطبیعات، فزکس، فلکیات وغیرہ سے استفادہ کرانے کی ضرورت بھی مسلم امر ہے۔[1]

ہم نصابی سرگرمیاں

دینی مدارس کے طلبہ کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کو تعمیری وتحریکی سرگرمیوں کی اجازت دی جائے اس کی بدولت ان میں معاشرہ میں عملی کردار ادا کرنے کی استعداد پیدا ہو گی۔ طلبہ کی بزم خطابت، دارالمطالعہ، دارالاخبار وغیرہ کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ وہ مسلمانوں کے شاندار ماضی سے ناصرف واقف ہوں بلکہ وہ تاریخ کے گمشدہ اوراق سے پاکیزہ سیرت واخلاق کی حامل شخصیات کو اپنے لئے نمونہ عمل بنائیں۔ طلبہ اپنی بات کو خوبصورت اور دلکش انداز میں لکھنے اور بیان کرنے کے حامل ہو جائیں البتہ اس بات سے بھی انکار نہیں کہ اب زمانہ کے دامن میں بہت وسعت پیدا ہو چکی ہے سو اس کے لئے صرف اچھا لکھنا اور اچھے انداز سے بیان کرنا کافی نہیں بلکہ خود اپنے کردار کو عالی بنانے اور دردمند وپرسوز بنانے کی بھی ضرورت ہے جبھی انسانی معاشرہ کے اوپر انسان کی تقریر وتحریر اثرانداز ہو سکے گی۔[2]

مغرب کا نظام تعلیم

مغرب نے مسلم ممالک کو اپنے زیر اثر کرکے ان کو تہ تیغ کرنے کی بجائے ہمیشہ کے لئے فکری غلام بنانے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے بلندپایہ مدبرین کو اس مہم کو سر کرنے کے مشن پر مامور کیا کہ وہ اپنی تحقیق وجستجو کے ساتھ ایسے اصول وضوابط اور نظام تعلیم مرتب کریں جو مسلمانوں کو ایک لمبے وقت کے لئے مغرب کے زیر دست رہنے پر مجبور کردے۔ چنانچہ خود مغربی مبصر علامہ محمد اسد (سابق لیوپلوڈ ویس) نے اہل مغرب کے درپردہ مقاصد فاسدہ کو پوری صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ:

> "تاریخ کی اس طرح کی تعلیم نوجوانوں کے دماغ میں اس کے علاوہ کوئی اور اثر نہیں چھوڑ سکتی کہ وہ احساس کہتری میں مبتلا ہوں اور اپنی پوری ثقافت (کلچر) اور اپنے مخصوص تاریخی عہد کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگیں اور مستقبل میں ان کے لئے ترقی وخدمت کے جو وسیع اور روشن امکانات ہیں ان کا انکادر کرنے لگیں، اس طرح وہ ایک ایسی منظم تربیت حاصل کرتے ہیں جس میں اپنے ماضی اور اپنے مستبقل کی حقارت پورے طور پر کارفرما ہوتی ہے، ان کے نزدیک ان کے مستقبل کی کامیابی صرف اس میں ہے کہ وہ مغربی معیار کے مطابق اور مغرب کے افکار واقدار سے ہم آہنگ ہوں۔[3]"۔

ایشائی اور مشرقی ممالک میں مغربی نظام تعلیم کو متعارف کرانے والے انگریز اہل قلم لارڈ میکالے نے جو 1835ء میں جو اس تعلیمی کمیٹی کے صدر تھے جس نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستانیوں کو مشرقی زبان کی بجائے انگریزی میں تعلیم دی جائے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

1۔ پاجا سراغ زندگی، ص68-71

2۔ پاجا سراغ زندگی، ص80-87

3۔ Islam at the crossroads,P97

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان ترجمان ہو، یہ ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خون ورنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو، مگر مذاق اور رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔"[1]

مغرب کے نظام تعلیم کے مضمرات میں صرف یہ بات شامل نہیں کہ اس کے سبب مسلمانوں کا علمی مزاج تبدیل ہو جاتا ہے بلکہ اس کے اثرات مسلمانوں کی زندگی کے جمیع مراحل پر مرتب ہوتا ہے جو جلد یا بدیر اپنے اثرات بد الحاد و زندیقیت و ارتداد کی صورت میں نوجوانوں میں ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے فکر مند اہل علم علامہ اقبال، اکبر الہٰ آبادی، علامہ اسد اور مولانا محمد علی وغیرہ نے اس کا اظہار اپنی تحریروں میں کھلے طور پر کیا ہے۔ مولانا محمد علی نے مغرب کے طرز تعلیم میں دہرے معیار کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"حکومت برطانیہ مکمل مذہبی غیر جانبداری کی قائل اور علمبردار تھی، اور مذہبی حتیٰ کہ اخلاقی تعلیمات کو بھی بالکلیہ بے دخل کر کے اس نے اس پالیسی کو عملی جامہ پہنایا، صرف وہ معلومات جن کو لڑکے از خود انگریزی اور مشرقی زبانوں کی درسی کتابوں میں پائے جانے والے لٹریچر سے اخذ کر لیں، رہ گئیں۔ دوسری طرف وہ تعلیمی نظریہ جو حکومت نے ہندوستانی نوجوانوں کے لئے بہم پہونچایا تھا "جدید" تھا لیکن اپنی تمام تخریبی صلاحیت کے ساتھ اس کا سارا زور اس طرف تھا کہ طالب علم کے اندر بیجا ہمہ دانی کا احساس پرورش پائے اور صدیوں پرانے توہمات کے ساتھ ساتھ روایت اور حجت و سند کی ساری عظمت ختم کر دے، اس میں شبہہ نہیں کہ رفتار زمانہ کے ساتھ یہ تعلیم حقیقت کی تلاش و جستجو کے ایک مخلصانہ جذبہ کو بیدار کرنے کا سبب بنی، لیکن اپنی پہلی یورش میں یہ خاص طور پر تخریبی ہی رہی ہے، اور ختم کئے ہوئے توہمات کے بدلہ میں جو تھوڑا بہت اس نے دیا وہ بذات خود بے بنیاد عقائد اور توہمات پر مبنی تھا، ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ تھوڑا بہت "جدید" تھا"۔[2]

مغرب کی تہذیبی یلغار

مشرق سے بہت سے نوجوان مغرب تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں اور وہاں سے تعلیم مکمل کر کے اپنے ملکوں کی قیادت کی باگ ڈور ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ لیکن بد قسمتی کی بات یہ ہے کہ یہ نوجوان جو اپنے ملک و قوم کی قیادت کر رہے ہوتے ہیں ان کے آذہان کو مغرب کے اساتذہ نے اس قدر پراگندہ کر دیا ہے کہ وہ مسلم معاشرہ کی نفسیات اور اسلام سے محبت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مغرب کے باطل افکار و نظریات پر عمل پیرا رہتے ہیں کہ اسلام ایک پرانا دین ہے موجودہ دور میں اس کی ضرورت نہیں۔ اور اسلامی انسانی زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلم نوجوان مغرب تو صرف ان علوم کو حاصل کرنے گیا تھا جن سے مشرق اور اہل مشرق محروم تھے اور نوجوانوں کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ مسلم معاشرہ کی ان میادین میں رہنمائی کرتے جن سے وہ محروم تھے اور اسلامی تہذیب و تمدن کی برتری کو ثابت کرنے کے لئے اپنی توانائیاں صرف کرتے افسوس کہ ایسا ہو نہیں رہا۔ معمول چند لوگ ہی ایسے ہیں جو مغرب کی تہذیبی یلغار سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ ان کا مغرب میں جا کر ایمان اور مضبوط اور پختہ

1۔ تاریخ التعلیم از میجر باسو، ص87

My Life ,A Fragment.p 23-24۔2

ہو گیا۔ مسلم نوجوانوں کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اگر وہ مغرب سے استفادہ کر رہا ہے تو اس سے زیادہ بہتر چیز ایمان وایقان کی دولت ہے جو وہ مغرب کو دے سکتے ہیں اور مغرب اس سے تہی دامن ہو چکا ہے۔ [1]

مروجہ تعلیم کا ناقص فلسفہ

زمانہ قبل مسیحؑ سے بیسویں صدی تک کے قدیم وجدید مدارس (تعلیمی اداروں) کے فکر و فلسفہ کا جائزہ لیا جائے تو اس میں چار اہم نقائص ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ پہلا نقص یہ ہے کہ معاشرہ کو تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کا بنیادی نکتہ یہ سمجھ لینا کہ مادی فوائد اور حصول جاہ ومنصب کا جذبہ انسانوں کو حصول کی جانب متوجہ کرنے کے لئے کافی ہے اس کا بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ جو بھی تعلیم رائج حاصل نہیں کرے گا وہ نوکری وعیش وعشرت سے تہی دامن ہو جائے گا۔ جبکہ معاشرہ کی روحانی واخلاقی ضرورتوں کی حاجت براری کی تکمیل کا جذبہ ان میں موجود ہی نہیں جبکہ انبیاء کرام علیہم السلام اور روحانی مصلح ومعلم کا اول کام ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ معاشرہ کو اس کی بنیادی ضروریات کی طرف متوجہ کرتے ہیں جس کی بدولت معاشرہ خود بخود بغیر کسی جبر واکراہ کے حصول علم کی جانب سفر طے کرتے ہیں۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ علم وعمل کے لئے محرکات وجذبات اور محبت وعشق کے بغیر ہی کتابوں پر ثبت شدہ جامد وبے جان وبے روح نقوش کی تعلیم دی جارہی ہے گویا ان تعلیمی اداروں میں اس بات کی کوشش ولگن تو موجود ہے کہ اس کے فضلاز یادہ سے زیادہ ہوں اور کم سے کم وقت میں اس سے استفادہ کرنے والے ہوں مگر یہ کوشش نہیں کی جاتی کہ نظام تعلیم کمزور کی مدد کرنے والا ہو اور مظلوم کو ظالم سے اس کا حق دلانے میں مددگار ومعاون ثابت ہو سکے۔ تیسرا نقص یہ ہے کہ تعلیمی اداروں میں افراد سازی کی بجائے مجرد کتابیں پڑھا دینے کو تعلیم کا سرنہاں سمجھ لیا گیا ہے گویا علم صرف لکھنے پڑھنے اور معلومات حاصل کر لینے کا نام رکھ دیا گیا ہے، بعض مجبوریوں کے سبب سے استاد وشاگرد کا باہمی ربط قائم رکھا گیا ہے ورنہ اس کو بھی ختم کر کے محفوظ شدہ اسباق کو سنا دینے پر اکتفا کرتے [2] متکلم تصاویر سے مدد لینے کی کوشش اس سلسلہ کی کڑی ہے۔ جبکہ دینی تعلیمی اداروں میں استاد وشاگرد کا اس قدر روحانی وقلبی تعلق قائم تھا کہ استاد سے متعلق غلط خبر وفات کے نتیجہ میں کئی طلبہ افسردہ ہو کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے یا پھر زیادہ رونے کی وجہ سے بینائی سے محروم ہو گئے۔ چوتھا نقص یہ ہے کہ زندگی کے حقائق و تجربات کی بجائے مخففات کی تعلیم پر انحصار کیا جارہا ہے۔ کسی بات کو بیان کرنے میں مختصر سے مختصر انداز اختیار کیا جارہا ہے جس کے سبب بات کو سمجھنا عملاً ناممکن ہے اور زندگی کی حقیقت وتجربہ ومشاہدہ کی اہمیت کو خارج کر دیا گیا ہے جبکہ صحابہ کرام نے ایثار وعدل اور محبت، نماز خوف، نماز قصر، پہاڑ، وضو، تیمم جیسے بہت سے مسائل کی معرفت عملی مشاہدوں اور حقائق کے ذریعہ حاصل کی۔ [3]

1۔ مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، پاکستان، ص54 اور 155

2۔ حال ہی میں کورونا کی وبا کی لہر کی وجہ سے تعلیمی ادارے بند کر کے انٹرنیٹ پر اسباق دینے کا سلسلہ شروع کیا جاچکا ہے جو کسی بھی طور پر بلمشافہ تعلیم کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ مقالہ نگار

3۔ مدارس اسلامیہ، ص46 تا 55

عہد جدید کا سب سے بڑا فتنہ

عہد جدید کا سب سے بڑا فتنہ کیا ہے؟ اس کی کھوج میں ہر درمند مصروف عمل ہے۔ اس جستجو میں اس احساس کو پختہ کر لیجیے کہ اس بات کا قریب قریب کوئی شائبہ نظر نہیں آرہا کہ مسلمانوں کو نماز و قرآن سے روک دیا جائے، اسلام سے انتساب کو ناپسند کیا جائے، البتہ یہ ضرور ہو گا کہ مسلمانوں سے کہہ دیا جائے کہ آپ اپنا الگ نظام تعلیم، اپنی الگ اسلامی تہذیب و معاشرت اور اپنی خاندانی حدود و قیود کو ترک کر کے قومی دھارے میں شامل ہو جاو اس کے بغیر ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتے، اور نہ ہی مہذب انسان کہلانے کے حقدار ہو سکتے ہیں۔ ان مطالبات کا تقاضا حکومتوں، ٹی وی ور یڈیو اور میڈیا کے ذریعہ کیا جائے گا چونکہ دنیا سمٹ چکی ہے آن کے آن امریکہ سے برصغیر تک بات پہنچ رہی ہے۔ ماضی کی حکومتیں دفاع و امن کو یقینی بنانے اور ٹیکس حاصل کرتی تھی موجودہ دور کی حکومتیں زندگی کے جمیع جوانب پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ اسی طرح بیرونی قوتوں کی سازشیں تو مسلم ہی ہیں مگر خود مسلم معاشرے میں مغربی افکار و نظریات کے حاملین شد و مد سے مسلمانوں کو اپنی تہذیب جداگانہ کو ترک کرنے کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔ خطرہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے آزاد تعلیمی اداروں کو تحویل میں لے کر ان کو سیکولر تعلیمی اداروں میں تبدیل کر دیا جائے۔ کالج و یونیورسٹی میں انگریزی ادب و فلسفہ اور عمرانیات و تاریخ کی بجائے عربی اردو ادب کے مضامین کے ذریعہ سے تشکیک پیدا کی جارہی ہے اور اسلامیات کی تعلیم میں بے توجہی کا رویہ اختیار کیا جارہا ہے۔ ایسے میں دینی مدارس کے متعلقین پر لازم ہے کہ وہ بدعات و منکرات کے خلاف سینہ سپر اس انداز سے ہوں کہ ان کا علمی رسوخ متفوق ہونے کے ساتھ دل دردمند بھی ہو اور عقائد و ایمانیات پر غیر متزلزل ایمان و یقین کا حامل ہو جائیں کہ زمانہ کی فراخی و تنگی ان کو مسحور نہ کرنے پائے۔[1]

علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ ہندوستان میں ملا کو سجدہ کی اجازت مل گئی وہ یہ سمجھنے لگا ہے کہ اسلام آزاد ہے در حقیقت ایسا نہیں ہے کہ مسلمان دنیا میں مقید ہیں کہ ان پر چہار جانب سے انگشت اٹھائی جاتی ہے کہ وہ اپنا الگ تشخص کیوں رکھتے ہیں۔

ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت — ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اخلاص اختصاص

دینی مدارس کے نظام تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ وہ طلبہ میں دو صفات کو پیدا کر دے کہ اول ان میں اخلاص ہونا چاہیے کہ وہ علم خالص اللہ کی رضا کے حصول کے لئے حاصل کر رہے ہیں اور حصول علم کا مقصد شہرت و عزت اور مال بنانے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے احکامات کی تعمیل مقصود بالذات ہو، البتہ جائز و ضرورت کی حد تک مال کمانے میں حرج نہیں مگر زندگی کا مقصد بنانا ہرگز درست نہیں۔ علم کے حاصل کرنے سے اللہ کے احکامات پر عمل کر کے منکرات سے بچ کر عذاب الٰہی سے بچنا بھی مطلوب نظر ہونا چاہیے۔ دوسری صفت طلبہ میں یہ پیدا ہونی چاہیے کہ وہ علم کی بہتر استعداد کے حامل ہونے چاہئیں۔ اس طور پر کسی ایک موضوع علم و فن کو اختیار کر کے اپنی ساری توانائیاں اس پر خرچ کر دیں تاہم یہ بات بھی ضرور پیش نظر رہنی چاہئے کہ قدیم دینی نظام تعلیم باہم مربتط تھا یعنی علوم و فنون میں باہمی تعاون کی صلاحیت و ضرورت موجود تھی اور

1۔ پاجا سراغ زندگی، ص 139-145

ہے اس کو بھی قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔ گویا علم کی قدریں باہم مشترک ہیں سب سے فائدہ حسب ضرورت اٹھانا چاہیے کسی ایک کو اختیار کر کے دوسرے کو ترک کرنا یا انکار کرنا چنداں مفید و کارگر نہیں ثابت ہو سکتا۔ [1]

نظام تعلیم کا نقص

موجود مسلم معاشرہ میں پھیلتے انحرافات و بے اعتدالیوں پر ہر شخص شکوہ بلب ہے کہ یونیورسٹیوں میں استاد و شاگرد ایک دوسرے کا ادب و احترام اور لحاظ و پاس اور شفقت و مہربانی سے پیش نہیں آتے، صورت مسئلہ کو حل کرنے کے لئے قاعدہ و قانون بنائے جاتے ہیں مگر اس کی اساس و بنیاد بننے والے امر کی جانب ملتفت نہیں ہوتے کہ موجودہ تعلیمی اداروں پھیلتا یہ انحراف نظام تعلیم کے مادہ پرست، خوشہات نفس اور موقع سے نفع اٹھانے جیسی خواہشات کی وجہ سے ہے، نظام تعلیم میں اخلاق و کردار کی درستگی کی فکر و روح شامل ہی نہیں تو شکوہ کس بات کا۔ ایسے میں اگر تعلیم یافتہ طبقہ کو سدھارنا مطلوب ہے تو از سر نو تعلیم کے نظام کو ترتیب دیا جائے جس سے انسان کے قلب و ذہن میں حقیقی تبدیلی پیدا ہو پائے۔ [2]

مغربی نظام تعلیم کا توڑ

مغرب کے نظام تعلیم کے اسباب و علل اور مضمرات کو جان لینے کے بعد ضروری ہے کہ اس کا توڑ علمی انداز میں کیا جائے اس کے لئے ضروری ہے کہ مسلم اقوام اپنا از سر نو نظام تعلیم تشکیل دیں جس میں مسلمہ عقائد اور مقاصد و ضروریات زندگانی کو مرکزی مقام حاصل ہو اور تمام عصری علوم کے اندر سے الحاد و زندیقیت اور مادہ پرستی کے عفریت کو خالی کر کے اپنے نونہالوں کو عصر حاضر میں قائدانہ کردار ادا کرنے کے قابل نظام تعلیم تشکیل دیا جائے اگرچہ یہ کام بہت مشکل اور طویل تر ہے، یہ دنوں میں تبدیلی رونما نہیں ہو سکتی اس کے لئے سالہا سال تک مسلسل بیداری کے ساتھ جدوجہد کرنی ہو گی۔ تاہم یہ کام جس قدر مشکل ہے اسی قدر لازمی بھی ہے کہ اس کے بجز مسلم نوجوانوں کے ایمان کو محفوظ بنانے کا سامان موجود نہیں۔ [3]

دینی نظام تعلیم کی آزمائش

موجودہ دور میں دینی نظام تعلیم کی بنیادی آزمائش یہ ہے کہ ایسے افراد و خاندانوں نے اپنا رشتہ تعلیم و تربیت جو نسل بعد نسل استوار تھا جس کی بدولت میں استغناء و زہد اور حق گوئی و بیباکی اور خود اعتمادی و خودی کا جذبہ بحظ وافر موجود تھا کہ وہ کسی سے مرعوب و متاثر نہیں ہوتے تھے بلکہ اپنی قسمت و صلاحیت پر فخر کرتے تھے، اب وہ اپنا رشتہ توڑ چکے ہیں جس کا بدیہی نتیجہ ہے کہ اب دینی نظام تعلیم کو معاشرہ کے باصلاحیت و پر اعتماد نوجوانوں کی بجائے رہزن و معذور اور کمزور بچے مل رہے ہیں جبکہ تندرست و توانا بچوں کو سکول و انگریزی تعلیم کی جانب منتقل کیا جاتا ہے یہ بہت خطرہ کی بات ہے کہ والدین جانتے بوجھتے ہوئے بے حمیتی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ ہم اپنا کمزور بچہ یا معذور بچہ آپ کو بھیج رہے ہیں اس کی تعلیم کا انتظام کریں۔ جبکہ

1۔ طالبان علوم نبوت، 150-151

2۔ تعمیر انسانیت، سید ابو الحسن علی حسنی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، ص88

3۔ اسلامیت و مغربیت کی کشمکش، ص252-254

دینی تعلیم کو ضرورت باصلاحیت ذہین و باشعور و بااخلاق بچوں کی ہے جب ایسا نہیں ہو رہا ہے تو اس کے برے اثرات دینی نظام تعلیم اور معاشرہ پر برابر مرتب ہو رہے ہیں۔ [1]

دینی مدارس کی مخالفت اور استعداد ناقص

موجودہ دور میں دینی مدارس کا نظام تعلیم خطرہ میں پڑ چکا ہے، اسکے اسباب میں سے بنیادی سبب یہ ہے کہ دینی مدارس میں پڑھانے والے ذی استعداد نہیں ہیں تو یہ امر مسلم ہے کہ جب پڑھانے والے علمی تفوق و برتری اور ماہر علم و فن نہ ہوں تو پڑھنے والے طلبہ بھی ان کو دستیاب نہیں ہو سکتے۔ مولانا انو شاہ کشمیری، مولانا حسین احمد مدنی جیسے شیخ الحدیث سے دینی مدارس خالی ہو چکے ہیں اور عام بلوہ ہے کہ کہیں حدیث کا استاد میسر نہیں تو کہیں فقہ و اصول کا استاد ناپید الغرض قدیم علوم کی تعلیم دینی والے اساتذہ معدوم ہوتے جا رہے ہیں ایسے میں ضروری ہے کہ دینی مدارس میں طلبہ کی استعداد بہتر بنانے پر توجہ مرکوز کی جائے اور طلبہ کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ دنیا کی چمک دمک کے اسیر بننے کی بجائے اپنے اساتذہ کے ساتھ تعلق کو مستحکم کریں اور انہی اساتذہ کے فیض سے اللہ تعالیٰ وہ کام لے گا جو بڑے علم و فضل بھی انجام دینے سے قاصر رہے ہوں۔ [2]

1۔ طالبان علوم نبوت، حصہ دوم، ص29-30

2۔ طالبان علوم نبوت، حصہ دوم، ص80

فصل دوم

دینی مدارس کے نظام تعلیم میں اصلاح طلب امور کی ضرورت اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل دوم

دینی مدارس کے نظام تعلیم میں اصلاح طلب امور اور سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

دینی مدارس کے نظام تعلیم کی افادیت کو بیان کرنے کے بعد ضروری ہے کہ اس میں اصلاح طلب امور کا جائزہ لیا جائے جس کا حکومتی و سماجی حلقوں کی جانب سے بارہا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی میں کوئی بھی انسانی کام و کوشش حرف آخر نہیں کہلا سکتی کیونکہ یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن حکیم کو اعجاز حاصل ہے کہ اس میں کسی بھی قسم کا تغیر و تبدل کا احساس تک بھی پیدا نہیں ہو سکتا اور کتاب حکیم تا قیامت انسانیت کی رہبری و رہنمائی کرنے کے لئے کلیدی مقام و مرتبہ کا حامل ہے اور رہے گا۔ جب کہ انسانوں کی جانب سے زندگی کو بہتر طور پر گزارنے اور دین کو با آسانی سمجھنے کے لئے اور بہتر معاشرت کے لئے جو اصول تجویز کیے جاتے ہیں اس میں علاقہ، مذہب، زمانہ کا لحاظ رکھا جاتا ہے جو ایک وقت تک تو رہنمائی کا ذریعہ ہو سکتے ہیں مگر ہمیشہ کے لئے اس کو اختیار کر لینے سے انسانی معاشرہ انتشار و افتراق اور پسپائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ دینی مدارس کے نظام تعلیم کو مدون کرنے والوں کے نیک جذبوں کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھنے کے ساتھ عصر حاضر میں اس سے استفادہ حاصل کرنے کی درست سبیل کو سمجھا جائے اور اس میں اصلاح طلب امور پر عادلانہ نگاہ بھی ڈالی جائے۔

اجتہاد کی ضرورت

نظام تعلیم کو پر اثر بنانے کے لئے نئے اجتہاد کی ضرورت ہے اس سے مراد صرف دینی مدارس کا نظام تعلیم نہیں بلکہ تمام مروجہ نظام ہائے تعلیم کو بہتر سے بہتر بنانے کی ضرورت ہر دور میں موجود ہے۔ نظام تعلیم کا چونکہ تعلق انسان سے ہے اور انسان کی ضروریات سے متعلق کسی بھی چیز میں جمود نہیں آسکتا اور نہ ہی کوئی امر حرف آخر کہلانے کا حق رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ اعزاز صرف وحی الٰہی کو حاصل ہے کہ وہ ہر دور میں، ہر قوم کے لئے نفع مند ہے، مشرق مغرب کی اس میں کوئی تقسیم نہیں۔ جب اس بات کو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام ایک ابدی پیغام ہے اور اس پیغام کا تعلق زندگی سے ہے تو یہ بھی ماننا ہو گا کہ زندگی سے مرتبط کسی چیز کو دوام حاصل نہیں لہذا ابرابر اس کی ضرورت رہے گی کہ زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے احتساب کے سلسلہ کو استوار رکھا جانا چاہیے اور اس میں نظام تعلیم کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے اجتہاد کی ضرورت اور زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔[1]

اسلام کا تعلیمی نصب العین

اہل علم و علماء کی یہ عادت سلیمہ رہی ہے کہ وہ طلبہ کو اسلامی تعلیم کے نصب العین کی پاسداری کو مضبوطی سے اختیار کرنے کی تاکید کرتے تھے۔ قاضی ابن جماعہ نے اس بات کو اساتذہ کے فرائض میں شامل کیا ہے کہ وہ طلبہ کے قول و عمل اور حسن نیت و اخلاص عمل کا پورا انتظام کریں اور طلبہ کو یہ بتائیں کہ حصول علم کا مقصد کیا ہے چنانچہ قاضی ابن جماعہ نے لکھا ہے کہ طلبہ کو چاہیے کہ وہ اپنی تعلیم اور تہذیب کا مقصد اللہ تعالیٰ کی مرضی حاصل کرنا، علم کی اشاعت کرنا، شریعت قائم کرنا، حق بات زبان سے نکالنا اور ناحق باتوں کو روکنا قرار دیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو یہ علم کسی صورت ان کو نفع

1۔ نظام تعلیم، ص 73

نہیں پہنچائے گا۔اسی طرح ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ طلبہ کو چاہئے کہ وہ اپنے دل سے ہر قسم کی کجی روی،عداوت،بغض،کینہ پروری،بد خلقی و بدعقیدگی کو نکال باہر کریں تاکہ اس میں علم کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔[1]

کیونکہ حدیث نبویؐ ہے کہ

" ألا وإن في الجسد مضغة: إذا صلحت صلح الجسد كله، وإذا فسدت فسد الجسد كله، ألا وهي القلب "[2]

ترجمہ: انسان کہ جسم میں ایک ٹکڑا ہے وہ درست ہو جائے تو سارا جسم صحتمند قرار پائے گا اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارے جسم کو خراب تصور کیا جائے گا۔

دنیا بھر کا نظام تعلیم اصلاح طلب ہے

دینی مدارس کے نظام تعلیم میں اصلاح کی جب بات کی جاتی ہے تو اس سے متحیر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔کیوں کہ موجودہ دور کے تمام تر ترقی یافتہ ممالک امریکہ و یورپ سمیت کے باسی اپنے ممالک میں مروجہ نظام تعلیم سے مایوس ہو چکے ہیں اور اس کو(Out of Date)کہتے نظر آتے ہیں۔جس سے یہ بات متحقق ہوتی ہے کہ دنیا بھر کے نظام تعلیم انسانی معاشرہ کی درست طور پر رہنمائی کرنے سے عاجز آچکے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ دینی مدارس کے نظام تعلیم میں اصلاح کرنے کی ضرورت ہے مگر اس کے ساتھ اس بات کا اعتراف بھی کرنا ہو گا کہ ساری دنیا کا نظام تعلیم اصلاح کا طالب ہے مگر افسوس کہ دنیا کے مروج نظام میں سیاست و معیشت کو تو پوری یکسوئی کے ساتھ دیکھا جاتا ہے مگر نظام تعلیم پر غور فکر کرنے کے لئے لمحہ کی بھی فرصت نہیں، جس کی بہتری کے لئے عمل اقدامات کیے جائیں۔[3]

نظام تعلیم اور علامہ اقبالؒ

موجودہ نظام تعلیم جمود و پرانہ پن کا جو احساس ہوتا ہے اس میں سبھی نظام تعلیم برابر ہیں ایسا نہیں کہ دینی مدارس کے نظام تعلیم میں کہنگی آگئی جبکہ عصری ادارے فرسودگی سے محفوظ ہیں اسی بنا پر علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ

ع کند مکتب رہ طے کردہ راطے

اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ علامہ اقبالؒ جب مکتب کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد صرف دینی تعلیم گاہیں نہیں ہوتیں بلکہ وہ مساجد و مدارس، سکول و کالج اور یونیورسٹی سبھی کو دانش گاہ کے طور پر لیتے ہیں۔انہی سے متعلق کہتے ہیں کہ ان میں کوئی جدت یعنی نیا پن نہیں ہے اور جو کچھ کام ہو چکا ہے اسی کو بار بار کیے جارہے ہیں(گویا سعی لاحاصل) ۔اسی لئے علامہ اقبالؒ نظام تعلیم میں(Radical Change)یعنی بنیادی انقلاب اور جرأت مندانہ اقدام اٹھانے کو ضروری قرار دیتے ہیں[4]۔برصغیر کے تعلیمی اداروں سے شکوہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ

1۔ اسلامی نظام تعلیم،ص34

2۔ الجامع الصحیح البخاری،کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدينه،رقم الحديث:52،ص:20/1

3۔نظام تعلیم،ص70

4۔نظام تعلیم،ص70-71

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذت کردار نہ افکار عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہاں
ہائے محکومی و تقلید وزوال تحقیق
خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق[1]

نظام تعلیم کے اصول

اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ فن تعلیم اور نظام تعلیم کے متعلق قابل قدر کام کیا جاچکا ہے، اصول تعلیم، نظام تعلیم کے آداب و تجربات پر کتب خانے تیار ہو چکے ہیں تاہم فن تعلیم ایک ایسا باب ہے جس پر جتنا زیادہ کام کیا جائے وہ کم ہے یہاں تک کہیں پر ماہرین تعلیم کو جمع کر کے ان سے اس پر گفتگو کرائی جائے تب بھی یہ کہنا ممکن نہیں کہ اس موضوع کا حق ادا ہو گیا ہے۔ حق کی بات یہ ہے کہ اس مسئلہ پر معلمین اور اساتذہ کرام ہی اپنے ذوق سلیم اور موضوع سے محبت اور شیفتگی اور طلبا کی نفسیات پر اس کو چھوڑنا پڑتا ہے کہ وہ خود فیصلہ کریں اور ان پر اعتماد کیا جانا چاہیے۔ استاد کو بالخصوص فن تعلیم سے فطری مناسبت اور ذوق سلیم کا حامل ہونے کے ساتھ استاد پیدا ہوا ہو۔ یعنی ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ خود استاد کو ہاتھ پکڑ کر تعلیم دینے کا طریقہ بتانے کی ضرورت پیدا ہو۔ اسی کے ساتھ استاد کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ طلبہ کو کس طرح تعلیم دی جائے؟ ان موضوع سے محبت کیسے پیدا کی جائے، مذہبی عقائد سے ان کو مانوس کیا جائے، طلبہ کے کردار کو اجلا و مثالی کیسے بنایا جاسکتا ہے، مادی و خارجی اثرات سے کس طرح محفوظ رہ کر دین وایمان کو بالادستی کے مقام پر فائز کیا جاسکتا ہے۔[2]

دینی مدارس کا معدوم اثر

دینی مدارس کی بے تاثیری سے ہر انسان غمناک ہے کہ ہر سال لاکھوں علماء وحفاظ سند تکمیل حاصل کرتے ہیں مگر معاشرہ میں ان کا کردار معدوم نظر آتا ہے کہ اسقدر زیادہ علماء حفاظ کی موجودگی میں بھی کرپشن، لوٹ مار، چور بازاری، حیاسوزی و اخلاق سے تہی دامنی کے ساتھ دین سے دوری کی بیماری انتہا کی حد تک پھیلی ہوئی ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دینی مدارس میں اصلاح و تربیت کا نظام غیر فعال ہو چکا ہے، طلبہ نقش و ورق کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں مگر روحانیت و باطنیت کی تعلیم کا انتظام مفقود ہو چکا ہے۔ اسی کو شاعر نے اہل مدارس کی جانب سے روحانیت و معنویت سے انحراف کہا ہے کہ:

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ[3]

علوم اسلامی کا زندگی سے ربط

دینی مدارس کے متعلقین کو معلوم ہے کہ ان کا تعلق نبوت محمدیؐ سے ہونے کے ساتھ ایک تعلق زندگی کے ساتھ بھی ہے کہ وہ نبوت محمدیؐ سے رہنمائی حاصل کر کے انسانی زندگی کی رہبری کا سامان کرتے ہیں۔ ایسے میں ضروری ہے کہ علماء و طلبہ اور فضلا مدارس کی زندگی میں ٹھہراو یعنی جمود

1۔ کلیات اقبال، ضرب کلیم، علامہ اقبال، ص534

2۔ نظام تعلیم، 73-74

3۔ پاجاسراغ زندگی، ص100

کا شکار ہو جانا کسی طور پر درست نہیں یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ علماء اسلام نے ہر دور میں اپنے معاشرہ کی رہبری و قیادت انجام دی ہے وہ لوگوں سے انہی کی زبان میں اور انہی کے انداز میں گفتگو کرتے تھے کہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ہم یہ حکم دیا تھا" اُمِرْنَا اَنْ نُّكَلِّمَ النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ "[1] ہمیں لوگوں کے ساتھ انکی عقل کے مطابق بات کرنے کا کہا۔ اسی بنا پر یونانی وفارسی اور ہندی علوم وفنون کے ترجمے اور ان ریاستوں کے اسلامی حدود سلطنت میں داخل ہونے کے بعد جن فتنوں نے سر اٹھایا خواہ ان کا تعلق فلسفہ، علم کلام، علم منطق، روشن خیالی، اسلامی علوم و معارف سے مایوسی، نبوت محمدؐ کے خلاف سازش فتنہ قادیانیت کی صورت میں، انگریز و استعمار وغیرہ سے ہو کا سدباب کرنے میں شیخ ابوالحسن اشعری، ابو بکر باقلانی، شیخ ابواسحٰق افرائینی، امام غزالی، ابن رشد، علامہ حافظ ابن تیمیہ، مولانا جلال الدین رومی، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا محمد علی مونگیری وغیرہ نے انسانی معاشرہ کو ہر طرح کے فتنوں سے محفوظ رکھنے اور ان فتنوں سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی۔[2]

غیر درسی کتب کا مطالعہ

دینی مدارس کے طلبہ کو جہاں مدارس کے مروجہ نصاب تعلیم سے استفادہ مکمل انہماک کے ساتھ حاصل کرنے کی ضرورت ہے وہیں پر لازم ہے کہ طلبہ کا اساتذہ سے ربط و تعلق بھی قوی تر ہو اور وہ اپنے اساتذہ کی رہنمائی ومشاورت سے تعلیمی اوقات کے علاوہ اور چھٹیوں میں اصلاح ذات، علمی و اخلاقی اور ذہنی قوتوں کو جلا بخشنے کے لئے غیر درسی کتب کے مطالعہ کا اہتمام کریں تاکہ علوم وفنون سے وسعت نظر اور گہرائی پیدا ہو سکے۔ اور ان کتب کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنانے کا موقع میسر ہو سکے۔[3]

قرآن کی براہ راست تعلیم

قرآن کریم کے ذریعہ سے انسان کی زندگی میں مثالی انقلاب بپا ہو تا ہے اور قرآن پڑھنے والا شخص کبھی مشرک نہیں ہو سکتا۔ تاہم قرآن کریم کو پڑھنے کے لئے مزاج صدیقی پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ جب وہ قرآن کریم کی تلاوت فرماتے تو ان پر رقت طاری ہو جاتی اور اسی بدولت مشرکین مکہ نے ان کو جلاوطن کرنے کی کوشش کی کہ ان کی تلاوت سن کر مرد وعورتیں ان کے گرد جمع ہو جایا کرتے تھے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھا ہے کہ ان کی علمی زندگی کا آغاز قرآن کریم سے ہی ہوا ہے کہ ان کو شیخ خلیل بن محمد یمنی سے قرآن کریم سننے اور پڑھنے کا موقع میسر آیا، شیخ خلیل یمانی پر نماز میں قرآن کریم کی تلاوت کے دوران رقت وگریہ اس قدر طاری ہو جاتا کہ بہت کم وہ سورت مکمل کر پاتے تھے۔ پھر مولانا احمد علی لاہوری سے قرآن کریم کی تفسیر پڑھی اور مولانا ابوالحسن ندویؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ مشہور مؤرخ وسیرت نگار علامہ سید سلیمان ندوی کے دروس قرآن سننے سے معلوم ہوا کہ ان سے زیادہ قرآن کریم کو وسیع و عمیق مطالعہ برصغیر ہی نہیں بلکہ تحتی براعظم میں کسی کا بھی نہیں اور پھر مولانا حمید الدین فراہی کا ذوق قرآن بھی مثالی تھا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھا ہے کہ ندوۃ العلماء میں تدریس کا آغاز قرآن کریم کی تعلیم سے کیا

1۔حَاشِيةُ الشِّهَابِ عَلَى تفْسيرِ البَيضَاوِي، المُسَمَّاة: عِنَايةُ القَاضِى وكِفَايةُ الرَّاضِى عَلَى تفْسيرِ البَيضَاوي، شهاب الدين أحمد بن محمد بن عمر الخفاجي المصري الحنفي (المتوفى: 1069هـ)، دار صادر – بيروت، ص:381/5

2پاجا سراغ زندگی، ص110-116

3۔ طالبان علوم نبوت، حصہ دوم، ص128

ii.

۔ندوۃ میں قرآن کے متن کی تعلیم دی جاتی ہے جو کہ آسان اور مفید منہج تعلیم ہے۔ قرآن کریم کا مطالعہ اپنی اصلاح کی نیت سے کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ کسی پر بالادستی جتانا درست ہے اور قرآن کریم کتاب ہدایت ہے، فہم قرآن کا دعویٰ یگانہ کسی طور درست نہیں۔ [1]

1۔ حدیث پاکستان 149 تا 151

فصل سوم

دینی مدارس کے نظام تعلیم میں ترمیم واضافہ اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل سوم

دینی مدارس کے نظام تعلیم میں ترمیم و اضافہ اور سید ابو الحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

دینی مدارس کے نظام تعلیم کی افادیت اور اصلاح طلب امور کو دیکھ لینے کے بعد ضروری ہے کہ نظام تعلیم میں جو حذف و ترمیم اور اضافہ کرنا ضروری ہے اس کے بارے میں بھی مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے افکار کا جائزہ لیا جائے۔

نظام تعلیم کی بنیاد

بحیثیت مسلمان ہم پیغمبروں کے طریقہ اصلاح و انقلاب اور طریق دعوت کو جانتے اور پہچانتے ہوئے ہم پر لازم ہے کہ سماج میں جاری نظام تعلیم و تربیت کو مؤثر بنانے کے لئے بنیادی اقدامات کریں۔ جس سے انسانی معاشرے کو راست رہنمائی مل پائے گی۔ موجودہ نظام تعلیم میں پہلا اضافہ یہ ہونا چاہیے کہ تعلیم کا نظام ایمان و یقین اور دین پر استوار ہونا چاہیے کہ بجز ان کے جو بھی نظام تعلیم متعارف کرایا جائے گا وہ وقتی ضرورتوں کی تکمیل اور ذہنی تعیش پسندی و بے عمل فلسفہ آرائی کا موجب تو ہو سکتا ہے مگر انسانی سماج کی حقیقی خدمت کرنے سے عاجز ہی رہے گا موجودہ مغرب کا نظام تعلیم کا اس سلسلہ میں تجزیاتی مطالعہ مفید ہے ثابت ہوگا۔ دوسرا اضافہ یہ ہونا چاہیے کہ خود سماج کے طبقات میں ایمان و یقین کی کیفیت کو بیدار و راسخ کیا جائے۔ جب تک معاشرہ مدرسہ اور اس کے نصاب و نظام تعلیم سے مرتبط و وابستہ نہیں ہوگا تب تک نظام تعلیم کامیابی حاصل نہیں کر پائے گا۔ کسی بھی نظام کے کامیاب ہونے کا بنیادی تقاضہ ہے کہ معاشرہ اس کی اہمیت و ضرورت اور افادیت سے کماحقہ معترف ہو اور اسی صورت میں وہ اپنے نونہالوں کو مدرسہ کے سپرد کرنے پر رضامند ہوں گے۔ اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ اگر مدرسہ اور سماج کے درمیان اتفاق نہیں بلکہ ہیجانی و بے اعتمادی کیفیت ہے تو اس کے سبب مدرسہ کے فضلاء کسی طور پر معاشرہ کی رہنمائی نہیں کر سکیں گے کہ ان کو سماج کا اعتماد حاصل نہیں ہوگا اور اگر وہ سماج سے زیادہ تعلیم یافتہ ہوں گے تو وہ خود معاشرہ کو جاہل و ناگوار کہہ کر اپنی برتری ثابت کرنا شروع کر دیں گے جو کہ نظام تعلیم کی ناکامی کا منہ بولتا مظہر ہوگا۔ نظام تعلیم میں تیسرا اہم یہ عنصر جاگزیں کرنے کی ضرورت ہے کہ طلبہ کے قلوب و اذہان میں یہ بات راسخ کر دی جانی چاہیے کہ جس سلسلہ کو وہ منتخب کر چکے ہیں معاشرے کہ تمام شعبہ جات اس کے مقابل زیر ہیں اور بڑے سے بڑا عہدہ و شعبہ اس کے مقابل کچھ بھی نہیں بلکہ تعلیم و تعلم کے شعبہ کا ابتدائی سلسلہ رب تعالیٰ سے ملانے کا موجب ہے اور اہل علم کا مقام انبیاء کے بعد سب سے بلند تر ہے جبھی طلبہ حصول علم کو سعادت مندی گردانیں گے اور ان کی تعلیم کا مقصد پیٹ بھرنا نہیں ہوگا بلکہ یہ ایک گوہر نایاب کو حاصل کرنا پر مصر ہو جانے میں فخر و سرور حاصل کرنے کیونکہ یہ دولت اب کم یاب ہو چکی ہے۔[1]

علامہ اقبالؒ نے اسی بات کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ:

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک — اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامان موت — فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم[2]

1۔ مدارس اسلامیہ، ص69-73

2۔ کلیات اقبال، بال جبریل، ص568؛ مدارس اسلامیہ، ص73

کامیاب نظام تعلیم

دنیا بھر میں رائج نظام تعلیم نقائص موجود ہیں یہاں تک اآکسفورڈ وکیمبرج کے نظام تعلیم میں کمزوریوں کا مشاہدہ کیا ہے کہ وہاں بھی قدامت پسندی کا دور دورہ ہے اور نہ ہی اس کے پاس ہوشمند مقلد موجود ہے۔ ایسے میں ضرورت اس امر کی ہے کہ عربی مدارس اور عصری اداروں کے نظام تعلیم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے اس کو ہر طرح کی گروہیت، سیاست اور معاشرے کے وقتی مفادات کے اثرات سے پاک کیا جائے کیونکہ نظام تعلیم ایک مقدس شے ہے اس کے اندر طرح کی ردو قدح کرنا، اس کی زبان پر بحث کرنا اور اس کو سیاسی میلانات میں ڈھالنے کی سعی کرنا اس کی توہین کے مترادف ہے۔ نظام تعلیم انسانی معاشرے کی زندگی کے جمیع گوشوں میں رہبری کا فریضہ ادا کرتا ہے اور یہ انبیاء کا ورثہ بھی ہے تو اس کا ماخذ و مرجع قرآن کریم ہونا چاہیے۔ ایک کامیاب اور اچھا نظام تعلیم وہی ہے جو انسان کو پاکباز، محب وطن، صاحب ضمیر و اصول پسند بنادے۔ چڑھتے سورج کی پوجا کرنے کے لئے اس میں وقت وبے وقت کی تبدیلیوں کے ذریعہ طاقت والوں کے رحم وکرم پر چھوڑنا کسی صورت قابل قبول نہیں ہو سکتا۔[1]

سکول کے قیام

انسانی معاشرہ کی درست تعلیم وتربیت کے لئے جہاں پر ضروری ہے کہ اس معاشرہ میں مسجد ومدرسہ کے ساتھ سماج کا تعلق مضبوط و مستحکم استمرار کے ساتھ قائم رہنا چاہیے وہیں پر یہ بھی ضروری ہے کہ انسانی زندگی کی ضروریات ملحہ کی تکمیل کے لئے ایسے مثالی ومعیاری سکول مساجد کے زیر سایہ قائم کیے جانے چاہئیں جہاں سے تعلیم حاصل کرنے والا نوجوان نا صرف اپنی اور اہلخانہ کی مادی ضروریات کی تکمیل کا سامان کرپائے بلکہ وہ دیگر قائم شدہ نظام ہائے تعلیم کا پوری قوت وصلاحیت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے ان سے پیش قدمی حاصل کر کے اپنی خداد صلاحیت کا رعب ان کے دلوں میں بٹھادے اور یہ نوجوان دینی وعصری تعلیم دونوں سے کماحقہ مستفید ہوئے ہوں کہ ان کو نہ تو جاہل و نا گوار سمجھا جانا لگے اور نہ ہی اس قدر بے باک ہو کہ اس کو ملحد گردان کر مسلم سماج سے منقطع کر دیا جائے۔[2]

تعلیم بالغان

اس بات کا کوئی بھی ذی شعور انسان منکر نہیں کہ معاشرے کے سبھی افراد کو تعلیم وتعلم کے خالص ماحول میں جڑ دینا ناممکن ہے تاہم اتنا ضرور ہے کہ انسانی معاشرے میں علم کی اہمیت وضرورت کو بہتر انداز سے بیان کر کے ان کے سامنے اس تجویز کو رکھ دیا جائے کہ زندگی کی گوناگوں مصروفیات میں سے کچھ وقت صبح وشام کے اوقات یا ہفتہ بھر میں سے کسی دن علم ومعرفت کی شمع کو روشن کرنے کا سامان کیا جائے اس کے لئے ضروری ہے کہ مدارس اپنے نظام تعلیم میں وسعت وکشادگی پیدا کرنے کے ساتھ ایسے بالغ افراد کے لئے مختصر مگر جامع نظام تعلیم وتربیت مرتب کریں جو مروجہ تعلیم سے زیادہ آزاد، زیادہ فطری وثمر آور بھی ہو۔[3]

1۔ نظام تعلیم، ص78-79

2۔ مدارس اسلامیہ 193 تا197

3۔ مدارس اسلامیہ، ص72

نئے نظام تعلیم کی ضرورت

مولاناسید ابوالحسن علی ندوی نے لکھاہے کہ مسلم سماج میں جو بے چینی وکسمپرسی کی کیفیت طاری ہے اس کے سدباب کا کلیدی ذریعہ یہ ہے کہ دینی مدارس کے ذمہ داران نئے نظام تعلیم کو از سرنو مرتب کریں اس میں تردد نہیں کہ یہ کام انتہائی مشکل ہے مگر اس کی ضرورت واہمیت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہ فریضہ جس قدر ممکن ہوسکے اس کو جلد مکمل کیاجائے اسی ذریعہ سے نوجوانوں کی زندگیوں میں موجود بے چینی اور اضطرابی حالات کا خاتمہ ممکن ہے۔ نظام تعلیم وضع کرتے ہوئے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ نظام تعلیم ایساہو جو مادیت پرستی، خدا سے سرکشی اور اخلاقی وروحانی قدروں سے بغاوت اور جسم کی خواہشات کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی نفی کے ساتھ انابت الی اللہ، آخرت کی فکر، انسانیت دوستی کا سبق دیتا ہو۔ تاہم اس کے ساتھ اس بات سے بھی انکار نہیں کہ مغرب کی ایجادات وتحقیقات سے بھی استفادہ کرنا انسانی حیات کو پر مسرت بنانے کے لئے ضروری ہے البتہ مغرب کے علوم وفنون میں سے صالح کو بخوشی قبول کرنے کے ساتھ مفاسد کو ترک کرنا بھی ضروری ہے۔[1]

وحدت نظام تعلیم کی ضرورت

مولانامناظر احسن گیلانیؒ نے برصغیر کے نظام تعلیم کا باریک بینی سے منصفانہ جائزہ لیتے ہوئے اس ضرورت کے احساس کو پوری قوت کے ساتھ اجاگر کیا کہ دینی مدارس کے نظام تعلیم جو کہ رائج ہے اس کو مسلم معاشرہ کی فلاح وبہبود اور تعمیر وترقی کے لئے ذریعہ بنانے کی خاطر نظام تعلیم میں وحدت پیدا کرنی ہوگی اگرچہ یہ امر بجز حکومت وقت کے پایہ تکمیل تک پہنچانا ناممکن ہے اور مسلم ممالک میں رائج نظام تعلیم اسلامی تصور کا عکاس نہیں بلکہ دنیا کے طاقتور ملکوں کے رہین منت ہے اور اس لئے نظام تعلیم کو سیکولر رکھا جاتا ہے ایسے میں مسلمان اپنے تئیں اپنے اداروں میں وحدت تعلیم کی تحریک کا آغاز کرسکتے ہیں جیسا کہ پرائمری وثانوی سطح تک بعض مدارس میں اس کو اختیار بھی کیا گیا ہے تاہم اعلیٰ درجات میں بھی وحدت تعلیم کے تصور کو فروغ دینے کی ضرورت ہے جبھی مسلم نوجوان دین ودنیا دونوں میں سماج کی حقیقی رہنمائی کرنے کے قابل ہوپائیں گے۔[2]

علم واخلاق میں تعاون

اسلام ایسادین متین ہے جو انسانوں کو جنگل وپہاڑ اور تنہائی میں بیٹھ کر معرفت الٰہی حاصل کرنے کی تعلیم دینے کی بجائے وہ انسانی معاشرہ کے درمیان موجود رہتے ہوئے اپنی اصلاح وتربیت کی تعلیم دیتا ہے، تاہم انسان کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ علم واخلاق باہم مرتبط ہو کر سفر کریں جب سے علم واخلاق میں دوری پیدا ہوئی ہے اسی وقت سے دونوں میں اعتماد کا فقدان پیدا ہوا اور دونوں ایک دوسرے سے انتہا کی حد تک جدا جدا ہو چکے ہیں ،اس عدم توازن وعدا عتماد کو توازن اور اعتماد میں بدلنے کے لیے علم واخلاق کو باہم مل کر چلانا ہوگا۔[3]

1۔ نظام تعلیم، ص33-34

2۔ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ص117-118

3۔ تعمیر انسانیت، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، ص91-92

سیرت سازی واخلاقی اصلاح

یہ مسلم امر ہے کہ دنیا بھر میں کوشش ہو رہی ہے کہ تعمیر وترقی کی منازل کو طے کرنے کے لیے کن اقدامات کو عمل میں لانا ضروری ہے اور کیسے عمل میں لایا جائے، دوسری طرف یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اس ساری جدوجہد اور کوشش میں انسانیت کی تعمیر، سیرت سازی اور اخلاقی اصلاح کا ذکر کہیں بھی نہیں ملتا جب کہ حقیقت تو یہ ہے کہ جب تک انسان اخلاق وسیرت میں پختہ وعظیم نہیں تب تک کوئی بھی تعمیر وترقی فائدہ نہیں پہنچا سکتی بلکہ دنیا میں تخریب کا یہ کاروبار یونہی پھیلتا رہے گا اس کے لئے ترقی یافتہ ملکوں کی مثال آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے کہ سب سہولیات و آسائشیں اور وسائل دستیاب ہیں مگر پھر بھی امن وراحت مفقود ہے کہ نہیں معلوم کس گھڑی ولمحہ رہزنی وڈکیتی اور اغوا کا شکار ہو جائیں۔ لہٰذا اسباب تعیش وترقی اختیار کرنے کے ساتھ ضروری ہے کہ انسان کی اخلاق واصلاح اور تعمیر سیرت کا بھی انتظام کیا جائے تاکہ اس کی زندگی کا مقصد صرف پیسہ بنانا، دولت مندی کے عفریت اور طمع ولالچ کی آگ سے نجات حاصل کرنا بن جائے۔[1]

مغرب وترقی یافتہ ممالک کردار سازی وتعمیر سیرت واخلاق سے ناکامی کی بنا پر روبہ زوال اور زندگی سے ،مایوس ہو چکے ہیں اور ان کی کیفیت کو علامہ اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے کہ:

خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح   دیکھیئے گرتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ[2]

گویا اگر مسلم ریاستیں ملک وملت کی تعمیر وترقی کے منصوبہ جات میں سیرت سازی اور اخلاقی اصلاح کو شامل کر لیں تو یہ دنیا کی بہت بڑی خدمت ہو گی۔[3]

اسلامی اقامت خانے (ہاسٹلز)

مسلم نوجوانوں کو مغربی طرز تعلیم کے مضر اثرات سے بچانے کا مؤثر ودیرپا حل تو اسی میں ہے کہ ایک نیا نظام تعلیم ترتیب دیا جائے تاہم یہ کام جتنا ضروری ہے اسی قدر مشکل بھی ہے تو ایسے میں اسلامی اقامت خانے قائم کر کے وہاں پر مسلم نوجوانوں کو رہائش وطعام وغیرہ کی سہولت بہم پہنچانے کے ساتھ ان کی دینی تعلیم وتربیت کا بہت کم خرچ میں بہتر انتظام ہو سکتا ہے بنسبت اسلامی سکول وکالج کے قیام کے جن پر دوگنا خرچ ہوتا ہے اور اثرات بھی مفید مرتب نہیں ہوتے۔ غیر مسلم ممالک میں اسلامی اقامت خانوں کی اہمیت دوچند ہے۔ ان اقامت خانوں میں نوجوانوں کے عقائد ،عبادات، معاملات اور اخلاقی تربیت کا بااحسن انتظام کیا جا سکتا ہے۔[4]

جسمانی تربیت

دینی مدارس کے نظام تعلیم کے اہم عناصر میں سے ایک اہم عنصر یہ بھی ہے کہ دینی مدارس کو اپنے طلبہ کے لیے تعلیمی، ذہنی واخلاقی اور مذہبی تربیت کے ساتھ جسمانی تربیت پر بھی توجہ دینا ہو گی۔ کامیابی وکامرانی اور یکسانی کے کے ساتھ تعلیم زمانہ کو مکمل کرنے اور مستقبل میں زندگی کی

1۔ تعمیر انسانیت، ص135

2۔ کلیات اقبال، بال جبریل، ص497

3۔ تعمیر انسانیت، ص136

4۔ اسلامیت ومغربیت کی کشمکش، ص254-255

گنج لکوں میں شامل ہونے اور دعوتی و اصلاحی ذمہ داریوں کو سر انجام دینے کے لئے اچھی صحت اور جسمانی تربیت اور قوت برداشت کی اشد ضرورت ہے۔ دینی مدارس چونکہ اسلام کے قلعے ہیں تو ان قلعوں سے نکلنے والے افراد علمی و فکری اور جسمانی طور پر مکمل طور پر مصلح ہونے چاہیے تا کہ بہتر انداز سے دین کی اشاعت و دعوت کا فریضہ انجام دی سکیں۔ اس سلسلہ میں حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور تحریک سنوسی کے علماء ومشائخ کی سیرتوں کا مطالعہ نہایت مفید اور نمونہ عمل ہے۔[1]

تعلیم وتربیت اور ورزش

برصغیر کے نظام تعلیم میں طلبہ کی روحانی و ذہنی تربیت کے ے ساتھ جسمانی تربیت کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا، امیر الروایات میں حضرت شاہ عبد العزیزؒ اور ان کے زمانہ کے ایک شخص کا مکالمہ درج ہے، شاہ صاحب نے اس سے پوچھا کہ آپ نے قرآن پڑھا ہے؟ اس نے کہاہاں، آپ نے پوچھا کہ فارسی بھی پڑھی ہے؟ وہ بولاہاں، پوچھا عربی بھی پڑھی ہے؟ اس نے کہا جی ہاں میر قطبی تک پڑھی ہے، میر قطبی تک پڑھنے والے طالب علم سے آگے دریافت کیا جاتا ہے کہ گھوڑے کی سواری بھی سیکھی ہے؟ اس نے کہاہاں، پھر پوچھ فن سپہ گری بھی سیکھے ہیں اس نے کہا جی ہاں۔ مولانا آزاد علی بلگرامی سے متعلق لکھا ہے کہ مرہٹوں کے مقابلہ کے لئے قلم پھینک کر ذوالفقار حیدری کھینچ کر میدان میں کھڑے ہو گئے، مولانا احمد شرعی جامع علوم شرعیہ و عقلیہ ہونے کے ساتھ بہترین تیر انداز بھی تھے، حضرت شیخ الھند بندوق کا بہترین نشانہ لگاتے تھے۔ یہ صورت حال دیگر علماء سلف کی تھی اب نصاب و نظام تعلیم اس قدر جامد ہو گیا کہ وہ چادر و چہار دیواری میں بند ہے۔[2]

مادیت پرستی کے حملے

برصغیر میں دینی مدارس کی بنااور اس کے نظام تعلیم کو اس لئے رواج دیا گیا کہ مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کے حملوں سے مسلم معاشرہ کو بچایا جاسکے۔ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں ایمان بالغیب اور نبی اکرمؐ کی رسالت کی عالمیت و عمومیت پر سوال اٹھائے جانے کی بجائے مادہ پرستانہ زندگی اور محسوسات چیزوں کے مظاہر سے مسلمانوں کو ذہنی و فکری اور معنوی طور پر مرتد بنانے کا کام لیا جائے گا۔ ایسے میں دینی مدارس کے نظام تعلیم پر لازم ہے کہ وہ طلبہ میں صلاحیت و جستجو پیدا کردے کہ وہ صحیح میدان عمل کا انتخاب کرنے میں کوشاں ہو جائیں۔ جیسا کہ ماسلف اکابرین نے مغل سلطنت کے زوال کے وقت اس گرتی ہوئی حکومت کو سہارا دینے پر توجہ مرکوز کرنے کی بجائے اسلامی علوم وفنون اور اسلامی تہذیب کے ساتھ خود کو مضبوطی سے منسلک کر دیا کیونکہ حکومت تو روبہ زوال چیزوں میں سے ہے مگر اسلامی تعلیمات تا یوم حساب تک غیر متبدل ہیں اور مکمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **"لایاتیه الباطل من بین یدیه ولامن خلفه"**[3] اور ارشاد جل شانہ یہ بھی ہے کہ **"الیوم اکملت لکم دینکم**

1۔ مدارس اسلامیہ، ص39

2۔ پاک وہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ص225؛ ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ ص101-102

3۔ سورت حم سجدہ۔42/41

واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا"[1] ۔دینی مدارس کے نظام تعلیم سے یہی امر مطلوب ہے کہ دین مدارس کے فضلا اور متعلقین کا ایمان وایقان اسلامی علوم کی حفاظت اواسلامی تہذیب کا احیاء اور اس کے ساتھ وابستگی کو پر اعتماد طور پر قائم رکھا جائے۔[2]

1۔سورت المائدہ،3/5

2۔پاجاسراغ زندگی،ص132-133

باب چہارم

دینی مدارس کے اساتذہ کے کردار کے بارے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل اول: دینی مدارس کے اساتذہ کا مطلوبہ کردار کے بارے میں سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل دوم: دینی مدارس کے اساتذہ کی علمی و اخلاقی صفات کے بارے میں سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل سوم: دینی عصر حاضر میں اساتذہ کی ذمہ داریاں اور سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل اول

دینی مدارس کے اساتذہ کا مطلوبہ کردار اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل اول

دینی مدارس کے اساتذہ کا مطلوبہ کردار اور سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ

اللہ جل شانہ نے انسان کو تخلیق فرمانے کے بعد جب اسے حکم عدولی کے باعث دنیا میں منتقل فرمایا تو انسان اپنی ہم جنس کے ساتھ دست و گریبان ہونے کے ساتھ اپنے مقصد تخلیق سے غافل ہو چکا تھا۔ رب کریم نے اسی لئے انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا سلسلہ جاری رکھا جو انسان کو اس کی اصل حقیقت اور اس کی ذمہ داریوں سے روشناس کرتے رہیں۔ ہادی عالمؐ کی بعثت کے بعد نبوت و رسالت کا در بند ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہؐ کے ذمہ یہ بار گراں ڈال دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ " **العلماء ورثة الأنبياء** "[1] علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ اسی بناء پر علماء اسلام کا مطلوبہ کردار یہ مقرر ہوا کہ وہ پہلے خود کو دین حق پر قائم رہیں" **الَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ** "[2] (بیشک دین صرف اللہ ہی کا ہے) اور پھر دوسروں کو اس کی تعلیم دیں" **وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ** "[3]۔ (اللہ کے دین پر ہو جاؤ)۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کی بعثت سے متعلق آپؐ کو مخاطب فرماتے ہوئے کہا ہے کہ " **وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ** "ہم نے آپ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اس کو یہی حکم دیا کہ میرے سوا کسی کی بندگی نہیں، پس میری عبادت کرو۔[4]

شرک

اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داری انبیاء کی مقرر کی تھیں علماء اسلام کی بعینہٖ وہی ذمہ داریاں ہیں۔ علماء پر لازم ہے ہر وہ شئے جو غلبہ دین کے راستے میں حائل ہو ان کو خس و خاشاک کی طرح زائل کر دیں۔ عوائق دین میں شرک، کفر، جہالت اور غفلت سے نبرد آزمائی کرنا علماء پر ضروری ہے۔ شرک سے بیزاری کا اعلان اس لیے کرنا ضروری ہے کہ انسان کی زندگی میں پیش آمدہ ہر ضرورت و مسئلہ کا علاج ماسوائے رب کریم ممکن نہیں۔ اگر کوئی شخص اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت، کسی سے حاجت براری طلب کرنا شرک ہے اور شرک کو سب سے بڑا ظلم اور گناہ قرار دیا گیا ہے۔ جو انسان توحید کو ترک کر دیتا ہے اس کی زندگی میں سکون اور اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم میں ارشاد باری ہے " **إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا** "[5] (بیشک اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا شرک کرنے والے کو، کیونکہ شرک بہت بڑا گناہ ہے)۔ شرک سے بیزاری اس لئے ضروری ہے کہ شرک ایک مستقل دین اور ایک مکمل حکومت ہے اور اس کا اور دین اللہ کا کسی ایک جسم یا دل و دماغ یا خطہ زمین پر ایک ساتھ قائم ہونا ناممکن ہے، یہ غیر الٰہی دین جسم و نفس اور جسم و نفس سے خارج اتنی ہی جگہ گھیرتا ہے جتنی دین اللہ کو کم سے کم درکار

1۔سنن الترمذی، ابواب العلم،باب ماجاءفی فضل الفقه العبادة،رقم الحدیث: 2682،ص:48/5

2۔سورت الزمر،3/39

3۔سورت البقرة،193/2

4۔سورت الانبیاء،21/25

5۔سورت النساء،48/4

ہے:" وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ "[1](بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ کے برابر اوروں کو بناتے ہیں، ان کو محبت ایسی رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ کی)[2]۔

کفر

دین حق کے راستے میں جو موانع پیش آتی ہیں ان میں پہلا شرک، دوسرا مسئلہ کفر، تیسرا جہالت اور چوتھا غفلت ہے۔ دین اسلام جو غلبہ حق کے لئے بھیجا گیا ہے۔اس کے راستے میں دوسری رکاوٹ کفر ہے۔ کوئی شخص اللہ کے دین اور شریعت اسلامی کا انکار کرے خواہ مکمل شریعت سے بد اعتمادی یا کسی بھی رکن کا انکار کرے تو وہ انسان اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔اسی لئے ارشاد باری تعالیٰ ہے" أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَٰبِ وَ تَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ"[3]۔ترجمہ: کیا کتاب الٰہی کے ایک حصہ کو مانتے ہو، دوسرے حصہ کو نہیں مانتے، تو اس کی کیا سزا ہے جو تم میں سے یہ کام کرتا ہے سوائے دنیا کی زندگی میں رسوائی کے، اور قیامت کے دن پہنچائے جائیں سخت سے سخت عذاب میں اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔ کفر چونکہ ایمان کا مقابل ہے تو لازم آتا ہے کہ اللہ کی حاکمیت کا اعتراف کیا جائے اور اس کے ماسوا سب حاکموں کی بالا دستی کا انکار ضروری ہے جس کو قرآن میں بیان کیا گیا ہے "فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ"[5]ترجمہ: جو سرکش کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، اس نے مضبوط حلقہ پکڑ لیا۔[6]

علماء کرام اور مدارس کے اساتذہ کی ذمہ داریوں میں ایک اہم عنصر جاہلیت کا مقابلہ کرنا بھی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر وہ عمل جس کا ثبوت شریعت کے مصادر سے نہ ہوتا ہو برابر ہے کہ یہ عمل رسوم و رواج یا زمانہ قدیم کے غلط تصورات پر مبنی ہو یا پھر عصر حاضر میں مغربی تہذیب کی اسیری کی شکل میں، تمام اقسام کی جاہلیت کی بیخ کنی کرنا علماء کی ذمہ داریوں میں سے ہے۔ جاہلیت کے زیر اثر عصبیت قومی کا بھی ظہور ہوتا ہے۔ گویا علماء اسلام کی ذمہ داری میں سے ہے کہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں پر غیر متزلزل ایمان لانا چاہیے اور ماسوائے شرعی احکامات کے تمام عادات واطوار کو ترک کرنے کی تلقین کرنا ہوگی۔ بخاری شریف کی حدیث کا بھی یہی مفہوم ہے کہ:

" ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ، أَنْ يَكُونَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلَّهِ، وَأَنْ يَكْرَهَ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ "[7]

1۔سورت البقرۃ،165/2

2۔ علماء کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں، ص16

3۔سورت البقرۃ،85/2

4۔ طاغوت ہر وہ ہے جس کی خدا کے مقابلہ میں اطاعت مطلق کی جائے "الطاغوت عبارۃ عن کل متعدّ وکل معبود من دون اللہ"(معجم مفردات ألفاظ القرآن للراغب الأصفہانی) خواہ وہ شیطان ہو یا سلطان یا معمولی انسان۔۔ہندوستانی مسلمان، ص18

5۔سورت البقرۃ،256/2

6۔ علماء کا مقام، ص19

7۔الجامع الصحیح البخاری ،کتاب الایمان،باب حلاوۃ الایمان،رقم الحدیث : 16،ص:12/1

ترجمہ: تین باتیں جس شخص میں ہوں گی اس کو ایمان کی حلاوت محسوس ہو گی، ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ان کے ماسواسے زیادہ محبوب ہوں، دوسرے یہ کہ کسی دوسرے انسان سے صرف اللہ ہی کے لیے محبت ہو، تیسرے یہ کہ کفر میں جانا اس کے لیے اتنا ہی ناگوار ہو جتنا آگ میں ڈالا جانا۔

بدعت

شریعت اسلامیہ کے غلبہ میں حائل ایک رکاوٹ بدعت ہے۔ بدعت کے خلاف بھی علماء کو اپنا کردار کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ بدعت کفر و شرک کے بعد سب سے بڑی برائی ہے۔ بدعت ہر اس عمل کو کہا جاتا ہے جس کا حکم اللہ اور اس کے پیغمبرؐ نے نہ دیا ہو اور اس کو دین میں شامل کر لیا گیا ہو۔ اگر شرک و کفر مستقل دین ہے تو بدعت ایک مستقل شریعت ہے جس کو اسلام میں کسی طرح اجازت نہیں دی جاسکتی۔ شریعت اسلامیہ کی تکمیل تو اللہ تعالیٰ نے کر دی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد جل وعلاہے کہ "**الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا**"[1]۔ ترجمہ: میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی، اور اسلام کو بطور دین کے تمہارے لیے پسند کیا۔ بدعتی اس قدر شدید گناہ ہے کہ امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ بدعتی انسان اصل میں نبی مکرمؐ پر بد اعتمادی کا اظہار کرتا ہے کہ آپؐ نے شریعت کو مکمل طور پر لوگوں تک نہیں پہنچایا جبھی وہ دین میں بدعات کی داغ بیل ڈالتا ہے۔[2] بدعت کی مذمت میں آقائے نامدارؐ نے بھی ارشاد فرمایا تھا کہ

" **وَشَرُّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ** "[3]

ترجمہ: اور بدترین بات دین میں نئی بات ایجاد کرنا ہے، اور ہر نئی ایجاد کردہ چیز بدعت ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے، اور ہر گمراہی جہنم میں ہو گی۔[4]

غفلت

شریعت کے راستے میں حائل ہونے والی سدود میں سے ایک سد غفلت بھی ہے۔ اور علماء کرام کا فرض منصبی ہے کہ وہ لوگوں کو اس بد فطرت عادت سے دور رہنے کی تلقین کریں۔ کیونکہ غفلت ایک ایسا جرم ہے جو کفر و شرک اور بدعت سے بھی زیادہ پر اثر اور نقصان دہ ہے۔ یعنی انسان بظاہر مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے مگر وہ عمل کی دنیا میں لاپرواہی و کوتاہی اور غفلت سے کام لے کر انسانوں میں بے عملی کے فروغ کا ذریعہ بن جاتا ہے، ایسے کردار کے مضمرات میں اضافہ اسوقت ہو جاتا ہے جب بے عمل اور غافل و کاہل انسان معاشرے میں کلیدی مناصب (حکومت و امارت) حاصل کرلے اور اس کی بے عملی پر مبنی زندگی اس قدر پر اثر ہو جاتی ہے کہ اس کے مخالف ہر عمل کو خلاف اسلام تعبیر کیا جاتا ہے، یہی نہیں بلکہ غافل انسان جو مال و زر کی محبت کا اسیر، اور مادیت و محسوسات کی محبت میں محو ہو چکا ہوتا ہے اس کے اس طرز عمل کو بادل ناخواستہ اسلامی تہذیب و تمدن کا نام تک دیا جانے لگتا ہے۔ قرآن کریم میں غفلت کا ارتکاب کرنے والوں کو شدید وعیدوں سے خبردار کیا گیا ہے۔ "**و لا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا**

1۔سورت المائدہ، 3/5

2۔ الاعتصام للشاطبی، دوسرا باب بدعت کی مذمت کے بارے میں۔

3۔المجتبى من السنن = السنن الصغرى للنسائي، أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (المتوفى: 303ھ)، المحقق: عبد الفتاح أبو غدة، مكتب المطبوعات الإسلامية – حلب، 1406 – 1986، كتاب الصلاة العيدين، كيف الخطبة، رقم الحديث:1578، ص:188/3

4۔ علماء کا مقام، ص33

اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ أُوْلَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ[1]"۔ ترجمہ: ان لوگوں کی طرح نہ ہو جنہوں نے اللہ کو بھلادیا، اللہ نے ان کو خود فراموش بنادیا۔ اسی طرح ارشاد جل وعلا ہے کہ " **إِنَّ الَّذِينَ لاَ يَرْجُونَ لِقَاءنَا وَرَضُواْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّواْ بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ**"[2]۔ بے شک جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی میں مگن اور مطمئن ہیں، اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔ قرآن کریم میں اسلامی تعلیمات کو فراموش کر دینے والے اور منہ موڑنے والوں کو اللہ تعالیٰ بھی بھلادے گا۔"**قَالَ كَذَلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا وَكَذَلِكَ الْيَوْمَ تُنْسَى**"[3] ترجمہ: کہا (اللہ نے) اسی طرح تمہارے پاس ہماری نشانیاں آئیں تھیں تم نے ان کو (غفلت میں) بھلا دیا اور بعینہٖ آج کے دن تم کو بھلا دیا گیا ہے۔ علماء کرام نے اپنی ذمہ داری و فرائض کو ادا کرنے میں انبیاء کرام کی نیابت کو مستحضر کرنا ہے، اور انسانی معاشرے سے دین کے بارے میں غفلت ولاپرواہی اور ہمہ جہتی برائیوں کا سدباب کرنا ہے، جبھی ان کا مطلوبہ کردار بہتر طور پر اپنے انجام کو پہنچے گا۔[4]

علماء کرام کا صبر واستقامت

علماء کرام ہی وہ طبقہ ہے جس نے چودہ سو سال سے دین کو اصل حالت میں برقرار رکھوانے میں لازوال محنت صرف کی۔ شریعت اسلامیہ کی تبلیغ اور نشرواشاعت میں علماء کرام بلاخوف وخطر سے مصروف عمل رہے۔ انبیاء کرام کے سلسلہ کے ختم ہو جانے کے بعد علماء کو یہ کلیدی ذمہ داری ملی ہے کہ سماج سے کفر وشرک، الحاد ولادینیت، بدعات وانحرافات اور غفلت وجہالت کا مقابلہ کرنا ہے اور علماء نے اپنے اس کردار کو برابر وعد و وعید کے باوجود انجام دیا کہ حکمرانوں کی چیرہ دستیوں کا عزم مصمم سے مقابلہ کیا۔ رسول اکرمؐ کا ارشاد عالی شان ہے کہ "**لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي قَائِمَةً بِأَمْرِ اللَّهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ**"[5]۔ ترجمہ: میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر علانیہ قائم رہے گا، کسی کے مدد نہ کرنے سے اس کو کچھ نقصان نہ ہوگا۔ علماء کرام جہاں پر دین کی دعوت اور نشرواشاعت کا انتظام کرتے ہیں وہیں پر فریضہ جہاد کی ادائیگی کے لئے سرفروش بھی رہتے ہیں۔ رسول اللہؐ کا فرمان ہے "**الْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِي اللَّهُ إِلَى أَنْ يُقَاتِلَ آخِرُ أُمَّتِي الدَّجَّالَ ، لَا يُبْطِلُهُ جَوْرُ جَائِرٍ وَلَا عَدْلُ عَادِلٍ** "۔[6] ترجمہ: جہاد اس وقت سے جاری ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا، اور میرے آخری امتی کے دجال سے جنگ کرنے تک جاری رہے گا، اسے نہ تو کسی ظالم کا ظلم ختم کرے گا اور نہ ہی کسی عادل کا عدل۔[7]

1۔سورت الحشر، 19/59

2۔سورت یونس، 7/10

3۔سورت طٰہٰ، 146/20

4۔ علماء کا مقام، ص36

5۔ مسند الإمام أحمد بن حنبل، أبو عبد الله أحمد بن محمد بن حنبل بن هلال بن أسد الشيباني (المتوفى: 241هـ) ، المحقق: شعيب الأرنؤوط - عادل مرشد، وآخرون ، إشراف: د عبد الله بن عبد المحسن التركي ، مؤسسة الرسالة ، 1421 هـ - 2001 م ، بقية حديث معاوية بن قرة ،رقم الحديث ، 15596،ص:365/24

6۔ سنن ابی داؤد،باب فی الغزو مع أئمة الجور،185/4

7۔ علماء کا مقام، ص41

علماء قبلہ نما ہوں

دینی مدارس کے اساتذہ وفضلاء مدارس کو معاشرہ میں قبلہ نما کی سی حیثیت حاصل ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات میں انسانی اور مسلم معاشرہ کی فلاح وبہبود اور اصلاح کا برابر انتظام جانفشانی سے کرتے ہیں اور ہر طرح کے خوف وخطر سے بالاتر ہو کر معاشرہ کو صراط مستقیم پر گامزن کے مشن پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ علماء کرام کی ذمہ داری مثالی ہے کہ وہ مسلم معاشرے میں کلیدی ذمہ داری اور اہم کردار کے حامل ہیں کہ جیسے قبلہ نما سرد و گرم موسم اور سواری کے رخ کے بدلنے کے باوجود قبلہ کی سمت کا تعین کر دیتا ہے بعینہ اسی طرح مسلم معاشرے میں علماء کو اہمیت حاصل ہے کہ وہ معاشرے کی ہر حاجت وضرورت کا حل ذمہ داری کے ساتھ پیش کریں۔[1]

ارتداد کا مقابلہ

علماء کرام کے مطلوبہ کردار میں اسلامی معاشرے میں پنپنے والے ارتداد کی سرکوبی بھی شامل ہے۔ برصغیر میں اسلام کی دعوت کے پہنچنے کے بعد تعلیم وتربیت کا مناسب انتظام کرتے ہوئے علماء کرام نے قریہ قریہ بستی بستی اور ہر گاؤں میں اسلامی تعلیمات کو روشناس کرنے کے حلقے قائم کر کے قولی اور عملی ارتداد کا سدباب کر دیا۔ باوجود اس کی کہ تمام تر کوشش کے باوجود اب بھی مسلمانوں کی بڑی تعداد زمانہ جاہلیت کے تصورات کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے اور رسوم ورواج، بدعات وخرافات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا چکی ہے۔ تاہم علمائے ربانین نے اپنے وقتوں میں، اپنے علاقوں میں اس بات کو یقینی بنانے کی ہر ممکن سعی کی ہے کہ لوگ ان کی تبلیغ ونصیحت کو قبول کرتے ہوئے پابند شریعت اور عامل قرآن وسنت ہو جائیں اور کفر و شرک اور بدعات کی گمراہی سے نجات حاصل کر لیں۔ یہی وہ تبلیغی واصلاحی فریضہ وعمل ہے جس کو انبیا کرام کے طریق کار سے نسبت ہے۔ اور اس عمل کی اہمیت وضرورت کسی صورت علماء کی دیگر ذمہ داریوں سے کم نہیں ہے۔[2]

اشاعت علم دین

قرآن و حدیث کے نور میں اس قدر قوت اور طاقت ہے جو سخت سے سخت گمراہی و ظلمت میں ڈوبے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کر سکتا ہے، اس کے ذریعہ سے کفر وشرک، بدعت وغفلت سمیت ہمہ جہتی بدیوں کو مٹایا جا سکتا ہے۔ اسی لیے علماء کرام پر لازم ہے کہ وہ قرآن وسنت کی نشر واشاعت کا انتظام کریں۔ انبیاء کرام کی صفت رہی کہ وہ ہر آن اور ہر گھڑی انسانیت کو اللہ کی طرف لوٹنے کی دعوت دیتے تھے، قرآن کریم میں ارشاد باری عزوجل ہے کہ " **يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ** "[3]۔ (ترجمہ: اے میری قوم اللہ کی بدنگی کرو، تمہارا معبود اس کے سوا کوئی نہیں)۔ حضرت نوحؑ شب وروز، خفیہ اور علانیہ طور پر دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دیتے رہے، قرآن میں ارشاد جل شانہ ہے کہ "**رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا** "[4](ترجمہ: اے میرے رب میں اپنی قوم کو رات و دن بلاتا رہا)۔ پھر ارشاد ہوا کہ "**ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا، ثُمَّ اِنِّيْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَ**

1۔ علماء کا مقام، ص45

2۔ علماء کا مقام، ص41

3۔سورت ھود، 50/11

4۔سورت نوح، 5/71

أَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا "[1]۔(ترجمہ: پھر میں نے ان کو بلایا برملا، پھر ان کو کھول کر اور چھپ کر کہا، چپکے سے۔) اب یہی علماء کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ درس و تدریس، وعظ و تذکیر اور تصنیف و تالیف اور تصوف و سلوک کے ذریعے معاشرے میں خیر کی دعوت کو عام کریں۔ واضح رہے اصلاح و تعمیر معاشرہ کی تمام جدوجہد انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ سے فعال کرنے کی حاجت و ضرورت ہے۔ تاکہ حقیقی معنوں میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والا معاشرہ تشکیل پاسکے۔[2]

ذہنی تشکیل و تعمیر سیرت

دینی مدارس کے اساتذہ کے کاندھوں پر بھاری ذمہ داری عائد ہے کہ وہ خود اپنے تیئں اور پھر اپنے ذریعہ سے طلبہ و اہل دین میں دین اسلام کی بنیادی فکر کو اس انداز سے راسخ کردیں کہ زندگی کی پر آشوب ظلمت بھری آندھیوں کے جھونکے ان کے عقائد و نظریات کو متزلزل نہ کرسکیں۔ چونکہ مسلم معاشرہ کی کامل طور پر رہبری کا فریضہ طبقہ علماء ہی ادا کرسکتا ہے خواہ اس کے لئے کتنی بھی قربانیاں ادا کرنی نہ پڑ جائیں۔ اسی بنا پر امام محمد غزالیؒ نے احیاء العلوم میں ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اپنے زمانہ کے علماء اور طلبا کو جو غیر ضروری علوم کے اکتساب میں مصروف تھے ان کو علم طب کے حصول کی جانب ملتفت کیا کہ اس پیشہ کو اختیار کرنے والے یہودی و نصرانی اور ملحد اطباء کے مسلمان محتاج اور ان کی فکر کے اسیر بن جانے کا قوی اندیشہ موجود ہے۔ اسی لئے علماء کرام کو اکتساب علم میں ہر اہم اور ضروری علم سے استفادہ کرنے میں لیت و لعل سے کام نہیں لینا چاہیے البتہ علوم و فنون کا بنیادی مقصد اسلام و مسلمانوں کی خدمت ہونا چاہیے۔ قرآن کریم نے بھی مسلمانوں کو اس بات کی تلقین کی ہے کہ " و اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ "[3]اس کے ساتھ علماء کرام کو تعمیر سیرت پر بھی بنیادی توجہ دینا ہوگی کہ دینی مدارس کے متعلقین ہی میں یہ امتیازی صفت موجود ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاق وصفات کے پیکر اور اچھے کردار کے حامل اور استغناء و خودداری کے مرقع ہوں۔ دین اسلام کی دعوت کا فریضہ انجام دینے والوں کے لئے جن امتیازی صفات کی ضرورت ہے وہ اہل مدارس ہی میں بہم موجود ہیں البتہ اس میں مزید بہتری و پختگی لانے کی ضرورت ہے تاکہ مسلمانوں کی قیادت و رہنمائی کا حق ادا ہو سکے۔[4]

صحابہ کرام کا انداز تعلیم

صحابہ کرامؓ معاشرت کے احکام، اخلاق و عادات کی تعلیم اس انداز سے حاصل کرتے اور دوسروں کو منتقل کرتے تھے جو فطری و طبعی طریقہ ہے یعنی وقفہ وقفہ سے نصیحت کرنا اور تھوڑا تھوڑا علم حاصل کرنا چنانچہ صحابہ کرام کی یہ امتیازی صفت تھی کہ انہوں نے علم حاصل تو زیادہ نہیں کیا مگر اس میں گہرائی حاصل کرنے کے ساتھ باآسانی عملی طور پر اختیار ضرور کیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے قلوب و اذہان اس علم کو قبول کرنے میں مانع نہیں ہو پائے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے ان کے شاگردوں نے تقاضہ کیا کہ وہ ان کو روزانہ تعلیم دیا کریں تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ رسول

1۔سورت نوح،71/8-9

2۔ علماء کا مقام، ص43

3۔سورت الانفال،60/8

4۔ مدارس اسلامیہ، ص24-30

اللہﷺ ہمیں ایک دن تعلیم دیتے اور دوسرے دن ناغہ کرتے اور پھر تیسرے دن تعلیم دیتے تھے۔[1] اسی طرح سیدنا علیؓ کا قول بھی ہے کہ لوگوں سے ان کی عقل و فہم کے مطابق بات کیا کرو، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ اللہ ورسولؐ کی باتوں کو جھٹلانے لگیں۔[2]

1۔الجامع الصحیح البخاری،کتاب العلم، باب من جعل لأهل العلم أياما معلومة ،رقم الحديث: 70،ص:25/1

2۔ مدارس اسلامیہ، ص63

مبحث ثانی: آزاد ملک میں علماء کا مطلوبہ کردار اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ

علماء کرام کا مقام و منصب جس قدر عالی ہے اسی قدر بہت نازک اور حساس بھی کہ انسانی معاشرہ انہی کے دم قدم سے آباد اور شاد بھی ہوتا ہے اور انہی کے نقش قدم پر چل کر اسفل السافلین کی گہرائیوں میں بھی جا گرتا ہے۔ علماء کرام کا کردار چونکہ نیابت انبیاء کو سنبھالنے کا ہے تو انبیاء اور جانشین انبیاء کی سیرت و کردار سے مانوسیت کا ہونا بھی از حد ضروری ہے۔ گویا زندگی کے کسی گوشہ میں جب کبھی شریعت کے اصولوں میں ترمیم و اضافہ کی کوشش کی جارہی ہو تو کردار سیدنا صدیق اکبرؓ علماء کہ پیش نظر ہونا چاہیے کہ جب انہوں نے فرمایا تھا "اینقض الدین و انا حی" (دین میں ترمیم و نقص کر لیا جائے اور میں زندہ ہوں) یعنی خلیفہ بلافصل جانشین پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد مصطفیؐ امیر المؤمنین سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے ان الفاظ میں یہ پیغام دیا ہے کہ میرے جیتے جی دین میں قطع و برید نہیں ہو سکتی۔ بعینہ یہی صفت و کردار علماء اسلام کا بھی ہونا چاہیے۔ ایک آزاد ریاست میں علماء کرام کے مطلوبہ کردار کے کیا خدوخال ہونے چاہیں ان کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتب کی روشنی میں اجمالی طور پر ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ تاکہ دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ اور متعلقین مدارس ان صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔[1]

خود احتسابی

اسلام میں خود احتسابی کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اور عمل احتساب کی اہمیت اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب اس کا تعلق حکام و امراء اور علماء کے ساتھ ہو۔ احتساب کے عمل کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی معاشرہ گمراہی و ظلمت کی راہداریوں سے مامون رہتا ہے اور بادل ناخواستہ انسانی معاشرہ سے حمیت دینی اور خود احتسابی کا عمل مفقود ہو جائے تو پھر وہ معاشرہ خاموش موت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ احتساب کی اہمیت کا بیان قرآن و سنت میں بکثرت موجود ہے۔ عمل احتساب سے انحراف کے مضمرات سے تاریخ کے صفحات عیاں ہیں کہ بخارا و سمرقند اور اندلس سمیت مسلمانوں کی حکومتوں کے خاتمے کہ پیچھے اسی عمل کے مفقود ہو جانے کا اہم حصہ ہے۔ مسلم معاشرہ میں جب، علماء کا باہمی اختلاف، علماء کا عوام سے رابطہ منقطع، لوگوں کے دلوں میں مال و زر کی اندھی محبت، معاشرے کی جانب سے اخلاقی صفات سے تہی دامنی، حب جاہ و منصب اور اشاعت اسلام کے فریضہ سے روگردانی اختیار کی تو پھر مدینۃ الزہراء اور قلعہ الحمراء کی تاریخ المناک جنم لیتی ہے، اسی طرح بخارا و سمرقند کی تاریخ بھی عبرت ناک تاریخ سے عبارت ہے۔ یہ تمام صفات رذیلہ اسی وقت پنپتی اور پھلتی و پھولتی ہیں جب معاشرہ میں بالعموم اور علماء میں بالخصوص خود احتسابی کا عمل مفقود ہو جائے۔[2]

مذہبی و سیاسی انتشار

کسی معاشرہ کو توڑنے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اس میں مذہبی اور سیاسی انتشار و تفریق کو فروغ دیدیا جائے۔ ایسے وقت میں علماء کرام کا کردار ایمان و احتساب کے ساتھ بڑھ جاتا ہے کہ وہ مسلم معاشرہ کے بنیادی خدوخال میں واقع ہونے والی اس اہم خرابی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ علماء کرام کو مذہبی و سیاسی انتشار و اختلافات سے امت کو نکالنے کے لئے کسر نفسی سے کام لینا ہو گا، کیونکہ فروعی مسائل کو بنیاد بنا کر جو مباحث علمی ہیں ان

1۔ علماء کا مقام، ص119

2۔ تحفہ پاکستان، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام، کراچی، پاکستان، ص68-69

کو جب معاشرہ کے عوام الناس کے سامنے بیان کیا جاتا ہے، اور اپنی فہم و فراست علمی کو دوسرے پر مسلط کرنے کی سعی کی جائے گی تو اس کا بدیہی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسانی معاشرہ مضطرب اور متحارب ہو جاتا ہے۔ یہ عمل مسلم معاشرہ کی ہلاکت کا موجب بن جائے گا۔ مثلاً قیام پاکستان کے حوالے سے یہ لڑائی چل رہی ہے کہ اس ملک کو ہم نے آزاد کرایا اور اس پر اقتدار کا حق بھی ہمارا ہے۔ عقائد و فقہ کے باب میں معمولی اختلاف کی وجہ سے مد مقابل دو کانفرنسیں سیرت النبی پر محمد رسول اللہ اور یار سول اللہ الگ الگ کانفرنسیں منعقد کی جاتی ہیں۔ ایسے میں علماء کرام کو ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے کردار کو پیش نظر رکھیں کہ انہوں نے اپنے زمانے میں کس طرح مرہٹوں کی بیخ کنی اور دین اکبری کے سدباب کے لئے بے لوث کردار ادا کیا کہ ان کو اس سے تعلق نہیں رہا کہ مسلم معاشرہ کی فلاح و صلاح کا کام ہو جائے اور اس کا سہرا ان کے سر سج جائے۔[1]

عوام سے ربط و تعلق

علماء کرام کو عوام الناس سے مرتبط رہنے کی ضرورت ہے، ہندوستان کے علماء کا معاشرے سے رابطہ مستحکم و مضبوط نظر آتا ہے۔ علماء علمی و عملی میدان میں پیش قدمی کر رہے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ بھی علماء کی خدمت کے معترف ہیں۔ علماء پر عوام الناس کو اس قدر اعتماد ہے کہ وہ علماء کو علمی و ادبی مجالس میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔ بعینہٖ اسی طرح آزاد ملک کے علماء کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ علمی و عملی میدان میں پیش قدمی کریں اور عوام الناس کی حاجت و ضرورت کی رہنمائی کے لئے علماء اپنا کردار ادا کریں۔ علماء کرام کی دھاک تقریر و تحریر سے، بیعت وارشاد یا ماضی کے واقعات خود کو زندہ رکھنے کی کوشش سے نہیں بیٹھ سکتی، بلکہ علماء کو سیرت کی بلندی، زہد و استغناء اور اخلاق فاضلہ اختیار کرنے کے ساتھ علم و فن میں امتیاز پیدا کر کے اپنے علم و عمل سے معاشرے کو متاثر کرنا ہو گا اور یہ سب دینی مدارس کے متعلقین کے رفتہ ایام کے تذکروں سے نہیں بلکہ موجودہ دور میں مثالی کردار اختیار کر کے دینا ہو گا۔[2]

نمونہ عمل

اسلام نے تلقین کی ہے کہ معاشرہ کے مقتدر طبقات کو نمونہ عمل ہونا چاہیے۔ قرآن کریم میں حضور اکرمؐ کو نمونہ عمل قرار دیا گیا" **لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ** "[3]۔ قرآن و سنت کی روشنی میں مثالی نمونہ بننے کی تلقین کی گئی ہے۔ علماء اسلام پر لازم ہے کہ ان کا کردار بھی نمونہ عمل ہونا چاہیے۔ علماء کرام کی عزت و عظمت اور وقار میں برتری لازمی ہے اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک علماء کرام خود کو خود نمائی و اپنی برتری جاہ و منصب کی خواہش کو ترک نہ کر دیں۔ اسی طرح مال وزر کی محبت سے عاری ہونے چاہیں اور وضع قطع اور رہن سہن میں معاشرے کے طاقتور لوگوں سے مرعوب و متاثر ہونے کی بجائے تواضع اور کسر نفسی کو اختیار کریں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب تک دینی مدارس کے متعلقہ افراد نے خود کو ترغیب و ترہیب سے متاثر نہیں ہونے دیا، حکام کی مجالس سے مستغنی کیا تو اس وقت کا مسلم معاشرہ مثالی ہی رہا۔ جیسے مولانا اشرف علی تھانوی کو ڈھاکہ کے نواب نے ملاقات کے لئے طلب کیا تو مولانا نے مستغنی ہوتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جو کچھ آپ کے پاس ہے وہ میرے پاس بقدر ضرورت دستیاب

1۔ تحفہ پاکستان، 70۔72

2۔ علماء کا مقام، ص124

3۔سورت الاحزاب، 21/33

ہے اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ آپ کے پاس بقدر حاجت بھی موجود نہیں لہذا آپ کو ہمارے پاس آنا چاہیے نا کہ ہمیں آپ کے پاس آنا ہو گا۔ شام کے مشہور بزرگ عالم دین شیخ سعید حلبی دمشق کی مسجد میں درس دیا کرتے تھے۔ ان کے درس میں سلطنت خدیویہ کے بانی محمد علی خدیو کے بیٹے ابراہیم باشا آئے تو شیخ صاحب پاؤں کی تکلیف سے پاؤں پھیلائے ہوئے تھے، شیخ صاحب ابراہیم باشا کی سپہ سالاری و جبر وتیت سے خائف ہونے کی بجائے اسی طرح پاؤں پھیلائے رہے، درس کی سماعت کے بعد ابراہیم باشا واپس چلا گیا تو اس نے تحفۃً اشرفیوں کا توڑا بھیجا جس کو شیخ صاحب یہ کہتے ہوئے قبول کرنے سے انکار کر دیا "**الذی یمد رجلہ لایمد یدہ**" (جو شخص پاؤں پھیلاتا ہے وہ ہاتھ نہیں پھیلا سکتا)۔ ان صفات ممیزہ کو پیدا کر کے علماء کرام معاشرے میں اپنا مطلوبہ کردار مؤثر طور پر انجام دے سکتے ہیں جس کی مسلم معاشرے کو موجودہ دور میں اشد ضرورت ہے۔ [1]

تعصب کی مذمت

تہذیبی و لسانی تعصب اور صوبائی و علاقائی تعصب کے مضمرات کو پاکستانی عوام سے زیادہ کون جانتا ہے کہ عصبیت کی بھینٹ چڑھ کر ملک دولخت ہوا اور پاکستان کا ایک بڑا حصہ بنگلہ دیش میں تبدیل ہو گیا۔ دینی مدارس کے منتظمین کے مطلوبہ کردار میں اس پہلو کو نظر انداز کرنا کسی صورت درست نہیں کہ معاشرے میں تعصب و تنگ نظری فروغ پا رہی ہے۔ اسلام نے عصبیت کے رویوں کو جاہلیت سے منسوب کیا ہے اور رسول اکرمؐ نے تعصب کو شہ دینے والوں کی شدید الفاظ میں مذمت کی ہے جیسے حدیث نبویؐ ہے کہ " **مَنْ تَعَزَّى بِعَزَاءِ الْجَاهِلِيَّةِ، فَأَعِضُّوهُ، وَلَا تَكْنُوا** "[2] (جو کوئی شخص جاہلیت کا نعرہ لگائے اس کو باپ کی گالی دی جائے اور کنایہ سے کام بھی نہ لیا جائے)۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ رسول اللہؐ بغیر وحی کے کوئی بات ارشاد نہیں فرماتے تھے تو اس مذکورہ حدیث سے عصبیت کی مذمت کا عنصر کس درجہ نمایاں ہو رہا ہے۔ عصبیت کی آگ نے مسلم حکومتوں ہی نہیں بلکہ انسانی معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ کر خاکستر کر دیا۔ لہذا دینی مدارس پر فرض ہے کہ ان کے پاس التفات کرنے والے طلبہ میں اور مسلم معاشرے میں اس قبیح رسم سے نفرت و بیزاری کا درس دیا جائے۔ [3]

علمی و دینی رسوخ کی ضرورت

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے 1978ء میں دارالعلوم کراچی پاکستان کا دورہ کیا تو انہوں نے وہاں پر علماء و طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ

> "اس وقت پاکستان کو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب، مولانا محمد یوسف بنوری صاح ب جیسے رسوخ فی العلم والدین کی ضرورت تھی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ حالات و مسائل ایسے ہیں کہ اس وقت اس ملک اور اس عہد کو حجۃ الاسلام امام غزالیؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ کی ضرورت تھی، لیکن اگر اس پایہ کے علماء اور دینی رہنمانہ

1۔ تحفہ پاکستان، ص72-75

2۔ السنن الكبرى، أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (المتوفى: 303ھ) ،المحقق، حسن عبد المنعم شلبي ،اشراف، شعيب الأرناؤوط ، مؤسسة الرسالة - بيروت ، 1421 ھ - 2001 م ،باب اغضاض من تعزى بعزاء الجاهلية،رقم الحديث:8813،ص:136/8

3۔ تحفہ پاکستان، ص76

ہوتے تو کم سے کم ان حضرات کے پایہ کے علماء تو ہوتے جن کا میں نے ذکر کیا، مگر افسوس کہ اس وقت وہ بھی ہم میں موجود نہیں۔"[1]

مولانا قاسم نانوتوی کا امتیاز

مولانا قاسم نانوتوی کو اللہ تعالیٰ متعدد صفات ممیزہ سے مستفید کرر کھا تھا کہ ان کو دینی علوم کے میدان میں اجتہاد کا مقام حاصل تھا، ان کو علم کلام اور معارف الٰہیہ میں دیدہ وری و نکتہ سنجی کی غیر معمولی صلاحیت عنایت تھی ،ان کی کتب "آب حیات"، "تقریر دل پذیر" اور "حجتہ الاسلام" ان کی خداد صلاحیتوں کا مظہر ہیں۔ اس سب کے ساتھ ان کو جو چیز دوسرے علماء سے امتیاز دیتی تھی وہ یہ تھی کہ انہوں نے برصغیر میں مسلمانوں کو مغربی غارتگروں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے ان کے ایمان و ایقان کو محفوظ بنانے اور نوجوان نسل کو مغرب کے تعلیمی و تہذیبی حملہ سے محفوظ کرنے پر اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کردیں وگرنہ دینی تعلیم کے مراکز تو مسلمانوں کے دنیا بھر میں جامعہ ازہر، جامعہ زیتونہ، جامع القرویین مصر، تیونس اور مراکش میں موجود تھے۔ دارالعلوم دیوبند کو فوقیت و امتیاز ہی یہ حاصل ہوا مولانا قاسم نانوتوی نے نئی نسل کو مغرب کے تہذیبی و تعلیمی حملہ سے محفوظ کرنے کے ساتھ اسلامی علوم اور اسلام تہذیب سے ان کے رشتہ کو مستحکم کر دیا۔ مولانا قاسم نانوتوی نے برصغیر میں اسلامی تہذیب اور اسلامی علوم میں قطع و برید کو اسی طرح مسترد کر دیا جیسے ان کے جد امجد خلیفہ رسولؐ سیدنا صدیق اکبرؓ نے مانعین زکواۃ کے خلاف صف بستہ ہو گئے تھے یہ کہتے ہوئے "اینقض الدین و انا حی" کیا دین میں کمی کرلی جائے اور میں زندہ ہوں۔ یعنی میری زندگی میں دین میں کمی بیشی کرنا ناممکن اور ناقابل قبول امر ہے۔[2]

1۔ حدیث پاکستان، ص159

2۔ پاجا سراغ زندگی، ص134-137

فصل دوم

دینی مدارس کے اساتذہ کی علمی و اخلاقی صفات اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل دوم

دینی مدارس کے اساتذہ کی علمی و اخلاقی صفات اور سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

مبحث اول: دینی مدارس کے اساتذہ کی علمی خدمات

برصغیر کے علماء نے دینی و علمی میدان میں نمایاں خدمات سر انجام دیں۔ ان علماء کی تگ و دو کے سبب طویل مدت تک مسلمانوں کو حکومت کا موقع میسر آیا۔ علماء کرام شاہان وقت کی رہبری و رہنمائی کا فریضہ استغناء کے ساتھ ادا کرتے رہے۔ برصغیر کے علماء نے دینی مدارس سے ریاست کے انگنت گوشوں میں معاون ثابت ہونے والے افراد کی کھیپ تیار کی۔ علماء نے تصنیفی میدان میں ایسی خدمات انجام دیں جس کا شہرہ عالم اسلام کے جمیع بلاد میں قائم و دائم رہا۔ علماء کی علمی خدمات کا مختصر ذیل میں درج کیا جا رہا ہے کہ انہوں نے علم و فن کے میدان میں کیا کیا مثالی خدمات پیش کیں جس پر ہر مصنف مؤرخ حدی خواں ہے۔ مولانا عبدالحی حسنی ندوی نے اپنی کتاب "الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند"[1] میں علماء کی تصنیفی خدمات کا خاکہ پیش کیا۔ دینی مدارس کے علماء کی تصنیفی خدمات کے وہ شہ پارے یہاں درج کیے جا رہے ہیں جن کو عالم گیر شہرت ملی۔

عالمی شہرت یافتہ تصنیفات

ساتویں صدی ہجری کے مشہور مصنف، امام لغت و حدیث شیخ رضی الدین حسن بن الصّغانی لاہوری کی "العبابُ الزاخر"[2] کا چرچا علماء لغت کے درمیان ہوا اور مصنف کی عرب علماء نے تعریف کی اور مصنف کی بالغ نظری کو سلام پیش کیا۔ امام جلال الدین سیوطی نے مصنف کے متعلق لکھا ہے کہ "وہ فن لغت کے امام تھے"، امام ذہبی نے ان کو "علم لغت کا مرجع و منتہیٰ قرار دیا تھا" جبکہ الدمیاطی کے یہاں وہ لغت، حدیث اور فقہ کے امام تھے۔ شیخ صاحب کی دوسری تصنیف "مشارق الانوار" فن حدیث میں مشہور ہے جو ایک عرصہ تک شامل نصاب رہی۔[3]

دسویں صدی ہجری کے مشہور محدث شیخ علی بن حسام الدین المتقی برہانپوری (شیخ علی متقی گجراتی) کی کتاب کنز العمال[4] ہے۔ یہ کتاب علامہ جلال الدین سیوطی کی تالیف "جمع الجوامع[5]" کی ترتیب پر مؤلف کی گئی۔ یہ کتاب فن حدیث میں کام کرنے والے علماء کے لئے ہزارہا آسانیوں کا موجب بنی اور شیخ ابوالحسن البکری الشافعی نے صاحب کتاب سے متعلق فرمایا ہے کہ

"پوری علمی دنیا پر علامہ سیوطی کا احسان ہے لیکن امام سیوطی شیخ علی المتقی کے ممنون و احسان مند ہیں"۔[1]

1۔ اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں، سید عبدالحی حسنی ندوی، (ترجمہ، مولانا ابوالعرفان ندوی)، ناشر دارالمصنفین شبلی اعظم گڑھ ہندوستان، 2009ء کا مطالعہ کیا۔ (مقالہ نگار)

2۔ اسلامی علوم وفنون، ص 65

3۔ ہندوستانی مسلمان، ص 36

4۔ اس کتاب کو دارالمعارف جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے شائع کیا اس کی شہرت عالم اسلام میں موجود ہے۔

5۔ علامہ جلال الدین سیوطی کی کتاب "جمع الجوامع" احادیث و روایات کا جامع ذخیرہ ہے، حدیث قولی کو تلاش کرنے کے لئے ابتدائی الفاظ اور فعلی میں راوی کا نام معلوم ہونا چاہیے۔ شیخ علی متقی نے اہل علم پر احسان کیا ہے کہ اس کو ابواب و فصول میں تقسیم کر کے استفادہ کرنے کو آسان بنا دیا۔ ہندوستانی مسلمان، ص 37

علامہ طاہر پٹنی (م 986ھ) کی کتاب "مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل ولطائف الاخیار" کو صحاح ستہ کی شرح کا درجہ حاصل ہے۔ مولانا عبدالحی حسنی ندوی نے اپنی کتاب نزہۃ الخواطر میں لکھا ہے کہ علامہ طاہر پٹنی نے مذکورہ کتاب میں مصنف نے مفردات و الفاظ حدیث کی شرح کی ہے اور اس سے متعلق بہت سے محدثین کے اقوال کو جمع کر دیا ہے۔ اسی وجہ سے اس کتاب کو اہل علم نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کتاب کی تالیف کو اہل علم پر بڑا احسان تصور کیا جاتا ہے۔ ان کی دوسری کتاب "تذکرۃ الموضوعات" بھی علم حدیث سے متعلق لکھی گئی اور وہ بھی شہرت کا باعث بنی۔[2]

الفتاویٰ الہندیہ (فتاویٰ عالمگیری)

برصغیر کے علماء کی علمی خدمات کو جہاں پر انفرادیت حاصل ہے وہیں پر مغل بادشاہوں کی علم دوستی کسی سے پوشیدہ نہیں اورنگزیب عالم گیر نے اپنی حکومت کے آغاز میں ہی شیخ نظام الدین برہانپوری کو حکم دیا کہ فقہ حنفی میں موجود قانونی و مالیاتی اور معاملاتی مسائل کا ایسا مجموعہ تیار کریں کہ جس سے عدل و انصاف کے پیمانہ کو مستحکم کرنے میں معاونت مل جائے اس کام کے لیے تقریباً دولاکھ روپے خرچ کیے گئے۔ مولانا عبدالحی حسنی ندوی نے لکھا ہے کہ فتاویٰ عالمگیری کو عرب دنیا میں فتاویٰ ہندی کہا جاتا ہے اور اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں بہت سے مسائل کو بیان کیا گیا ہے، انداز بیان خوبصورت اور سہل اختیار کیا گیا۔ اس فتاویٰ سے ہندوستان کے علاوہ مصر و شام اور عرب ممالک کے ساتھ جن ممالک میں فقہ حنفی کا رواج ہے سبھی استفادہ کرتے نظر آتے ہیں۔ اس فتاویٰ کو چوبیس علماء نے اپنی نگرانی میں تیار کروایا جن میں سے کچھ نام یہ ہیں قاضی محمد حسین جونپوری، مفتی محمد اکرم حنفی لاہوری، شیخ علی اکبر حسنی، شیخ رضی الدین بھاگلپوری، اسعد اللہ خانی وغیرہ شامل ہیں۔[3]

حجۃ اللہ البالغہ

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م 1176ھ) کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ فلسفہ شریعت اسلامی اور احکام شریعت کے مضمرات پر بات کرتی ہے اور عربی زبان کی وسعت کے باوجود اس جیسی کتاب دستیاب نہیں۔ اس کتاب کو مصنف نے لکھنے میں سنجیدہ علمی طرز کتابت، سلیس و آسان انداز اختیار کیا کہ اس میں فرضی بناوٹ کا نام و نشان بھی نہیں ملتا اور عبارت کی جامعیت کے لحاظ سے اس کتاب کو مقدمہ ابن خلدون کے بعد بلند مرتبہ حاصل ہوا۔[4]

تاج العروس فی شرح القاموس

علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی (م 1205ھ) نے تاج العروس فی شرح القاموس تالیف کی جو امام لغت علامہ مجد الدین فیروز آبادی[5] کی مستند عربی قاموس "القاموس المحیط" کی شرح و تکمیل اور تصحیح پر مشتمل تھی۔ یہ ڈکشنری دس جلدوں اور باریک مصری کتابت کے پانچ ہزار صفحات پر مشتمل

1۔ ہندوستانی مسلمان، ص37

2۔ ہندوستانی مسلمان، ص38

3۔ اسلامی علوم اور فنون ہندوستان میں، ص182-183

4۔ ہندوستانی مسلمان، ص41

5۔ قاضی القضاۃ مجد الدین صدیقی فیروز آبادشیر از کے رہنے والے تھے۔ ایران میں 729ھ کو پیدا ہوئے اور زبید یمن میں 807ھ یا 806ھ میں وفات پائی۔

تھی۔ یہ بہت بڑی کوشش تھی کہ عربی زبان میں کتابت نہیں بلکہ عربی زبان کی ڈکشنری پر غیر عرب نے قلم کو جنبش دی۔ علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی کی یہ سعی اس قدر مقبول ہوئی کہ بادشاہان ترک، مراکش، دارفورا اور مصر کے عسکری رہنماء رئیس محمد بک ابوالذہب نے بھی اپنی مسجد کے لیے اس ڈکشنری کا نسخہ ایک ہزار ریال میں حاصل کر کے اپنی مسجد کے کتب خانے میں سجایا۔[1]

متفرق تالیفات

علامہ محب اللہ بہاری (1119ھ) کی کتاب "مسلم الثبوت فی اصول الفقہ" ایک شاندار کتاب ہے جس کی در جن سے زیادہ شرحیں لکھی گئی ہیں۔ (جامعہ ازہر مصر نے اس کتاب کو اپنے نصاب میں شامل کیا جو اعزاز سے کم نہیں کہ ایک ہندوستانی عالم کی کتاب کو داخل نصاب کرنے پر جامعہ ازہر مجبور ہوا۔[2]) اہل ذوق نے اس کتاب سے بارہویں صدی میں بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اسی طرح مولانا محمد اعلیٰ تھانوی نے کشاف اصطلاحات الفنون کے نام سے کتاب تالیف کی جس نے اہل علم کو ہزاروں صفحات اور سیکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دیا کہ یہ ایک جامع لغت کتاب ہے۔ اسی موضوع پر مولانا عبدالنبی احمد نگری نے جامع العلوم کے نام سے کتاب بھی تالیف کی جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔[3]

زیادہ تصانیف رکھنے والے مصنف

چودھویں صدی عیسوی میں بھی ہندوستان میں ایسے مصنفین کی کثرت رہی جنہوں نے اپنے قلم کو لوہا منوایا تاہم ان میں سے بعض مصنفین ایسے بھی ہیں جنہوں نے سب سے زیادہ کتب تصنیف کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ ان میں نواب صدیق حسن خان والی بھوپال (م1307ھ) نے 222 دوسوبائیس کتب تالیف کیں جن میں 56 کتب عربی زبان میں ضبط قلم کیں۔ تصانیف میں "فتح البیان فی تفسیر القرآن" البلغۃ فی اصول اللغۃ اور العلم الخفاق من علم الاشتقاق شامل ہیں۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی (م1304ھ) نے 110 ایک سو دس کتب تالیف کیں جن میں 86 عربی زبان میں رقمطراز کی گئیں۔ تصانیف میں "السعایہ فی شرح شرح الوقایہ "مصباح الدجیٰ وغیرہ شامل ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی (م1362ھ) کی تصانیف کی تعداد 910 ہے ان میں سے 13 کتب عربی میں لکھی گئیں۔ اسی طرح مولانا باقر بن مرتضیٰ مدراسی (م 1320ھ) اور مفتی محمد عباس لکھنوی (م 1306ھ) کو بھی کثیر تصانیف لکھنے کا اعزاز حاصل ہے۔ انہوں نے عربی اور فارسی یادگار کتابیں چھوڑیں۔[4]

عظیم مصنفین

مولانا محمود حسن خان ٹونکی (م 1366ھ) عالم اسلام میں علمی ذخیرہ تصنیف کرنے والے مصنفین کے احوال کو یکجا کر دیا۔ اس کو معجم المصنفین کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔ یہ مجموعہ 60 جلدوں اور بیس ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے، اس میں چالیس ہزار مصنفین کے احوال کو جمع کر دیا گیا۔ اس کو انسائیکلوپیڈیا کا نام دیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ اس مجموعہ میں اسلامی تاریخ کے آغاز سے 1350ھ تک کے مصنف کے احوال کو مرتب کیا

1۔ ہندوستانی مسلمان، ص 41

2۔ نظام تعلیم، ص 87

3۔ ہندوستانی مسلمان، ص 40

4۔ ہندوستانی مسلمان، 42

گیا۔اس کتاب کے صرف چار حصے حکومت حیدرآباد کے مصارف سے بیروت میں شائع ہوئیں اور باقی نسخے تاحال کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہیں۔[1]

مولانا سید سلیمان ندوی(م 1373ھ)ماضی قریب کے بلندپایہ ، محقق اور انشاء پرداز مصنفین میں سے ایک ہیں جنھوں نے سیرت النبیؐ، شریعت اسلامی، تاریخ اسلام اور ادب میں سات ہزار صفحات سے زائد پر مشتمل سیکڑوں کتب تالیف کیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی(م1375ھ) مطالعہ کی فراوانی، بلند پایہ تصنیف و تالیف کے لحاظ سے منفرد ہیں۔ مشہور کتابوں میں النبی الخاتم، تدوین حدیث، اسلامی معاشیات اور مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت شامل ہیں۔[2]

فن حدیث کی خدمت

برصغیر کے علماء نے علم حدیث کو غیر معمولی اہمیت دی کہ اس علم کو جو عرب دنیا سے بھی دسویں اور بارہویں صدی میں رخصت ہو چکا تھا کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی(958-1052ھ) اور ان کے شاگردوں اور خاندان شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ہر خاص و عام کو اس علم کی طرف متوجہ کر دیا۔ اسی بات کا اعتراف مصر کے مشہور عالم علامہ رشید رضا(مدیر المنار) نے مفتاح کنوز السنہ کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ہندوستانی علماء اگر علم حدیث کی طرف التفات نہ کرتے تو یہ مشرقی دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتا۔ زمانہ قریب میں علماء ہند میں سے علامہ خلیل احمد سہارنپوری(صاحب کتاب "بذل المجھود فی شرح سنن ابی داؤد")، مولانا محمد اشرف ڈیانوی (صاحب کتاب "عون المعبود فی شرح سنن ابی داؤد")، مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری(صاحب کتاب "تحفہ الاحوذی فی شرح سنن الترمذی")، مولانا محمد زکریا کاندھلوی(صاحب کتاب "اوجز المسالک الی شرح موطاامام مالک") ،مولانا شبیر احمد عثمانی(صاحب کتاب "فتح الملہم فی شرح صحیح مسلم") اور مولانا انور شاہ کشمیری (صاحب کتاب "فیض الباری")نے فن حدیث میں مشہور و معروف کتب اور شرحیں تالیف کیں۔[3]

عربی ادب کی خدمت

ہندوستان کے مسلمانوں کی علم دوستی کسی منصف مزاج مؤرخ سے پوشیدہ نہیں۔ اہل علم نے عربی زبان کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا ذریعہ بنانے میں فخر محسوس کیا۔ قاضی عبدالمقتدر کندی دہلوی(م 791ھ)، شیخ احمد بن محمد تھانیسری(م 820ھ)، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (م 1200ھ)، مفتی صدرالدین دہلوی(1285ھ)، مولانا ذوالفقار دیوبندی(م 1322ھ)، پروفیسر عبدالعزیز میمن اور مولانا محمد سورتی کی عربی دانی، عربی لغت اور نحو پر کمال عبور رکھتے تھے۔ ہندوستان کے بیشتر علماء نے عربی صحافت کو بھی ذریعہ اظہار بنایا جن میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبداللہ عمادی، مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا سید علی نقی مجتہد وغیرہ شامل ہیں۔ عربی جرائد میں ندوۃ العلماء سے البعث

1۔ ہندوستانی مسلمان، ص43

2۔ ہندوستانی مسلمان، ص44

3۔ ہندوستانی مسلمان، ص45

الاسلامی، الرائد دارالعلوم دیوبند، الرضوان حکیم محمد عسکری نقوی کی ادارت میں، اور الجامعہ کلکتہ سے مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں اور بہت سے ماہنامے وسہ ماہی اور پندرہ روزہ رسائل شائع ہوتے تھے۔[1]

1۔ ہندوستانی مسلمان، ص48-50

مبحث دوم: دینی مدارس کے اساتذہ کی اخلاقی صفات

دینی مدارس کے اساتذہ کی علمی صفات کے مطالعہ کے بعد ضروری ہے کہ ان کی اخلاقی صفات کا بھی جائزہ لیا جائے۔ علماء کی اخلاقی صفات کا جاننا اس لئے بھی ضروری ہے کہ معاشرے میں علم کی فراوانی و ہمہ گیری سے زیادہ علم پر عملداری کو غور سے دیکھا جاتا ہے۔ مہذب معاشرے کی خوبیوں میں بہترین خوبی حسن خلقی ہے۔ اخلاق کا علم کے ساتھ مربوط رشتہ ہے اور قرآن وحدیث میں جابجا اس کی اہمیت وضرورت کو بیان کیا گیا ہے۔ خود رسول اللہؐ کے بارے میں قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے "وانک لعلیٰ خلق عظیم "[1] (بیشک ہم نے آپ کو بہترین اخلاق کا پیکر بنایا) اور احادیث میں بھی مذکور ہے کہ آپؐ کی بعثت اخلاق کی تکمیل کے لئے ہوئی ہے" **إنما بعثت لأتمم مكارم و في روايةٍ (صالحَ) الأخلاق**"[2]۔ ترجمہ: میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا۔ لہذا بعثت پیغمبرؐ کو پیش نظر رکھتے ہوئے نائبین رسولؐ پر ضروری ہے کہ جن مقاصد کے لیے انبیاء کی بعثت ہوئی ان کا تحفظ کیا جائے۔ اور جو جو صفات پیغمبروں نے اپنے اخلاق و کردار میں پیدا کیں ان کو علماء کرام نا صرف اپنی زندگیوں میں پیدا کریں بلکہ اس کی تعلیم درس و تدریس اور وعظ و ارشاد کے ذریعہ طلبہ و عوام میں پیدا اجاگر کرنے کی سعی کریں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے علماء کرام کے اخلاق سے متعلق جو تحریر کیا اس کو مجمل انداز میں یہاں درج کیا جارہا ہے۔

تعلیم کتاب وحکمت

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ کی بعثت کے مقصد کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا" **هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ** "[3]۔ ترجمہ: وہ ذات جس نے بھیجا امیوں میں ان میں سے رسول، وہ (رسول) ان پر آیات کی تلاوت کرتا ہے، اور ان کی اصلاح کرتا ہے، اور ان کو تعلیم دیتا ہے کتاب اور حکمت کی۔ اس آیت کریمہ میں نبی کے بھیجے جانے کے چار بنیادی مقاصد بیان کر دیئے گئے ہیں۔ دینی مدارس کے متعلقین بھی ان چار امور کو سرانجام دینے کے لئے کوشاں ہیں۔ تلاوت آیات اور تعلیم کتاب کا مفہوم بہت حد تک واضح ہے۔ تاہم تزکیہ اور حکمت کے الفاظ قابل توضیح ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ جہاں جہاں قرآن کریم میں حکمت کا لفظ ذکر ہوا ہے اس سے مراد اچھے اخلاق ہیں۔ حضرت لقمانؑ کے واقعہ میں جب ذکر ہوا" **وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ** "[4] (اور ہم نے لقمانؑ کو دانائی کی باتیں بتائیں) کے بعد جو کچھ بیان ہوا ان کا تعلق اخلاق کریمہ سے ہی ہے، اسی طرح رسول اللہؐ سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد جل وعلا ہے کہ " **ذَٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ** "[5] (اے پیغمبر! یہ ان ہدایتوں میں سے ہیں جو خدا نے دانائی کی باتیں تمہاری طرف وحی کی ہیں) ان ہر دو مقامات پر جو حکمت کا لفظ وارد ہوا ہے اس سے مراد عالی اخلاق کا بیان ہی ہے۔ اس بات سے واضح ہوتا ہے اخلاقیات کو مسلم سماج میں غیر معمولی

1۔ سورت القلم، 5/68

2۔ السنن الكبرى، أحمد بن الحسين بن علي بن موسى الخُسْرَوْجِردي الخراساني، أبو بكر البيهقي (المتوفى: 458هـ)، المحقق: محمد عبد القادر عطا، دار الكتب العلمية، بيروت – لبنان، 1424 هـ - 2003 م، باب بيان مكارم الأخلاق ومعاليها الى آخره، رقم الحديث: 20782، ص: 323/10

3۔ سورت الجمعه، 2/62

4۔ سورت لقمان، 12/31

5۔ سورت بنی اسرائیل، 39/17

اہمیت حاصل ہے۔ یقینی بات ہے کہ دینی مدارس کے متعلقین جب خود کو اچھے اخلاق سے مصلح کریں گے تو معاشرے میں اس کے دورس ثمرات ظاہر ہونگے۔[1]

تزکیہ کے بغیر علم بے فائدہ

تزکیہ واصلاح اخلاق حسنہ میں سے ایک اہم جز ہے۔ علم وکتاب وحکمت بغیر تزکیہ یعنی اصلاح قلب ونفس کے لاحاصل ہے۔ تعلیمی ادارے تلاوت، تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ کے چاروں شعبوں میں انبیاء کرام کی نیابت کا حق ادا کریں۔ تزکیہ واصلاح کا مقصد یہ ہے کہ تمام بری عادات و اطوار سے کنارہ کشی اختیار کرکے اچھی صفات کو انسان اپنی زندگی میں بنیادی مقام فراہم کرے۔ انبیاء اور نائبین انبیاء جب تک مقاصد بعثت پر کامل طور پر عمل نہیں کرینگے تب تک ہمہ جہتی تعلیمی نظام خیر وفلاح کا سبب بننے سے عاجز ہے۔ عصر حاضر میں انسانی معاشرے کو حب جاہ ومنصب، عصبیت جاہلیہ، حسد وکینہ پروری اور مال ومتاع کی محبت کی یلغار کا سامنا ہے۔ ان اخلاق سیہ کا مقابلہ کرنا علماء حق کی ذمہ داری ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی وراثت علم ہے نہ کہ مال وزر۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "**إن الأنبياء لم يورثوا ديناراً ولا درهما، وأورثوا العلم** "[2]۔ تاہم یہاں اس بات سے بھی انکار نہیں کہ رزق حلال کمانے اور حلال کمائی کو حلال طرح سے استعمال کرنے کا حق حاصل ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے "**قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ**"[3]۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ غیر ضروری طمع ولالچ سے احتراز علماء ضرور کریں تاکہ علماء کرام اور عامۃ الناس میں فرق واضح ہو سکے۔

قناعت کا جوہر

مسلم معاشرے میں علماء کا کردار اور ان کے اخلاق نمایاں درجہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان اخلاقیات میں سے ایک اہم عنصر یہ ہے کہ علماء کی زندگیوں میں قناعت پسندی کو بطور شعار ممیز کے لیاجائے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ دنیا کی رنگارنگینی ان کو مرعوب ومتاثر کرنے کی سکت نہیں رکھتی۔ وہ فقر وفاقہ کے ساتھ پر مسرت زندگی بسر کرسکتے ہیں ناکہ وہ حق بات کے اظہار میں تامل کرنے کے لئے معمولی منفعت دنیوی حاصل کرینگے۔ علماء کا طرز معاش ہی ایسا ہونا چاہیے کہ طاقتور لوگ یہ دیکھ کر محسوس کرلیں ان کے ضمیر کو خریدنا ناممکن ہے۔ گویا ان کا شعار یہ ہو کہ " **قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ** "[4](کہہ دیجیے دنیا کا فائدہ بہت تھوڑا ہے)۔ امام ابو حنیفہ، امام احمد ابن حنبل، امام غزالی وغیرہ کو وقت کی طاقتور حکومتوں نے خریدنا ومتاثر کرنا چاہے مگر وہ اپنی خودداری پر کمربستہ رہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی پیشکش کو انہوں نے مسترد کردیا تھا۔ یہی حالت ہندوستان میں بھی پیش آئی کہ حضرت مجدد الف ثانی کو اکبر کی حکومت متاثر نہ کرپائی[5]، اور مرزا مظہر جان جاناں کو بادشاہ دہلی نے ملاقات کے لئے طلب کیا تو انہوں نے معذرت کی تو بادشاہ نے ہزار روپے بطور نذرانے کے بھیجے تو مرزا صاحب نے کہا کہ دنیا میں ایشیاء ایک براعظم ہے اس کے ایک حصہ ہندوستان اور ہندوستان کا حصہ دہلی ہے تو

1۔ دعوت فکر وعمل، سید ابو الحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات نشریات اسلام لکھنو، انڈیا، طبع دوم 1440ھ / 2003ء ص176

2۔سنن ابن ماجه، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم،،رقم الحديث: 223،ص:81/1

3۔سورت الاعراف،32/7

4۔سورت النساء،77/4

5۔ پاجا سراغ زندگی، ص106

اس قدر مختصر حصہ آپ کے پاس ہے تو اس تھوڑے سے حصہ میں کیسے شراکت داری کرسکتا ہوں۔ اس طرح کے بے شمار واقعات علماء ومشائخ کے تاریخ میں رقم ہیں تاہم بقول مصنف "تاریخ گجرات "[1] مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی ندوی نے کہا ہے کہ

"بزرگان دین کی سوانح حیات کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں اتباع سنت، پیروی شریعت، شب بیداری، قرآن وحدیث سے شغف کے تذکروں کی بجائے ان کی جانب غیر فطری وغیر شرعی عادات اطوار کو منسوب کر دیا گیا ہے کہ ان کا کام اللہ سے تعلق وربط استوار کرنے کی بجائے خرق عادت چیزوں سے جوڑ دیا گیا ہے کہ وہ کسی کو گراتے ہیں تو کسی کو زندہ کرتے ہیں یا پھر کشتیوں کو ڈوبتے ہیں جیسی باتیں ان کی طرف منسوب کر کے ان کی علمی وفکری اور روحانی حیثیت کو مشکوک بنادیا گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ بزرگ اہل علم تھے، ان کو قرآن وحدیث سے بہت شغف اور لگاؤ تھا اور وہ کسی بھی شخص کو مسند ارشاد اس وقت تک نہیں دیتے تھے جب تک اس کے علمی تفوق کا ان کو یقین نہ ہو جاتا افسوس ہے کہ یہ سب باتیں دانستہ یا نادانستہ طور پر انسانوں کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا گیا۔"[2]

اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ

"مولانا قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کے زہد وورع کے بارے میں بھی تاریخ میں درج ہے کہ وہ علی گڑھ کے ایک دیندار رئیس کی تنخواہ جو غالباً دس روپے تھی پر مامور تھے میں سے دو روپے اس لئے کم کرائے کہ وہ والدہ صاحبہ کو دیا کرتے تھے اب وہ انتقال کر گئی ہیں تو اس کی حاجت نہیں رہی"۔

اسی کو عربی شاعر نے کہا ہے کہ

أولئک آبائی فجئنی بمثلهم — اذا جمعتنا یا جریر المجامع

دینی مدارس کے فضلا اپنے اندر اگر علماء اسلاف کا سا عملی زہد واستغنا پیدا نہیں کرسکتے تو اس کا شدومد سے تقاضا بھی آج کے دور میں نہیں کیا جاتا تاہم اتنا تو ضرور ہونا چاہیے کہ دنیا کی چمک دمک ان کی آنکھوں کو خیرہ کرلینے میں کامیاب نہ ہو کیونکہ قرآن کریم میں ارشاد جل وعلاہ ہے کہ " **لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِۦٓ أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَٱخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ** "[3]

مادیت کو فتح

علماء کرام میں جن اخلاقی صفات کا پایا جانا ضروری ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ مال وزر کی محبت سے کوسوں دور ہوں، دوسرے الفاظ میں عصر حاضر کی مادیت پرستی کی عفریت سے مامون اور محفوظ ہوں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب تک مسلمان مادیت کو فتح کرتے رہے تب تک وہ معاشرے میں اپنا امتیازی مقام برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے اور جب سے مادیت پرست کے بت نے مسلمانوں بالخصوص علماء ومشائخ کے سینوں میں گھر کیا ہے تب سے مسلمان روبہ زوال ہیں۔ اس صفت کا پایا جانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ دنیا کا حصول مؤمن کی زندگی میں مقصد نہیں بلکہ جینے کا

1۔ یادایام بعنوان تاریخ گجرات

2۔ دعوت فکر وعمل، 175

3۔ سورت الحجر، 88/15، پاجا سراغ زندگی، ص107-108

ایک ذریعہ ہے تاکہ بآسانی مقصد تک پہنچ پائے۔ کیونکہ حدیث نبویؐ ہے کہ "**الدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ**"[1]۔ترجمہ: دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے۔اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ علماء کے پیش نظر یہ بات ہونی چاہیے کہ دنیا کی راحت و آسائش کے حصول کی تگ و دو کرنا ان کے حق میں کسی طور بہتر نہیں تاہم ضرورت اور جائز ذریعہ سے دنیا کمانے کی ممانعت بھی نہیں۔ بزرگان دین اور اہل علم کا یہ ذوق رہا ہے کہ ان کو فقر وفاقہ میں جو سکون اور اطمینان میسر آتا تھا وہ بڑی سے بڑی مسند کے حصول سے بیزار ہو جاتے تھے۔ گویا وہ مال وزر کو حاصل کرنے کی بجائے لوگوں کو مادیت سے دور کرنے کی سعی کرتے تھے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا قول ہے کہ "الجنۃ فی صدری"(میری جنت میرے سینے میں ہے)۔ بزرگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ دنیا والوں پر امر منکشف ہو جائے کہ ہمیں دنیا سے بے رغبتی میں جو سکون حاصل ہے تو وہ ہمیں اس حالت میں نہیں رہنے دینگے۔ دینی مدارس کے متعلقہ افراد میں قناعت پسندی کا جوہر موجود ہونا از حد ضروری ہے کہ ان کو دنیا سے زیادہ اپنا تعلق اللہ سے جوڑنے اور آخرت کی کامرانی کی فکر کا روگ ہونا چاہیے۔[2]

بچوں میں دینی ذوق

دینی مدارس کے اساتذہ کی ذمہ داریوں میں سے اہم ذمہ داری یہ ہے کہ طلبہ میں مضبوط علمی استعداد پیدا کریں، ان کو علم وصرف ونحو میں بھرپور تربیت ومشق کرائیں تاکہ مدارس میں جو علوم وفنون پر منفرد گرفت لازمی ہے وہ ان کو حاصل ہو جائے۔اس کے ساتھ سب سے اہم امر جس کی جانب اساتذہ کرام کو ترجیحی بنیادوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ طلبہ میں دینی ذوق پیدا کریں۔ دینی ذوق سے مراد یہ نہیں کہ ان کو تہجد کا پابند بنایا جائے بلکہ ان کو دوران طالب علمی شب بیداری سے معاف رکھا جائے تو مضائقہ نہیں، ساری زندگی میں یہ مواقع میسر آہی جائیں گے۔ دینی ذوق پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے دل وجان میں دین سے محبت وعقیدت اس قدر موجزن کر دی جائے کہ ان کو شعائر اسلام کو اختیار کرنے میں ذرہ برابر باک نہ ہو اور وہ دین کو اپنی زندگی کا مقصد اصلی بنالیں۔ اگر دین کی عزت وعظمت اور اس پر فخر طالب علموں کے دلوں میں موجزن ہو گئی تو مغربی تعلیم وتہذیب کے طاقتور حملوں، الحاد ولادینیت کا کلچر ان کو پلک جھپکنے کے برابر بھی متاثر نہیں کر سکے گا۔ عربی کا مقولہ ہے "**العلم فی الصغر کاالنقش علی الحجر**"۔ترجمہ: کم عمری کی تعلیم پتھر پر نقش کی طرح مضبوط ہوتی ہے۔ پاکستان کے ایک ادیب میاں شبیر احمد جو ترکی میں پاکستان کے سفیر رہے ان سے بحیثیت الندوہ کے مدیر کے ایک سوال نامہ ارسال کیا تھا کہ زندگی پر اثر ڈالنے والی کتابوں کا نام بتائیں۔ وہ کتاب "اہل علم کی محسن کتابوں"[3] کے نام سے بھی شائع ہوئی۔ میاں صاحب نے بتایا کہ ان پر زندگی میں کئی بار الحاد ولادینیت کا حملہ ہوا تو صرف "الفاروق"[4] کے بچپن میں مطالعہ کی وجہ سے سیدنا عمر فاروقؓ کی شخصیت کا استحضار حفاظت کا موجب بن جاتی تھی۔[5]

1۔ المسند الصحيح المختصر بنقل العدل عن العدل إلى رسول الله ﷺ ، مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشيري النيسابوري (المتوفى: 261ھ) ، المحقق: محمد فؤاد عبد الباقي ، دار إحياء التراث العربي - بيروت ،كتاب الزہد والرقاق،رقم الحديث، 2956،ص:2272/4

2۔ علماء کا مقام، ص89-90

3۔ مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، عمران خان ندوی، ادارہ احیائے علم ودعوت لکھنو انڈیا، 2013ء

4۔ الفاروق، علامہ شبلی نعمانی، دارالاشاعت اردو بازار کراچی، 1991ء

5۔ ملت اسلامیہ کا مقام وپیغام، ص127 تا130

علماء کے مقام میں تنزلی

اس بات سے انکار ناممکن ہے کہ علماء کرام کی ذمہ داریاں اور فرائض کو بخوبی انجام دینے کی وجہ سے مسلم معاشرہ میں ان کو غیر معمولی اہمیت و عزت دی جاتی تھی۔ علماء سلف نے اپنی حیات سعید میں کوشش کی کہ وہ اصلاح و درستگی معاشرہ کے فرض کو ادا کرتے رہیں اور ہر صدی میں پیش آمدہ غیر معمولی حالات کا جم کر مقابلہ بھی کرتے رہے۔ علماء ایسا کیوں نہ کرتے ان سے متعلق رسول اللہ ؐ کا ارشاد ہے:

"يَحْمِلُ هَذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُولُهُ يَنْفُونَ عَنْهُ تَحْرِيفَ الْغَالِينَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِينَ وَتَأْوِيلَ الْجَاهِلِين"[1]

ترجمہ: اس علم کے ہر نسل میں ایسے عادل و متقی حامل ووارث ہوں گے، جو اس دین سے غلو پسند لوگوں کی تحریف، اہل باطل کے غلط انتساب و دعوے اور جاہلوں کی دور از کار تاویلات کو دور کرتے رہیں گے۔

حدیث میں مذکور ان صفات کی تعمیل جب تک اہل علم کرتے رہے تب تک معاشرہ علماء کرام کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا رہا تاہم جب سے مسلم علماء و مشائخ میں بے عملی اور پست اخلاق پر مبنی صفات کا ظہور ہوا اس وقت سے معاشرہ نے بھی علماء کے ساتھ تعاون سے منہ موڑ لیا۔ اب بھی وقت ہے علماء و فضلاء مدارس دینیہ حضرت حسن بصریؒ سے لیکر حضرت شاہ عبد القادر جیلانی اور حضرت ابن تیمیہ حرانی سے حضرت مجدد الف ثانی کے مثالی کردار کو اختیار کر کے اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔[2]

کامیاب استاد

کامیاب معلم کے لئے ضروری ہے کہ وہ مجتہد، داعی اور زمانہ کے ساتھ چلنے والا ہو۔ کوئی بھی استاد اس وقت تک کامیاب کہلانے کا حقدار نہیں کہ وہ کتاب کی ورق گردانی کرے اور پھر طلبہ کو پڑھائے جبکہ اچھا معلم وہی ہے جس کو تعلیم دیتے وقت الہام ہوتا ہو اور اس کا علم وسیع اور عمیق ہو کہ وہ طلبہ کے سوالوں کا بلا استیعاب جواب دے سکتا ہو۔ ایک عرب عالم کا مقولہ ہے کہ **"لايكون المعلم معلما حتى يكون ملهماً"** کوئی استاد اس وقت تک معلم نہیں ہو سکتا جب تک اس کو الہام نہ ہوتا ہو۔ اسی طرح استاد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے اخلاق و اوصاف مثالی ہونے چاہیں اور وہ پاک سیرت و اخلاص کا پرتاؤ ہونا چاہیے کہ طلبہ ان کے عظمت کردار اور علمی تفوق کے معترف ہوں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خان علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے ہیں ان سے بات کرتے ہوئے میں نے یہ کہا تھا کہ دینیات کے استاد کے انتخاب میں چنداں ضرورت نہیں ایسے شخص کو معلم مقرر کرنے کی جس کی وضع قطع، علمی و معاشی حیثیت، فکری و ذہنی سطح اچھے استاد کے برابر نہ ہو یا وہ طلبہ کو پڑھانے والے زمانہ کی بجائے کسی دوسرے زمانے میں رہتا ہو۔ ڈر ہے کہ کہیں طلبہ یہ نہ کہہ اٹھیں کہ دینیات پڑھنا اور پڑھانا معاشرہ سے کنارہ کش لوگوں کا کام ہے۔ لہذا ایسے میں اگر فلسفہ اور آرٹس و سائنس کے شعبہ جات سے دینیات کا ضروری علم رکھنے والا میسر آجائے تو اس کو دینیات کا استاد مقرر کر لینا درست ہے۔ استاد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنا علم پوری دیانت داری کے ساتھ خشیت الٰہی کا استحضار کرتے ہوئے طلبہ تک منتقل کرے اور خود سے بہتر طلبہ تیار

1۔البدع والنهي عنها، أبو عبد الله محمد بن وضاح بن بزيع المرواني القرطبي (المتوفى: 286ھ)،المحقق:عمرو عبد المنعم سليم، مكتبة ابن تيمية، القاهرة- مصر، مكتبة العلم، جدة – السعودية، 1416 ھ،باب فيمايدل الناس بعضهم من بعض البقاع،رقم الحديث:1،ص:25/1

2۔ دریائے کابل سے دریائے یرموک تک، سید ابو الحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، پاکستان، ص143-145

کرنے کا جذبہ رکھتا ہو۔ گویا ان کی روح بے چین ہو، غیر محدود صلاحیتوں کے حامل، تعلیم سے رشتہ قوی رکھنے والوں کے ساتھ ہی اللہ کی مدد شامل حال ہوتی ہے اور زمانے کے تھپیڑے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے [1]۔ جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ

ہوا ہے گو تیز و تند لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے　　　　وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ [2]

1۔ نظام تعلیم، ص74-76

2۔ بال جبریل، علامہ اقبال

فصل سوم

عصر حاضر میں دینی مدارس کے اساتذہ کی ذمہ داری اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل سوم

عصر حاضر میں دینی مدارس کے اساتذہ کی ذمہ داری اور سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

دینی مدارس کا معاشرے میں کردار اہمیت کا حامل ہے۔ مسلمان ہی نہیں پوری انسانیت مدارس کے اثرات سے مستفید ہو رہے ہیں۔ دینی مدارس کے علماء اور طلبہ کی ذمہ داریاں مسلم ہیں۔ علماء کرام کی ذمہ داریاں اس قدر مفصل ہیں کہ اس سے شناسائی رکھنا مسلمان معاشرے کے ذمہ داروں کو اس کا علم ہونا ضروری ہے۔ دینی مدارس کے اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرے میں پنپنے والے مسائل کا ادراک کر کے ان کو حل کرنے کی سعی کریں۔ علماء اسلام کی یہی ریت رہی ہے کہ انہوں نے سخت سے سخت حالات میں بھی اور وسعت وکشادگی کے ایام میں بھی اس اہم ذمہ داری کو احسن طریقہ پر انجام دیا ہے۔ موجودہ دور میں مسلم معاشرہ مسائل کے گرداب میں پھنس چکا ہے اس کو اسے نجات دلانے میں دینی مدارس کے متعلقین علماء وطلبہ کے کاندھوں پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہو چکی ہیں۔ علماء کرام کی ان ذمہ داریوں کو مجمل انداز میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے افکار کی روشنی میں ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

لوگوں پر گواہ

انبیاء علیہم السلام کی نیابت کا بارگراں اٹھانے کی وجہ سے علماء کرام کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ بالخصوص اس زمانے میں جب معاشرے کے طبقات کے جذبات واحساسات پر گرد پڑ چکی ہو اور لوگ مادیت پرستی وحیاسوزی کے اسیر ہو چکے ہوں۔ یہ وہ لمحہ ہے جب بڑے لوگ اپنی ذمہ داریوں سے غافل اور تنہا ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ تاہم یہ وہ گھڑی ہے جب علماء کرام اپنی ذمہ داری کا بوجھ اتارتے ہوئے غافل انسانی معاشرے کو راہ حق کی طرف گامزن کرنے کے لئے مصروف عمل ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس کو " **قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ** "[1] (اللہ کی طرف سے منتظم اور انصاف کے گواہ) بن کر اپنے کام کا آغاز کرتے ہیں اور لوگوں کو درس وتدریس اور وعظ اور تذکیر کے ذریعہ سے دنیا کی محبت سے بے نیاز کر کے شریعت اسلامیہ کی اتباع اور رجوع الی اللہ اور اطاعت رسول کی طرف گامزن ہونے کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں اور اسی طرح اخلاق رذیلہ کبر ونخوت، مادہ پرستی وحیاسوز سرگرمیوں سے معاشرے کو گلوخلاصی کا سبق بھی پڑھاتے نظر آتے ہیں۔ حق پرست اہل علم کی یہ ذمہ داری اس وقت زیادہ ہو جاتی ہے جب مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانہ میں حضرت حسن بصری اور حضرت امام احمد ابن حنبل، علامہ ابن الجوزی اور شیخ عبد القادر جیلانی کا کردار نمونہ عمل ہے کہ انہوں نے مسلم حکومتوں کے ہوتے ہوئے ظاہر ہونے والی بدعات وخرافات اور غفلت ولاپرواہی اور دین میں تحریف وترمیم، لہو ولعب کے دور میں حق گوئی وبے باکی کا فریضہ ادا کیا۔ عصر حاضر میں مادہ پرستی کے عفریت اور مغربیت کے حملوں سے نبرد آزمائی کر کے عوام الناس کو سنگین حملوں سے نجات دلانا علماء امت کی ذمہ داری وفرض ہے۔[2]

1۔سورت النساء،135/4

2۔ علماء کا مقام، ص36 تا39

تضادات کا خاتمہ

عصر حاضر میں علوم دینیہ کے حاملین کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی سے تضادات کا خاتمہ کریں۔ایک طرف یہ عمل ہے کہ بعض مباحات کے استعمال میں تولیت و لعل سے کام لیا جاتا ہے مگر سوء اتفاق ہے کہ مسلمانوں کو منقسم کرنے اور مسلمانوں کے گروہوں کو بذریعہ چغل خوری، غیبت، الزام تراشی، کذب بیانی سے توڑنے کو معیوب نہیں جانا جاتا۔یہ کھلا تضاد جو انسان کے ظاہری عمل اور باطنی فریب کے مابین واقع ہے اس کا خاتمہ از حد ضروری ہے کیونکہ اللہ جل شانہ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں۔لہذا انسانی زندگی سے توہین و تحقیر انسانیت ،خیانت و چوری اور اپنے منصب کی ذمہ داری کو ادانہ کرنا، اور سنی سنائی بات کی وجہ سے مسلمانوں کو نقصان پہنچانا مذموم عمل ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد جل شانہ ہے" **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَاۗءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا** "[1](مومنو! اگر کوئی بدکردار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو)۔اور اسی طرح حدیث نبویؐ میں بھی ارشاد موجود ہے کہ" **كفى بالمرء كذبًا أن يحدِّث بكلِّ ما سمع** "[2](انسان کے جھوٹے ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ جو کچھ اس کے کان میں پڑے وہ اس کا چرچا کرنا شروع کر دے)۔علماء دین پر ضروری ہے کہ خود اپنی اور امت کی زندگیوں میں سے ان بد اخلاقیوں سے محفوظ کرنے کی سعی کرنی چاہیے اور اس کے ساتھ اپنے اندر ان صفات حسنہ کو بھی پیدا کرنا ہو گا کہ اخلاقی، روحانی ،علمی اور ذہنی برتری کے زور پر معاشرے میں خیر کو شر پر فوقیت دینی ہو گی۔اگر اس امر سے لحہ بھر بھی تامل کیا گیا تو اس کے مضمرات سے انسانی معاشرہ صدیوں تک نجات حاصل نہ کر پائے گا۔[3]

تہذیبی ارتداد کا مقابلہ

دسویں صدی ہجری میں ہندوستان کا علمی و دینی حلقہ اخلاقی امراض سے دوچار ہو گیا تھا اور علماء دولت پرستی و منصب پسندی، باہمی بغض و عناد، اور عہدہ و منزلت حاصل کرنے میں جاری کشمکش نے مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی حالت کو افسوسناک بنا دیا تھا۔اس وقت بظاہر یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اب اس تہذیبی ارتداد کے نتیجہ میں ہندوستان سے دین اور اہل دین کا مستقبل خطرناک ہو جائے گا۔یہ صورتحال اس لئے پیش آئی کہ اس وقت کے علماء بادشاہوں کی کاسہ لیسی میں مصروف عمل ہوتے ہوئے اخلاقی بے راہروی سے دوچار تھے۔اس سلسلہ میں ملامبارک اور ابوالفضل و فیضی کی سیرت و کردار کا مطالعہ حقیقت حال سے آگاہی کا اہم ذریعہ ہو گا۔تاہم دین اکبری اور اس تہذیبی ارتداد کے سدباب میں حضرت شیخ احمد سرہندی(مجدد الف ثانی) کا کلیدی کردار ہے کہ ان کی اخلاقی و علمی برتری کے سانے سرکاری و درباری علماء سرنگوں ہوئے اور امت نے سکھ کا سانس لیا کہ اب دین کی حفاظت کا خدائے ذوالجلال کے فضل سے مناسب انتظام ہو گیا۔[4]

1۔سورت الحجرات،6/49

2۔مسند ابن الجعد،علي بن الجَعْد بن عبيد الجَوْهَري البغدادي (المتوفى: 230هـ)،المحقق:عامر أحمد حيدر، مؤسسة نادر – بيروت،1410 – 1990،باب شعبة ابراہیم الهجری،رقم الحدیث،627،ص:109/1

3۔علماء کا مقام،60

4۔تاریخ دعوت وعزیمت،ص:4/ 92تا101

علمی استغراق

یہ بات قرین قیاس ہے کہ قوموں کے زوال کے پس پردہ اسباب میں سے اہم سبب علم و فن کا زوال پذیر ہو جانا بھی ہے۔ عصر حاضر میں اس بات کی اہمیت دوگنا ہو گئی ہے کہ چہار جانب علم کا سکہ رواں دواں ہے اور تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قوم نے علم میں بلند مقام حاصل کیا اسی کو جہانگیری کا موقع نصیب ہوا اور یہی حقیقت آج بھی ثابت شدہ امر کی طرح واضح ہے۔ دوسری جانب دینی مدارس کو بہت بڑے بحران کا سامنا ہے کہ اگر ایک ماہر علم حدیث، علم تفسیر، علم فقہ یا اصول فقہ اور علم کلام و عقائد کا ماہر دنیا سے رخصت ہو جائے تو اس کی جگہ سنبھالنے والا تلاش کرنے سے بھی اس پائے کا نہیں ملتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دور کی چمک دمک اور ریل پیل کی وجہ سے علمی انہماک و استغراق اہل علم سے دور چلا گیا ہے۔ جب کہ یورپ میں علم سے اس قدر لگاؤ ہے کہ ان کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ دن یا رات کی کونسی گھڑی ہے۔ اس طرح کی مثال تو مسلمانوں کے ماضی میں ملتی ہے کہ مراکش کے ایک بزرگ فقہ مالکی پر کتاب تالیف اور اس قدر اپنے کام میں مشغول تھے کہ ایک روز گھر کھانا تناول کرنے نہ پہنچے تو پوچھا گیا تو جواب دیا میں تو آیا تھا اور کھانا بھی نوش کیا، تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ مسائل کو سلجھانے میں چلتے ہوئے بھی غور و فکر سے کام لے رہے تھے تو کسی پڑوسی کے گھر میں داخل ہو گئے اور اہل خانہ ان کی عادت سے واقف تھے اور اہل علم کے قدر شناس بھی تو انہوں ہاتھ دھلا کر دستر خوان سجادیا اور بزرگ کھانا نوش کر کے واپس اپنے تالیفی سرگرمی میں مشغول ہو گئے۔ عصر حاضر میں اہل مدارس کی ذمہ داری ہے کہ ایسا علمی ماحول فراہم کریں کہ علوم و فنون کے ماہر تیار ہو کر مسلمانوں کو علمی ماہرین کی محرومی کا احساس باقی نہ رہے۔[1]

مطالعہ کی فراوانی

دینی مدارس کے اساتذہ کرام کی ذمہ داری میں سے ہے کہ ان کا علمی و فنی لحاظ سے مطالعہ بہت وسیع اور عمیق ہو۔ جس کے ذریعہ وہ اپنے طلبہ کو مستفید کرنے کے ساتھ وہ طلبہ کے جدید مسائل پر سوالات کا سیر حاصل تسلی بخش جواب بھی دے سکیں۔ علماء و طلبا کو اپنے لمحات زندگانی میں سے کچھ وقت نکال کر خالص علمی ماحول میں وقت گذارنا چاہیے جہاں پر مختلف علوم و فنون کی کتب کا گراں بہا ذخیرہ موجود ہو اور وہ اس سے استفادہ کریں۔ بنیادی طور پر میر التعارف استاذ کا ہی ہے کہ میں نے زندگی میں جو کچھ سیکھا اور جو کچھ حاصل کیا یعنی عربی زبان میں تحریر و تقریر میں فراوانی، تعلیم و تاریخ پر دسترس اور دعوتی و تبلیغی میدان میں کامیابی سمیٹنے کا اعزاز حاصل کرنے کے پیچھے درس و تدریس کے ایام میں کثرت مطالعہ سے حاصل کیا۔ طلبہ کو پڑھانے میں کس حد تک کامیاب ہوا یہ بتانا خود سے مشکل ہے لیکن جو کچھ حاصل کیا اسی عمل تدریس اور وسعت مطالعہ سے ہی حاصل کیا ہے۔ اس بات کو اساتذہ کرام اپنا مطالعہ بڑھانے کے ساتھ یہی سوچ طلبہ میں بھی منتقل کریں تاکہ دینی مدارس کو جس قحط الرجال کا سامنا ہے اس کا ازالہ کیا جا سکے۔[2]

1۔ دعوت فکر و عمل، ص2015تا217

2۔ ملت اسلامیہ کا مقام و پیغام" سید ابو الحسن علی ندوی، مرتب طلبہ بھٹکل دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو، انڈیا، 1426ھ / 2005ء، ص127

عربی زبان کو اپنائیں

دینی مدارس کے اساتذہ کرام کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری یہ بھی ہے کہ طلبہ کو عربی زبان کی تدریب کا شوق پیدا کریں۔ عربی زبان اسلامی علوم کا منبع و مصدر ہے۔ درسی کتب کو سمجھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ عربی متن کی کتابوں کی مکمل تفہیم اور الفاظ و عبارت کے حفظ کا انتظام کیا جائے۔ طلبہ کو عربی میں مکالمہ، تقریریں، مضامین کی مشق کرائیں تاکہ طلبہ عربی پر بآسانی عبور حاصل کر لیں۔ تاہم اس امر کو ضرور ملحوظ خاطر رکھا جائے کہ طلبہ عربی کو رٹنے کی بجائے اس کو مکمل طور پر سمجھ بھی رہے ہوں۔ اس کے ساتھ طلبہ کو علمی و فکری بلندی حاصل کرنے کے لیے نمونہ شخصیات اور کتب سے مانوس بھی کریں۔ سیرت و سوانح اور کتب تاریخ میں بکھرے ہوئے پیغمبروں، صحابہ اور بزرگان دین کے واقعات کو ذہن نشین کر لیں اور ان کو اپنی زندگی میں بطور مثال اختیار کرنے کی کوشش کریں۔[1]

فارغ التحصیل کہنا درست نہیں

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی نواب صدر یار جنگ بہادر نے متعدد بار اس جملہ پر اعتراض کیا ہے کہ اساتذہ کرام خود کو فارغ التحصیل سمجھیں۔ اساتذہ کرام کو یاد رکھنا چاہیے درس نظامی کی تکمیل کر کے اب انہوں نے فراغت حاصل کر لی چونکہ عربی میں فارغ لفظ کا معنی خالی و بے کار کے ہیں۔ درحقیقت دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کا درس نظامی کا نصاب مکمل کر لینے کے بعد ہی ان کے کام کا آغاز ہوتا ہے کہ دوران تعلیم وہ وقت کی قلت کی وجہ سے فحص اور تمحیص اور غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کرنے سے عاجز تھے اب تکمیل تعلیم کے بعد ان کے پاس فرصت ہے کہ وہ اب مزید مطالعہ کر کے اپنے علم میں اضافہ و رسوخ فی العلم کی صلاحیت کو جلا بخشیں۔ اساتذہ کرام اس بات کی تلقین و ترغیب اپنے طلبہ کو بھی دیں کہ وہ تکمیل درس نظامی کے بعد اس قابل ہوئے ہیں کہ علوم اسلامیہ پر غور و خوض کر سکیں۔ مدارس میں جاری نصاب تعلیم کی تکمیل پر طالب علم کے اندر یہ احساس پیدا ہونا چاہیے کہ وہ اپنے جہل کا اعتراف کرے اور اپنے نصاب تعلیم کی تکمیل کی روشنی میں حاصل شدہ کنجی سے علم کی پوشیدہ و مقفل گتھیوں کو سلجھانے اور کھولنے کی سعی کا آغاز کرے۔[2]

اسلام زمانہ کا قائد

علماء اسلام کی عصر حاضر میں ذمہ داریوں میں سے اہم ذمہ داری یہ ہے کہ علماء کرام مسلمانوں کے دور حکمرانی ہو یا دور محکومی دونوں میں کلیدی ذمہ داری ہے کہ وہ انسانی معاشرہ پر ثابت کریں کہ اسلام کا ازلی و ابدی رشتہ علم کے ساتھ مرتبط ہے۔ زمانہ کے تغیر و تبدل کے ساتھ قرآن و سنت، فقہ اور اصول فقہ کی روشنی میں انسانی معاشرے کی ضروریات و حاجتوں کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ چونکہ یہ بات مسلم ہے کہ علم ایک نور ہے اور جہالت ظلمت ہے اور نور کی موجودگی میں ظلمت پنپ نہیں سکتی۔ اس کے ساتھ علماء کرام کے پیش نظر یہ امر بھی رہنا چاہیے کہ عصر جدید کے نوجوانوں کے دلوں میں یہ احساس دقیقہ بھر کے لئے بھی پیدا نہ ہونے دیں کہ اسلام دور جدید کے تقاضے پورے کرنے سے عاجز ہے جبکہ ہمارا یقین تو یہ ہے کہ اسلام صرف رہبری ہی نہیں بلکہ قیادت و سیادت کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یاد رکھیں اگر یہ فکر نسل نو کے اذہان میں پیدا ہو گئی تو اس کا بدیہی نتیجہ

1۔ ایضاً، ص130 - 131

2۔ ملت اسلامیہ کا مقام و پیغام، ص132، یا جاسراغ زندگی، ص20

بے عملی و شریعت سے انحراف یا پھر الحاد و لادینیت کی شکل میں ظاہر ہو گا جو مسلم معاشرے کے لئے سم قاتل سے کم نہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کے فاتح اسلام کے مفتوح بن گئے۔ ایران وماوراء النھر میں تاتاریوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو اس وقت کے ربانی علماء علامہ ابن تیمیہ اور ان کے رفقاء کار کی علمی و فکری پختگی کی وجہ سے تاتاریوں نے اسلامی تہذیب و تمدن کو اپنا مسکن بنالیا۔[1]

پہلی ترجیح

مسلم معاشرے کے رہبر علماء اور دانشوروں کی عصر حاضر میں ذمہ داریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ دین کی حقانیت وبالا دستی وغلبہ کے لئے ذاتی و جماعتی اور مسلکی مفادات کو ترک کر دیں۔ دور جدید کے تعلیم یافتہ نوجوان علماء کی زندگیوں کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں اور ان کے سامنے اگر علماء باہم دست و گریبان ہونگے تو اس کا بدیہی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ نوجوان دین سے متنفر ہو جاتا ہے کہ خود ان علماء کے مابین اتحاد و اتفاق نہیں اور وہ دین کے کام کو سرانجام دینے میں خود نمائی کو فوقیت دیتے ہیں تو ان سے خیر و فلاح کی توقع بے سود ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے ایک موقع پر مجلس میں یہ کہہ دیا کہ ایک غزوہ میں ہم شریک ہوئے تو اس میں ہمارے پاؤں پر چھالے پڑ گئے تو پھر ہم نے چیتھڑے پاؤں پر باندھ لیے۔ یہ کہہ کر وہ فوراً حزین و غمگین ہو گئے کہ یہ میں نے کیا کہہ دیا کہیں اللہ تعالیٰ کو یہ جملہ ناپسند ہو گیا تو ساری جدوجہد رائیگاں ہو جائے گی[2]۔ غازی محمد دھرم پال نے اپنی ایک تقریر میں کہا ہے کہ علماء کرام و مشائخ عظام کو خود نمائی کا اس قدر شوق ہو چلا ہے کہ وہ یہ کہتے نہیں تھکتے کہ ان کے حق پرست پر اتنے لوگ مسلمان ہوئے ،اسی طرح اگر کہیں کسی نامی گرامی شخصیت کی فوتیگی ہو جائے تو مسابقت کے ساتھ جنازہ پڑھانے کے لئے مصلہ امامت پر براجمان ہو جاتے ہیں کہ موصوف اخبارات کی شہہ سرخی و تصاویر کی زینت بن سکیں۔ برتری کا یہ احساس علماء، دانشوراور مشائخ میں پیدا ہو جائے تو یہ امر معاشرے کی ہلاکت کا موجب بن سکتا ہے۔ لہذا اہل علم طبقہ کو اس سے احتراز کرنا ہو گا۔[3]

ایثار و قربانی

عصر حاضر میں علماء کرام کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی وضع قطع اور رہن سہن میں تکلف سے اجتناب کریں،اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ایثار و قربانی کے جذبہ کو اختیار کرتے ہوئے علمی کلامی مباحث کو عوام الناس کے سامنے بیان کرنے سے احتراز اکریں اور شاہوں کی مجالس سے کنارہ کشی اختیار کرنا بھی علمائے ربانی کی صفات میں سے ایک ہے۔ حضرت شیخ احمد سرہندی نے اپنے مکتوبات میں لکھاہے کہ جلال الدین اکبر کی اسلام سے بے رخی کی بنیادی وجہ اس وقت کے علماء کرام کی خواہشات دنیاوی، باہمی نزاعات،اور دوسروں پر خود کو ترجیح دینے کی کوشش کا بنیادی دخل تھا کہ علماء مرغوں کی طرح علمی موضوعات پر مباحثہ کیا کرتے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی کو معلوم ہوا کہ جہانگیر اپنی مجلس میں علماء کی جماعت کی تعین کا خواہش مند ہے تو حضرت نے اس کو پیغام نواب سید فرید کے ذریعے بھجوایا کہ اس امر سے باز رہے،اگر حاجت بھی ہو تو صرف ایک عالم کو اپنی مجلس میں جگہ دیں تاکہ علماء کرام باہمی رقابت کی وجہ سے لوگوں کو بد دین نہ کر پائیں۔ حضرت مجدد الف ثانی کی اصلاحی کوششیں بارآور اس لئے ثابت ہوئیں کہ ان کو جاہ و منزلت کی طلب نہ تھی اور انہوں نے بادشاہوں سے کسی بھی طرح کا اخذ ورد کا قائم ہی نہیں کیا۔ حضرت مجدد الف ثانی

1۔ علماء کا مقام،ص130-135

2۔الجامع الصحیح البخاری،کتاب المغازی،باب غزوۃ ذات الرقاع ،رقم الحدیث: 4128،ص:113/5

3۔ دعوت فکر و عمل،86-89

باشاہوں کی مجلس کی زینت بننے کی بجائے ان کو صالح افراد کی جماعت تیار کر کے دیتے رہے اور اسی کے سبب حکمرانوں کا تعلق دین اور اہل دین سے محبت وعقیدت کا قائم رہا۔[1]

حفاظت عقائد وشریعت

دینی مدارس کے اساتذہ کی ذمہ داریاں گراں بار ہیں۔ان میں اہم ترین ذمہ داری یہ ہے کہ معاشرے کے اثرات سے متاثر ہونے کی بجائے مؤثر بنتے ہوئے اساتذہ کرام اور فضلاء مدارس پر لازم ہے کہ وہ زمانے کے تھپیڑوں اور ترغیب وترہیب سے بے خوف ہو کر شریعت اسلامیہ اور عقائد کے بین اصولوں کی حفاظت کا انتظام کریں۔ تاہم اس میں اس بات کو ضرور ملحوظ خاطر رکھا جائے کہ اس سے مراد حکمت ودانشمندی کے ساتھ تعلیمات اسلام کو فروغ دینا بھی ترجیح ہونی چاہیے البتہ اس میں اس بات کی بلکل اجازت نہیں دی جاسکتی کہ لوگوں کے رعب ودبدبہ کی وجہ سے مداہنت سے کام لیں۔اسی بات کا قرآن کریم کا صریح حکم ہے کہ " **اُدۡعُ اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ** "[2](لوگوں کو دعوت دیں اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھے انداز سے)۔اسی طرح ارشاد جل شانہ ہے کہ " **وَدُّوۡا لَوۡ تُدۡهِنُ فَيُدۡهِنُوۡنَ** "[3](وہ چاہتے ہیں کسی طرح تو ڈھیلا ہو تو وہ بھی ڈھیلے ہوں)۔جبکہ حق بات کے اظہار کا صراحتی حکم قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کو دیا گیا کہ " **فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ** "[4](جس کا حکم دیا جارہاہے بیان کریں اور مشرکین کی مخالفت کو نظر انداز کردیں)۔ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ منصوصات اور شریعت میں کسی طرح کی ترمیم یا مخالفت کی کوششوں کو نظر انداز کیا جائے گا اور توحید وسنت کو کماحقہ بیان کیا جائے گا۔ حضور اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی۔" **لا تجتمع امتی علی الضلالة** "[5] ۔لہذا علماء اسلام کی یہ کلیدی ذمہ داری ہے کہ وہ سچ اور جھوٹ، حق اور باطل کو کھول کھول کر عوام الناس پر واضح کریں۔[6]

حقائق زمانہ کی معرفت

دینی مدارس کے متعلقین کی ایک اہم ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ طلبہ اور معاشرے کے لوگوں کو دینی عقائد پر پختگی ومواظبت کے ساتھ زمانہ کی ضرورتوں اور تقاضوں اور چیلنجز سے واقف کریں۔یعنی عبادت وعقائد کی درستگی وصحت کے ساتھ ضروری ہے کہ مسلمان شخص معاملاتی زندگی اور زمانے کے حقائق کی اہمیت وضرورت سے آگاہ ہو اور اس کے مطابق بوقت ضرورت مدافعت ومقابلہ کرنے کی صلاحیت کا حامل ہو جائے۔حضرت عمرو بن العاصؓ نے جب مصر کو فتح کیا تو انہوں نے مسلمانوں سے صریحاً بات کی کہ وہ خبردار وہوشیار رہیں کہ رومی ودشمن اسلام کسی وقت بھی حملہ آور ہوسکتے ہیں گویا تم ہمیشہ محاذ جنگ پر کھڑے ہو۔احتیاط وبیداری کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہوگی۔بعینہ موجودہ دور میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف

1۔دعوت فکر وعمل،89-91

2۔سورت النحل،125/16

3۔سورت القلم،9/68

4۔سورت الحجر94/15

5۔سنن ابن ماجه،كتاب الفتن،باب سواد الاعظم،رقم الحديث:3950،ص:1303/2

6۔تحفہ دکن،سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام۔لکھنو،1403ھ / 1983ء،ص42-43

سازشیں بپاہیں اور مستقبل میں بھی ایسے مسائل کا سامنا رہنے کا امکان ہے، ایسے میں علماء کرام کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ معاشرے کی عبادت وعقائد کی درستگی پر تکیہ کرکے نہ بیٹھیں بلکہ وہ معاشرے میں فروغ پاتی سرکشیوں اور انحرافات وبے راہ روی کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیتے ہوئے مسلمانوں کی معاملاتی زندگی کو بہتر بنانے کا انتظام کریں کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ جو لوگ زمانہ کے تقاضوں سے متصادم ومتحارب ہوئے تو ایسی اقوام اپنا وجود دنیا میں قائم نہیں رکھ سکیں[1]۔

حکمت مومن کی میراث ہے

اہل علم علماء ودانشوروں پر لازم ہے کہ وہ عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق مسلم معاشرہ کی گاہے بگاہے رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہیں ۔اور نئی نسل کے ذہنوں میں ابھرنے والے جدید مسائل کا قرآن وسنت کی روشنی میں حل بھی پیش کریں تاکہ نوجوانوں کا اعتماد اسلام اور اہل اسلام پر بحال ہوسکے۔ جیسے حدیث نبویؐ سے ظاہر ہوتاہے کہ حکمت ودانشمندی مومن کی گمشدہ میراث ہے، تو ایسے میں اہل علم مفکرین ومصلحین اور اساتذہ کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ طلبہ کو عرب وعجم اور شرق وغرب کے جدید علمی معیارات واسالیب سے متعارف کرانے کے لئے کانفرنسز، سیمینارز کا اہتمام کریں تاکہ مسلم معاشرہ مفید وکارآمد نظام تعلیم سے بہرہ مند ہوسکیں۔

کامیاب معلم

اچھے سے اچھا نصاب تعلیم اس وقت تک فائدہ مند نہیں ہوسکتا جب تک اس کی تعلیم دینے والا معلم ماہر اور صاحب ذوق نہ ہو۔ درحقیقت نصاب تعلیم کی کامیابی کا انحصار اس کے معلم اور مدرسہ کے ماحول پر ہے۔ کامیاب معلم ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اگر وہ تحقیق واجتہاد کی صلاحیت سے تہی دامن ہے تو بھی وہ اپنے سبق ومضمون کا ذوق وشوق رکھتا ہو اور اس کا کردار طلبہ وعوام سے بلند اور پختہ ہو اور اس میں تبلیغی روح موجزن ہو۔ اس کے برخلاف اگر کوئی ایسا معلم ہو جو اخلاقی اعتبار سے غیر ممتاز، اصول وسیرت میں ناپختہ، پیشہ ورونوکری کی انجام دینے کی ذہنیت رکھنے والا دینی مدارس کے لئے بے فائدہ ہی نہیں بلکہ مضر ونقصان دہ ہے۔[2]

انداز تکلم

اساتذہ کرام کو یہ بات بخوبی جان لینی چاہیے کہ جو ان کا طرز عمل اور ان کا انداز تکلم طلبہ پر اثر ڈال سکتا ہے وہ نصابی کتابیں نہیں ڈال سکتیں۔ اگر اساتذہ کرام اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ؐ کا نام محبت وعقیدت اور جوش کے ساتھ لیں گے تو اس کا اثر ہوگا کہ زندگی بھر طلبہ کے دلوں سے اللہ و رسولؐ خدا کی محبت کا جذبہ مفقود نہیں ہو پائے گا یہاں تک کہ وہ امریکہ ویورپ جائیں یا وہاں کی جامعات میں تعلیم حاصل کریں مگر یہ سب ان کو ان کے اولین نقوش سے بے بہرہ نہیں کرپائیں گے چنانچہ علامہ محمد اقبال اپنی ساری زندگی اپنے پہلے استاد سید میر حسن کی خوبیوں کو بیان کرتے رہے کہ جن کی محنت وصحبت کے اثر سے علامہ مطالعہ قرآن اور مطالعہ اسلام کی جانب متوجہ ہوئے۔ باوجود اس کے کہ علامہ نے شرق وغرب کے بڑے بڑے اہل علم سے استفادہ کیا مگر سید میر حسن کا مقام ومرتبہ ان کی نظر میں کم نہ ہوسکا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ طلبہ کو قرآن شریف، کتب، علماء

1۔ تحفہ دکن، 44-46

2۔ مدارس اسلامیہ، ص38-39

کے کتب کی بھی تلقین کی جانی چاہیے یہ بھی فائدہ سے خالی نہیں یعنی علم دین اور علم دین کے حاملین کی محبت بھی طلبہ دلوں میں بٹھانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ تمسخر دین سے منزیٰ رہیں۔[1]

زبان وادب سے وابستگی

دنیا کے بہت سے اسلامی ممالک سے اسلام و مسلمانوں کو کمزور کرنے کی کوشش اس لئے کارگر ثابت ہوئی کہ وہاں کہ طبقہ علماء نے زبان و ادب سے اپنا ربط و تعلق استوار نہیں رکھا عرب ممالک میں مصر کو کچھ استثناء حاصل ہے باقی عرب ممالک ہوں یا ترکی وغیرہ وہاں کے علماء نے زبان و ادب کو آزاد چھوڑ دیا تو اس کے ذریعہ سے تشکیک والحاد کے حملے کاگر ثابت ہونے لگے۔ برصغیر کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں پر زبان وادب کے جو چار ستون گنے جاتے ہیں ان چاروں کا تعلق طبقہ علماء ہی سے ہے کہ انہوں نے زبان وادب کے ساتھ نہ صرف اپنا رشتہ قائم رکھا بلکہ اس میں زمانہ کی قیادت کا فریضہ بھی انجام دیا، علامہ سید سلیمان ندوی بہت عرصہ تک انجمن ترقی اردو کے صدر رہے اور خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، مولوی محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کو تو زبان و ادب کے ستون کے طور پر جانا جاتا ہے۔ علماء پر لازم ہے کہ وہ زبان کی تاریخ اور نثر و نظم کی باریکیوں اور علمی اصطلاحات پر تنقید کا استحقاق پیدا کرلیں۔ مولانا عبدالحی حسنی ندوی کی کتاب "گل رعنا" اور مولانا عبدالسلام کی شعر الہند اور شعر العجم مایہ ناز تصنیفات ہیں کہ ان پر زبان و ادب کے ماہرین فخر کرتے ہیں۔ اور زبان و ادب کی خدمت کرنا دینی فریضہ بھی ہے کہ اسی کے ذریعہ سے مسلمانوں میں دین کی تعلیم کا ذخیرہ منتقل ہوتا ہے، خطرہ اس بات کا ہے کہ مسلمان زبان وادب سے بے تعلق ہو کر اپنی نوجوان نسل کی دینی تربیت کیسے کر پائیں گے۔[2]

1۔ مدارس اسلامیہ، ص197-199

2۔ طالبان علوم نبوت کا مقام، ص135-136

باب پنجم

دینی مدارس کے طلبہ کا کردار اور سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل اول: دینی مدارس کے طلبہ کے علمی اوصاف اور سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل دوم: مدارس کے طلبا کے اخلاق و اوصاف اور سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل سوم: عصر حاضر میں دینی مدارس کے فاضلین کی ذمہ داریاں اور سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل اول

دینی مدارس کے طلبہ کے علمی و عملی اوصاف اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل اول

دینی مدارس کے طلبہ کے علمی و عملی اوصاف اور سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

مبحث اول: دینی مدارس کے طلبہ کے علمی اوصاف

دینی مدارس کے فضلا اور طالب علموں کا علوم اور فنون کے میدان میں اعلی معیار پر فائز ہونا ضروری ہے۔ مسلم معاشرے کو جو اہمیت انسانی سماج میں حاصل ہے بعینہ وہی مقام و مرتبہ اہل علم طبقہ کو مسلم معاشرہ میں بھی حاصل ہے۔ دینی مدارس کے فضلاء اور طالب علموں کو دوران تعلیم اپنے پیش نظر بلند مقاصد رکھنا ہوں گے جس کے سبب وہ خود کو علوم اور فنون میں باریک بینی اور کامل عبور حاصل کر کے مسلم معاشرہ کو انسانی سوسائٹی میں بلند مرتبہ پر فائز کرنے میں بنیادی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ موجودہ دور میں مسلمانوں کو علمی میدان میں جس پسپائی کا سامنا ہے اور اس کے مضمرات سے مسلم معاشرہ نبرد آزما ہے کا دروازہ بھی اسی صورت میں مغلق ہو سکتا ہے جب مسلم اہل علم اپنی علمی و فنی لیاقت و امتیاز ثابت کر کے علوم اور فنون میں تحقیق و جستجو کے اعلیٰ مقام پر خود براجمان ہونگے۔ اس سلسلہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے افکار کو اساسی طور پر درج کیا جائے گا بعد ازاں مولانا کے افکار و تصورات میں ترمیم و اضافہ سے متعلق دیگر معاصرین کے خیالات کو بھی زینت مقالہ بنایا جائے گا۔

صحابہ کرام اور طلبہ مدارس کے علم کا فرق

مدرسہ نبویؐ (الصفہ) کے طلبہ صحابہ کرامؓ اور موجودہ دور کے طلبہ کے علم میں فرق یہ ہے کہ صفہ کے طلبہ مخففات وعلامات کی تعلیم حاصل نہیں کیا کرتے تھے بلکہ حقیقی و عملی اور فطرت کے عین اصولوں کے مطابق زیور تعلیم سے آراستہ ہوئے تھے۔ انہوں نے پہاڑ، دریا، اشیاء کے نام یا تصاویر نہیں دیکھی تھیں بلکہ عملی طور پر انہوں نے پہاڑوں کی بلندی و مضبوطی اور دریاؤں کی وسعت و گہرائی کو بنفس نفیس علم حاصل کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ صحابہ کرام نے ایثار و قربانی، عدل و امانت اور محبت کے معانی لغت سے معلوم کرنے کی بجائے عملی طور پر ان کے مظاہر عہد نبویؐ میں کیے ہیں۔ حضرت ابو طلحہ انصاریؓ نے آپؐ کے مہمانوں کو اپنے گھر لائے تو معلوم کیا کہ کھانے کو کچھ ہے تو بتایا گیا کہ بچوں کا کھانا موجود ہے تو انہوں نے کہا بچوں کو سلادو اور دیا بجھا کر مہمانوں کے ساتھ کھانے کے دستر خوان پر بیٹھ گئے تا کہ ان مہمانوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ حضرت ابو طلحہ کھانا نہیں کھا رہے۔ اسی ایثار کے مظاہرہ کرنے کی مناسبت سے قرآن کریم میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی" وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ "[1]

حضرت عبداللہ بن رواحہؓ خیبر میں فصل کا غلہ لینے گئے تو یہودیوں نے ان کو رشوت دینے کی کوشش کی تو انہوں نے انکار کر دیا اور خود یہودیوں کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا کہ نہ ان سے کم وصول کیا نہ زیادہ، اسی بنا پر یہودی پکار اٹھے تھے کہ عدل تو اس کو کہتے ہیں۔ اسی طرح حضرت خبیبؓ کو پھانسی کے تختے پر بدبخت کافر نیزہ مارتا اور پوچھتا کہ کیا تم اس کو پسند کرتے ہو کہ تم کو رہا کر دیا جائے اور تمہاری جگہ پر رسول اللہؐ ہوں؟ تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ میں تو اس پر بھی تیار نہیں کہ مجھے رہائی ملے اور اس کے بدلہ میں رسول خداؐ کے قدم مبارک میں کانٹا بھی چبھے اسی کو محبت کہتے ہیں۔

1۔سورت الحشر، 9/59

معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کا علم وسیع تو نہیں تھا مگر گہرا اور پختہ ضرور تھا اور دوسرا یہ کہ ان کا علم حقیقی و تجربی تھا مگر موجودہ دور میں علمی موشگافی و بات کی کھال اتارنے کی کوشش تو موجود ہے مگر اس کے عملی اثرات مفقود و ناپید ہیں۔ اسی حقیقت پسندی کا مظہر ہے کہ صحابہ نے کم وقت میں دنیا کی سپر طاقتوں کو اپنی ایمانی قوت سے زیر کر کے پاش پاش کر دیا۔[1]

وسعت نظر

دینی مدارس کے فضلاء، اساتذہ اور طلبہ پر ضروری ہے کہ وہ انسانی معاشرے کی خدمت کے لیے خود کو علمی و عملی تفوق کے مقام پر فائض کریں۔ طلبہ کا علمی و فکری معیار ماضی قریب کے متفوق علماء کے ہم پلہ نہ بھی ہو تو کم از کم ان کے قریب تر ضرور ہو۔ دینی حلقوں میں مثالی علماء کی اشد ضرورت ہے۔ بصورت دیگر اس کے جو مضر اثرات ظاہر ہونگے اس کے بارے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ:

> "برصغیر میں مسلمانوں نے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی یا ان سے نسبت رکھنے والی شخصیت، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی یا ان سے نسبت رکھنے والی شخصیت پیدا نہ کی، علمی و فکری حیثیت سے مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا، مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری جیسے فضلاء و وسیع و عمیق النظر عالم، علمی رسوخ اور وقت کے تقاضوں سے سے باخبری میں مولانا محمد کفایت اللہ اور ابوالحاسن مولانا محمد سجاد بہاری، ذہنی و اخلاقی بلندی اور خودداری و خود اعتمادی کے لحاظ سے مولانا ابوالکلام آزاد، روحانی و تربیتی و دعوتی لحاظ سے حضرت مولانا محمد الیاس، مولانا محمد یوسف کاندھلوی، مولانا وصی اللہ فتح پوری جیسے داعی و مربی نہ پیدا ہوئے تو یاد رکھیے ہندوستان میں علماء ہی کا وقار نہیں، دین و علم کا وقار اور پھر ایک قدم آگے بڑھ کر ملت اسلامیہ کا وقار بھی خطرے میں پڑ جائے گا، اور ان دینی اداروں اور مدارس کی افادیت و ضرورت بھی مشکوک ہو جائے گی، جو اسی طبقہ کے افراد پیدا کرنے اور اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔"[2]

ماضی کے علماء کی خصوصیات میں ضبط و تحمل، خودداری و خود اعتمادی، ایک دوسرے سے نیکی کے کاموں میں تعاون، اللہ تعالیٰ سے قریبی تعلق، بلند نظری و کشادہ دلی، زہد و استغناء، جرأت و استقامت اور حق گوئی و بے باکی، دوست و دشمن کے مابین حسن سلوک کا عملی مظاہرہ نظر آتا ہے اس کی مثال غیر مسلم اہل علم میں ملنا ناممکن بات ہے۔ لہذا فضلاء مدارس اور طلبہ کو اپنے تعلیمی سفر کو جاری رکھنے کے ساتھ مذکورہ بالا شخصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے علمی و عملی نمونہ بننے کا جذبہ شامل رکھنا چاہیے۔[3]

علوم میں مہارت

دینی مدارس کے طلبہ اور متعلقین کو اس بات کا استحضار بھی کرنا چاہیے کہ وہ زیادہ دیر تک انسانی اذہان کو طفل تسلیوں اور ماضی کے کارناموں سے متاثر و مانوس نہیں کر سکتے۔ دینی مدارس، دینی جماعتوں اور مسلم معاشرے کی بقاء کے لئے علمی و فکری استمرار و استحکام و تسلسل قائم رہنا چاہیے

1۔ مدارس اسلامیہ، ص65-69

2۔ حالات کا نیا رخ، ص14

3۔ حالات کا نیا رخ، ص15

۔بطور مثال ماضی کے احوال یا چند ایک طلسماتی شخصیات کا حوالہ کافی نہیں ہے کہ انسانی معاشرہ مسلمانوں کی خدمات اور اس کے وجود کی اہمیت کو تسلیم کر سکیں۔ انسانوں کو اس سے کوئی سر وکار نہیں کہ مسلمانوں نے امام غزالی، امام شافعی، امام ابو حنیفہ، امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ جیسی عظیم علمی و فکری شخصیات کو جنم دیا اور مسلمانوں نے سمر قند و بخارا، غرناطہ، اشبیلیہ اور دہلی وغیرہ آباد کیے۔ اسی سبب علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک خط میں تحریر کیا ہے کہ اس زمانے کا مجدد وہ شخص ہے جو اسلامی قوانین کی دوسرے مروج قوانین پر ثابت کریں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا مسلم معاشرہ علامہ اقبال کی ساٹھ برس پہلے کی بات کی روشنی میں اپنے عائلی قوانین، انفرادی و اجتماعی حقوق کی حفاظت کی تگ و دو کرتا نظر آرہا ہے۔ لہٰذا مسلم طلبہ کے کاندھوں پر عظیم ذمہ داری ہے کہ وہ علوم و فنون پر مطالعہ اور محنت کے ذریعہ کمال مہارت حاصل کریں اور عصر حاضر کے جدید تقاضوں اور مسائل کا ادراک کر کے ان کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حل پیش کریں۔ دینی و عصری علوم کے درمیان ربط و تعلق بے لوث انداز سے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ [1]

دین کی تازگی

دینی مدارس کے طلبہ و فضلاء پر اس بات کا منکشف رہنا لابد ہے کہ دین زندہ ہے اور زندوں سے قائم بھی۔ اس بنا پر یہ بات بھی مستحضر ہو جاتی ہے کہ وقت و حالات کے بدلنے کے ساتھ پیش آمدہ مسائل کا ہمہ جہتی علوم اور فنون کے ذریعہ سے جواب دیا جائے۔ اگر کوئی فرد خود سے جواب فراہم نہ بھی کر سکے کم از کم سائل کو کسی صاحب علم کی طرف رہنمائی ضرور کرے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ سائل سوال کرے کہ کنویں میں فلاں جانور گر گیا ہے تو بتائیں اب اس کو کیسے پاک کیا جائے اور مسئول یہ جواب دے کہ ہمارے یہاں ایسے ایسے بلند پایہ اہل علم پیدا ہوئے کہ ان کی شہرت سے تاریخ روشن ہے یا کہے کہ ہمارے ہاں امام ابو حنیفہ، امام زفر پیدا ہوئے اور بلند پایہ فقہی کتب بدائع الصنائع، البحر الرائق اور فتاویٰ عالمگیری کے مصنف پیدا ہوئے، تو سائل فوراً جھٹک کر کہے گا کہ مجھے میرے سوال کا جواب دید یجیے نماز کا وقت نکلا جاتا ہے اب کنواں کیسے پاک ہو گا۔ مسئول کو جواب نہیں آتا تو وہ باتوں میں کسی کو گم کرنے کی سعی کرے گا تو یہ غلط ہو گا۔ اسی طرح کوئی شخص اگر کوئی عبارت یا شعر سمجھنے کا متمنی ہو اور اس کو بتایا جائے کہ عبدالقادر جرجانی، ابو علی فارسی، امام زمخشری اور حریری جیسے بلند اہل لغت مسلمانوں میں پیدا ہوئے تو اس سے سائل کا اطمینان نہیں ہو گا۔ سائل کی تسلی و تشفی جبھی ہو سکتی ہے جب اس کو اس کے سوال کا جواب دیدیا جائے یا اس کو متعلقہ اہل علم سے رجوع کا مشورہ دیا جائے اور اس میں کوئی قباحت نہیں، کیونکہ عربی کا مقولہ ہے "لکل فن رجال" ہر فن کا ماہر الگ ہوتا ہے۔ ایسے میں طلبہ پر لازمی ہے کہ وہ اپنے ملک و شہروں میں علمی و فکری فوقیت حاصل کرنے کی سعی کر کے دین کی تازگی کو دوام بخشیں۔ [2]

مقصد کا تعین

عصر حاضر میں دینی مدارس کے طلبہ کے طرز زندگی میں پائی جانے والی افسردگی اچھے اچھوں کو انگشت بدنداں کر دیتی ہے کہ کیا وجہ ہے کہ اسلامی علوم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے والے کی زندگی میں اطمئنان و سکون ناپید ہے۔ اس کا جو بھی جواب دیا جائے وہ تشنہ ہی رہ جاتا ہے کہ معاشرہ سے

1۔ علماء کا مقام، 70-71

2۔ دعوت فکر و عمل، 213-215

الگ ماحول میں رہنے کے بعد معاشرہ کے تلخ حقائق کا سامنا کرنے سے مشکلات کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی مدارس اپنے طلبہ میں فکری بلندی اور مقصد کو متعین اور عالی نصب العین کا احساس اول روز ہی سے اپنے طلبہ کو دلا دیں تو زندگی بھر میں ان طلبہ میں یاس کی کیفیت پیدا نہیں ہو پائے گی۔ دینی مدارس کے طلبہ کا اولین فریضہ اور بنیادی مقصد حیات ہی یہ ہونا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقدس ترین کتاب قرآن حکیم اور حضور نبی رحمت ﷺ کی شریعت مطرہ کے امین و محافظ اور داعی ہیں اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے انہیں اپنا کردار ادا کرنا ہے اور یہ ایسا نصب العین اور مقصد ہے جو طلبہ کو ہر سطح کی سیاسی و معاشی اور معاشرتی فکر سے بالاتر کر دینے کے لئے کافی ہے اور یہ نظریہ حیات طلبہ کو معاشرہ کی تمام تنظیموں اور جماعتوں کے نصب العین سے زیادہ پاک و محفوظ محسوس ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر بات صاف ہے کہ یہ طلبہ دنیا و آخرت دونوں میں ہمیشہ کی ذلت کو سمیٹنے والے بن جائیں گے اور بہتر ہے ان کو اپنا امید ان عمل تبدیل کر لینا چاہیے چونکہ دینی مدارس کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی مشین میں فٹ آنے والے پرزوں کو تیار کرنا نہیں۔[1]

جان و مال کی قربانی

ملت اسلامیہ کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ مال و جان کا ایثار پیش کیا جائے کہ ہر انسان اپنی جان اور مال کو راہ خدا میں وقف کر دے۔ جان کی قربانی اس طور پر پیش کی جاسکتی ہے کہ انسان دین سیکھنے کے لئے وقت نکالے اور اللہ کے راستہ میں نکل کر دین سیکھے، اور دعوت و ارشاد کے راستے میں تکلیف و جفاکشی کا مزہ چکھ لے۔ اور اپنے مال کو دینی مدارس کے قیام اور ملت کی بہبود پر خرچ کر گزرے یاد رکھیں آپ زندہ رہیں یا نہ رہیں مگر جب تک مدارس میں قرآن کریم کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہے گا آپ کو اس کا برابر اجر و ثواب حاصل ہوتا رہے گا۔ انہی مدارس جو کہ اسلام کے قلعے ہیں سے ملت کی حفاظت اور اسلام کے نظام کے قیام کی فضا ہموار ہو گی۔[2]

اساتذہ سے ذاتی تعلق

دینی مدارس کے طلبہ کو یہ بات اپنے دامن میں سمیٹنے کی ضرورت ہے کہ اساتذہ سے ان کا رسمی تعلق نہیں ہونا چاہیے بلکہ طالب علم جبھی کامیاب و کامران ہو سکتا ہے جب اس کا اپنے استاد کے ساتھ بے لوث، والہانہ اور روحانی و قلبی تعلق مستحکم ہو، دنیا کی عظیم ہستیوں کو بطور نمونہ و عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہے کہ اساتذہ کی صحبت نے بہت سوں کو خاک سے اٹھا کر اقبال مندی سے سرفراز کیا، جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ فائدہ پہنچایا وہ یہی استاد سے تعلق کی بدولت حاصل ہوا کہ میں نے فقہ و حدیث اور علمی درک حاصل کرنے کے لئے اساتذہ سے ذاتی تعلق استوار کرنے کا ثمرہ ہی ہے۔[3]

1۔ مدارس اسلامیہ، ص30-34

2۔ نشان منزل، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، س ن، ص54

3۔ پاجا سراغ زندگی، ص34

طلبہ کے کرنے کے دو کام

دینی مدارس کے طلبہ پر لازم ہے کہ وہ یہ دو کام ضرور کریں تو جہاں کہیں بھی ہوں گے دارالعلوم دیوبند و ندوۃ العلماء جیسے بڑے ادارے بھی ان کی کھوج لگا کر اپنے ہاں مسند تدریس پر فائز کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء جیسے بڑے اداروں میں ماہر اساتذہ کی کمی کا احساس بڑھتا جارہا ہے کہ شیخ الحدیث کس کو متعین کیا جائے اس معیار پر پورا کوئی نہیں اتر رہا۔ ایسے میں ضرورت ہے کہ طلبہ یہ نہ دیکھیں کہ کہاں بڑھ رہے ہیں اور کیا پڑھ رہے ہیں وہ جو بھی اور جہاں بھی پڑھ رہے ہیں محنت و جانفشانی سے علم حاصل کر کے اس میں مہارت تامہ حاصل کریں کہ وہ علم و فن کی عرق ریزی و باریک بینی کے رسیا ہو کر علم و فن کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے اور تدریس کی صلاحیت پیدا کر لیں اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ علم و فن میں مہارت و امتیاز کے ساتھ ساتھ تعلق مع اللہ کو پختہ کر لیں تو دنیا والے ان کی قدردانی کا ہمیشہ دم بھرنے لگیں گے۔ کیونکہ دنیا سرسری علم اور عمومی واقفیت سے مسخر نہیں کی جاسکتی اور زمانہ کا تو یہ تقاضا ہے کہ جو چیز نفع مند ہو اس کو وہ بغیر لیت و لعل کے قبول کرلیتا ہے جو جھاگ (زبد) ہو اس کو پھینک دیتا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں ارشاد جل وعلاہ ہے " **فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ** "[1]۔ گویا سمندر و جھاگ کسی فائدہ کا نہیں تو اس کی قدر و قیمت بھی نہیں اگر کسی صاحب علم کو علوم و فنون کے کسی گوشہ پر مقام تفوق حاصل ہو تو وہ کبھی روبہ زوال نہیں ہو سکتا الا یہ کہ اس میں تند مزاجی و بداخلاقی یا کسی پیچ برائی نہ ہو۔ علم کے ساتھ انابت الی اللہ کی ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے چاہنے والوں کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔[2]

1۔سورت الرعد،17/13

2۔پاجا سراغ زندگی، ص161-173

مبحث دوم: دینی مدارس کے طلبہ عملی اوصاف

دینی مدارس کے طلبہ و فضلا کی عملی زندگی کا منفرد و برتر ہونا ضروری ہے کہ معاشرے کے افراد و طبقات ان کی طرف نظر التفات کرکے ان سے درس و عبر حاصل کرتے ہیں۔ دین کا بار گراں کے حاملین اور دین کی تشریح کرنے والوں کا عام معاشرے کے مقابلہ میں سیرت و کردار اجلا ہونا چاہیے کہ وہ عقائد، عبادات اور معاملات کی دنیا میں مثالی کردار کے حامل نظر آتے ہوں۔ فضلاء مدارس کی حیثیت اس قدر نازک ہے کہ ان کا حسن عمل اور بلند کردار معاشرے کو اچھائی اور بہتری کی جانب گامزن کرتا ہے جبکہ ان کی بد عملی و برا کردار معاشرے کو تنزلی کی کھائیوں میں دھکیل دینے کا موجب بن جاتا ہے۔ فضلاء مدارس بہت حساس ذمہ داری پر فائض ہیں جیسے حدیث نبویؐ ہے کہ:

" أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ "[1]۔

ترجمہ: انسان کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اگر وہ درست ہو جائے تو سارا بدن درست ہو جاتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو انسان کا سارا بدن خراب ہو جاتا ہے وہ گوشت کا ٹکڑا دل ہے۔

اسی طرح مسلم سماج میں دینی مدارس کے اساتذہ و طلبہ کو حاصل ہے کہ ان کا عملی کردار اچھا ہو گا تو معاشرے میں بھی خیر و بھلائی فروغ پائے گی اور اگر ان کا کردار کمزور و ناپسندیدہ ہو گا تو لازمی طور پر اس کے سماج پر مضر اثرات ظاہر ہونگے۔[2]

نفس پرستی خدا پرستی پر غالب

دنیا میں موجود ہمہ جہتی برائیوں کا سدباب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ خدا پرستی کی دعوت کو فروغ حاصل ہو اور نفس پرستی کو شکست دی جائے، افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ مسلمان جس کو اللہ نے بہترین امت بنایا اور لوگوں کو نیک راہ پر چلانے اور برائی سے روکنے کا فریضہ انبیاء کی تکمیل کا منصب سونپا آج خود مسلمان ہی نفس پرستی کا اسیر بن چکا ہے۔ حالاں کہ اولین مسلمانوں نے نفس پرستی کو بدترین شکست دیکر خدا پرستی کو اختیار کرکے ابدی راحت کا سامان اپنے دامن میں سمیٹا تھا۔[3]

رزق کا متکفل اللہ

اصحاب علم و فضل (اساتذہ و طلبہ) کو یہ بات ذہن نشین کرنی چاہئے کہ دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دنیا کی تیزی و فراوانی سے مرعوب ہونے سے مجتنب ہوں۔ حصول علم کا بنیادی مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا کا حاصل کرنا اور معرفت حق ہونا چاہئے اگر زندگی کے کسی لمحہ میں بھی اہل علم نے علم کو حصول رزق سمجھ لیا تو علم کی نفع مندی و فیض سے وہ محروم ہو جائیں گے اگرچہ دنیا میں سے ان کو بظاہر کچھ دستیاب بھی ہو جائے۔ اگر انگریزی سیکھ کر کالج و یونیورسٹی کی نوکری حاصل کرنی ہے یا عربی و اسلامیات سیکھ کر خلیج ممالک میں یا کسی کالج و یونیورسٹی میں تقرری کا پروانہ لینا ہے جس کی مدت محدود ہے اور بلآخر ریٹائر ہونا ہو گا اور اس کے بعد چند روپوں پر گذر بسر کرنا ہو گا۔ مگر جس انسان نے علم حاصل کرکے اس علم کے ساتھ اپنا سب کچھ

1۔ الجامع الصحیح البخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرألدينه، رقم الحديث:52، ص:20/1

2۔ حالات کا نیا رخ اور علماء کی ذمہ داری، سید ابو الحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنو، انڈیا، 1418ھ / 1998ء، ص7-8

3۔ تعمیر انسانیت، ص158

وابستہ کر دیا تو وہی ابدی راحت کا مستحق ہو گا۔ ہم نے اہل علم کے دستر خوانوں کو دیکھا ہے کہ وہاں پر ایسے لوگ بیٹھے ہوتے اور ایسے کھانے کے اقسام رکھے ہوتے کہ بادشاہ و امراء کے دستر خوان بھی اس سے محروم رہتے ہیں یہ سب دین کے علم کے ساتھ یکسوئی اور مبنی بر اخلاص تعلق کا نتیجہ ہے۔ علم کے حاصل کرنے کا حقیقی ثمرہ " وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ "[1] کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔[2]

دینی تعلیم اور ذریعہ معاش

ہندوستان اور دیگر مسلم و غیر مسلم ممالک میں دین کی تعلیمات کی حفاظت کے بنیادی اسباب میں سے یہ ہے کہ علماء و فضلاء مدارس دینیہ نے خود کو دین کی دعوت و اشاعت کے لیے خود کو خاص کر دیا باوجود زمانے کے طعن و تشنیع اور الزامات کے انہوں نے مسلمانوں کا عہد حکومت ہو یا کسی اور کا اپنا کلیدی کردار ادا کرنے میں پس و پیش سے کام نہیں لیا چاہے اس کے لیے ان کو ترغیب و ترہیب کے بڑے بڑے مراحل سے کیوں نہ انہیں گذرنا پڑا ہو۔ برصغیر میں 1857ء کی جنگ آزادی کی شکست کے بعد ہندوستان کے شہریوں کے دلوں سے اسلام کی محبت کے نہ نکلنے کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ علماء و طلبہ نے کئی کئی دنوں کے فاقے کر کے اور بھوک کی شدت کو برداشت کرنے کے لئے سینہ پر پتھر باندھنا پسند کر لیا مگر دین کی تعلیم سے دور ہونے کو قبول نہیں کیا۔ موجودہ دور کے حالات کو دیکھتے ہوئے دینی مدارس کے طلبہ بالعموم اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ بالخصوص اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ علم و فن کی معرفت اور عربی زبان پر عبور حاصل کرنے کے بعد ایسا ہرگز نہ کریں کہ وہ انگریزی پڑھنے والوں کی طرح یورپ و افریقی ممالک میں اپنے علم کو روزگار کا وسیلہ بنالیتے ہیں تو اب مدارس کے طلبہ بھی عربی بول چال اور کتاب سیکھ لینے کے بعد حصول ملازمت کے لیے عرب ملکوں میں منتقل ہونا شروع کر دیں۔ گویا ان کو دین اسلام کی خدمت کرنا جس کا معاوضہ کم ہے کو ترک کر کے صرف پیسہ بنانے کے لیے عرب ملک میں نوکری شروع کر دیں تو یہ بالکل درست بات نہیں ہے۔ (افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ صرف ندوۃ العلماء کے طلبہ ہی نہیں اب اکثریت دینی تعلیم حاصل کرنے نوجوان اشاعت اسلام اور دعوت الی اللہ اور فروغ تعلیم سے کنارہ کش ہو کر سرکاری ملازمت کو اختیار کر رہی ہے اور اسی طرح عرب ملکوں میں ملازمتوں کو بھی حاصل کر رہی ہے جب کہ مسلم معاشرہ کو اس وقت شدید حاجت ہے کہ ان کو مادیت پرستی، الحاد و لادینیت کے چنگل سے نجات دلانے کا کوئی سامان کرے۔ راقم) ہمارے ہاں بہت سے ایسے اساتذہ ہیں اگر وہ عرب کو خطوط لکھیں تو ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے مگر وہ صرف دعوت اسلام اور فروغ علم کے لیے ایسا نہیں کرتے کہ انکی ضرورت عرب سے زیادہ ان کے اپنے ملک کے مسلمان معاشرے کو ہے کہ نسل نو کی دینی و علمی اور اخلاقی و فکری رہبری کا فریضہ انجام دینا اخروی اجر و ثواب کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے۔[3]

1۔سورت التوبہ،72/9

2۔ طالبان علوم نبوت، ص234-235

3۔ علماء کا مقام، ص172-173

انفرادی واجتماعی طور پر حفاظت دین

دینی مدارس کے فضلاء کے پیش نظر آنحضرتؐ کی یہ دعاہمیشہ رہنی چاہیے کہ "**استودع الله دینک وامانتک وخواتیم عملک**"[1]۔ترجمہ: میں اللہ کے سپرد کر تاہوں آپ کادین، اور آپ کی امانت اور آپ کا خاتمہ عملوں پر ہو۔اس دعائے نبویؐ میں درحقیقت یہ پیغام دیا گیاہے کہ انسان کو اپنے دین کی حفاظت کرنی چاہیے اور معاشرے میں جس بھی حیثیت سے وہ مقام ومرتبہ کا حامل ہے اس کو امانت و دیانت سے انجام دے اور اپنے بہتر خاتمے کی فکر اس کو لاحق رہے۔یہی کلمات جمع کے صیغہ کے ساتھ بھی وارد ہوئے ہیں۔اس سے واضح ہو تاہے کہ انسان نا صرف یہ کہ خود اپنی ایمان وایقان کی حفاظت کا انتظام کرے بلکہ اس کے ساتھ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرہ کے افراد کے ایمان کو محفوظ بنانے کے لیے انتظام کرے۔یہی فریضہ چودہ سوسال سے دینی مدارس کے فضلاء اداکر رہے ہیں انہوں نے اپنی راحت و آسائشوں کو لوگوں کی اصلاح کی فکرمندی میں قربان کر دیااور شب وروز اشاعت دین اور فروغ علم میں مصروف رہے آج بھی مسلم معاشرے میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ محلوں ،قصبوں، شہروں اور ملکوں میں نوجوان نسل کے ایمان وایقان کی حفاظت کا سامان مہیا کیاجائے۔اس فرض کو اداکرنے کے لیے دینی مدارس کے طلبہ کا کردار اہمیت کا حامل ہے۔[2]

کچھ کرنے کا عزم

دینی مدارس کے طلبہ کے لئے لازم ہے کہ وہ رضاکارانہ طور پر اپنے دل ودماغ میں یہ بات راسخ کرلیں کہ ان کو عملی زندگی میں کامیابی سے قدم رکھنے کے لئے محنت وجدوجہد کرنی ہے خواہ اس کے اسباب مہیاہوں یانہ ہوں یعنی مدارس میں قیام وطعام اور علاج ومعالجہ کا بہتر انتظام میسر ہو۔اگر طلبہ اپنے اندر اس عزم کو پختہ کرلیں گے تو ان کو کامیابی کی منازل طے کرنے سے کوئی سنگ گراں روک نہیں سکتا جبکہ طالب علم اگر اپنے اندر یہ بات بیٹھالے کہ وہ مدارس میں صرف وقت گذارنے آیاہے تو اس سوچ کو بدلنے کے لئے والدین، اساتذہ، مدرسہ اور منتظمین جتنا بھی کوشش کرلیں وہ بار آور ثابت نہیں ہوگی۔مدارس کے طلبہ جو محنت ولگن سے دین کا علم حاصل کرتے ہیں ان کے لئے سورت الم سجدہ کی یہ آیت بشارت ہے کہ "**وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا ۖ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ**"[3] اور حضرت یوسفؑ کا یہ قول بھی اطمینان وتسکین قلب کا موجب ہے کہ "**إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ**"[4]۔حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا کہ اللہ نے ہم پر مہربانی کی ہے اور وہ پرہیز گاراور صبر کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔[5]

1۔مشكاة المصابيح ، محمد بن عبد الله الخطيب العمري، أبو عبد الله، ولي الدين، التبريزي (المتوفى: 741ھ) ،المحقق: محمد ناصر الدين الألباني ، المكتب الإسلامي - بيروت ، 1985 ،الفصل الثانی،رقم الحدیث،2436،ص:753/2

2۔علماء کا مقام،165-166

3۔سورت السجدة،24/32

4۔سورت یوسف،90/12

5۔تعلیمی سال کے آغاز پر طلبہ سے خطاب، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، س ن، ص4تا13

ذاتی محنت، خدا طلبی

دینی مدارس کے طلبہ پر لازم ہے کہ وہ اپنے اندر اخلاقی صفات کو اجاگر کریں کہ تاریخ کے صفحات کی ورق گردانی کر کے دیکھ لیں کہ کسی بھی بڑی شخصیت نے ترقی و نیک نامی حاصل کی ہے تو اس میں توفیق الٰہی کے ساتھ ان کی ذات محنت و لگن اور جستجو کو بنیادی دخل ہے۔ مدارس کے بڑے چھوٹے ہونے یا اساتذہ کے بڑے ہونے کا اثر جبھی ہو سکتا ہے جب طالب علم میں کچھ کرنے کا عزم ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ مدارس کے طلبہ حصول علم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی خشیت و رضامندی حاصل کرنے کو اپنا مقصد بنالیں کیونکہ اس کے بجز دنیا میں سب کچھ بھی حاصل کر لیا جائے تو کچھ فائدہ کا نہیں کہ انسان مفسر، فقیہ، خطیب و ادیب یا ناموری و شہرت ہو جائے۔ اصل میں خدا تعالی کی معرفت و رضا کو حاصل کرنا ہی بہترین ثمرہ حیات ہے۔[1]

طلبہ کا مقام امتیاز

دینی مدارس کا مقام و مرتبہ متفق ہے تمام معاشرتی اکائیوں سے کیونکہ اس کا رشتہ منسلک و مرتبط ہے نبوت محمدیؐ سے تو ایسے میں ان کا کردار اور کام اہمیت کا حامل ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ کا علوم نبوت پر کامل ایمان اور غیر متزلزل یقین ہونا چاہیے کہ سماج کی بڑی سے بڑی مادہ پرستانہ پیشکش اور مرعوب کرنے کی کوششوں کا گرویدہ ہونے کی بجائے ہر طرح کے فکر و فلسفہ اور علوم جو انسان کا رشتہ دین سے توڑنے کے خواہشمند ہوں سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ دینی مدارس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کا مطالعہ علم نبوت وسیع اور عمیق ہونے کے ساتھ اسلامی تعلیمات کو عملی زندگی میں اختیار کرنے کا جذبہ ہو جبھی دینی مدارس اور اہل مدارس کا کردار معاشرہ میں مثبت متمیز ہو گا کہ بجز باطنی اصلاح کے کوئی بھی علم نفع مند نہیں ہو سکتا۔ بدقسمتی سے موجودہ دور میں اہل مدارس اس امر سے غافل ہو چکے ہیں کہ یہی کیفیت باطنی ہی نے صحابہ کرامؓ کو وقت کی سپر ور طاقتوں کو تسخیر کرنے کی سعادت مندی عنایت کی۔[2]

دین کو نگاہ عزت سے دیکھنے کی ضرورت

مسلم معاشرہ پر کسمپرسی کی کیفیت طاری ہو چکی ہے کہ وہ دینی مدارس میں کو بھیجنے کا مقصد یہ طے کر بیٹھے ہیں کہ ان کے پاس سکولز کی بھاری بھر کم فیس ادا کرنے، متعین یونی فارم دینے، یونین و کلب وغیرہ کی فیس دینے کی رقم موجود نہیں اگر ہوتی تو وہ بچوں کو عربی مدرسہ کی بجائے کسی سکول میں بھیج دیتے، والدین کے ذہن میں اس طرح کا خیال پیدا ہونا اور خود طلبہ کے دلوں میں سکول و کالج کے بچوں کو دیکھ کر دل میں یہ گمان کرنا کہ کاش ہم بھی ایسا لباس پہنتے اور سکول جاتے، ان خیالات کو تصور میں لانا بھی حرمان نصیبی کا باعث ہو سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ والدین و طلبہ دونوں دینی مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے اور دلانے کے مقصد کا تعین اس طور پر کریں کہ یہ ان کی خوش نصیبی و عنایت الٰہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بچے کو دین سیکھنے کی توفیق دی ہے، دین سیکھ کر بچہ دوسروں کو دین کی تعلیم دیگا، دین کی دعوت کا اہتمام کر کے منکرات کا راستہ روک کر اللہ کی خوشنودی

1۔ پاجا سراغ زندگی، ص34-36

2۔ پاجا سراغ زندگی، ص96-99

حاصل کرے گا، دینی تعلیم کی برکت سے گھر میں خیر وبرکت آئے گی اور قبر وآخرت کی منازل دین کی تعلیم کے طفیل بآسانی طے ہو جائیں گی۔ الغرض اللہ تعالیٰ کے تمام شعائر کا دل وجان سے احترام اور عزت کرنے کی ضرورت ہے۔ [1]

بے نیتی وبے دینی

دینی مدارس کے طلبہ کو دینی تعلیم حاصل کرتے وقت بے نیتی وبد نیتی سے احتراز کرنا چاہئے اگرچہ دینی مدارس کے طلبہ میں بظاہر علم دین حاصل کر کے پیسہ کمانے یا خود نمائی وبرتری کرنے کا خیال تصور میں آنا عبث معلوم ہوتا ہے تاہم بے نیتی کا چہار سو دور دورہ ہے کہ طلبہ سے استفسار کیا جائے کیا کیوں تعلیم حاصل کر رہے ہیں ؟ تو کہیں جواب ملتا ہے ابھی سوچا ہی نہیں ؟ اور کبھی جواب ملتا ہے والدین نے کہا تو ہم تعلیم حاصل کر رہے ہیں وغیرہ تو لازم ہے کہ طلبہ کی نیت درست ومتعین ہو کہ وہ دین اللہ کا دین پڑھ رہے ہیں، اس کو سمجھ کر دینی نشر واشاعت اور تبلیغ کا فریضہ انجام دیں گے ، اسی طرح طلبہ کو بے دینی وبے شعوری کے عذاب سے بھی نجات حاصل کرنی چاہئے کہ اس کے اثرات بہت مضر ہیں۔ [2]

سعادت مندی پیدا کریں

دینی مدارس کے طلبہ کو اپنے اندر سعادت مندی پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ دین کا علم حاصل کر رہے ہیں اس کا بدیہی تقاضہ ہے کہ اساتذہ، مدرسہ، علماء، کتب اور اپنے بڑوں کا احترام کیا جائے، اسلام میں اب بہت زیادہ اہمیت کا مقام رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے " **ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ** "[3] شاہ صاحب کی اس بابت تحقیق ہے کہ شعائر اللہ سے مراد کتاب اللہ، بیت اللہ اور نماز ہے، البتہ ان کے ساتھ ذیلی شعائر بھی ہیں جن کا ادب واحترام لازم ہے، سکول وکالج کے بچوں کی طرح بننے سے اجتناب کیا جائے کہ نہ کتاب کا ادب، نہ والدین کا ادب، نہ استاد کا احترام بلکہ دینی مدرسہ کے طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ علمی طور پر فائق ہونے کے ساتھ عملی طور پر بھی دوسروں سے فائق ہونا چاہئے اور ہر اس کا حقیقی طور پر ادب کرے جو علم وعمل کے شعبہ سے متعلق ہیں، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ معاشرہ کے دیگر افراد بھی علم دین کی طرف متوجہ ہونگے اور اپنے بچوں کو دین کی تعلیم سے روشناس کرانے کی فکر کریں گے۔ [4]

سید احمد شہیدؒ کی تحریک کی امتیازی خصوصیات

دینی مدارس کے طلبہ پر لازم ہے کہ وہ برصغیر میں اسلامی تعلیمات کو کامل روح کے ساتھ زندہ رکھنے کی کوشش کرنے والے امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے پیروکار اور پھر ان کے تلامذہ واخلاف کے نقش پا پر چلنے کی سعی کرنی ہوگی کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک نے پورے برصغیر میں اسلامی تعلیمات کا غلغلہ برپا کر دیا تھا کہ چہار سو اسلام کی بہار تھی۔ سید صاحب کی تحریک کی چار بنیادی خصوصیات تھیں اول توحید خالص ، دوئم اتباع سنت، سوئم تعلق مع اللہ، چہارم اعلائے کلمۃ اللہ۔ یعنی سید صاحب نے اپنے مریدوں کو شرک جلی وخفی سے بچتے ہوئے خالص توحید پر کاربند رہنے کی تلقین کی اور زندگی کے تمام اعمال کو حضور نبی اکرمؐ کے اسوہ کے مطابق گذرانے کی دعوت دیں۔ اس کے ساتھ ہر آن وگھڑی رجوع الی

1۔ طالبان علوم نبوت، حصہ دوم، ص87-89

2۔ طالبان علوم نبوت، حصہ دوم، ص49-50

3۔سورت الحج، 32/22

4۔ طالبان علوم نبوت، ص109

اللہ کی ترغیب دینے کے ساتھ اپنے متعلقین کو جہاد کے جذبہ سے سرشار کر دیا تھا چاہے وہ جہاد بالقتال ہو یا جہاد بالنفس۔اس ساری کوشش کا سرا ابتداء و نہاں ایک ہی تھا کہ دین کو اختیار کرنے کے ساتھ جہاں بھر میں غالب کرنے کی سعی کی جائے۔[1]

تحقیق و جستجو

کسی بھی ملک و ملت کے پاس کس قدر قیمتی ذخائر اور مادی اسباب و وسائل کی فراوانی ہو اور تعلیمی اداروں کی کثرت،اس ملک و ملت کا نام و مقام اس وقت تک بلند نہیں ہو گا تاوقتیکہ وہاں کے اہل علم تحقیق و تجسس کے ماہر ہوں۔عصر حاضر میں علم و معرفت کے رہروں کو عالی مقام پر متمکن کیا جاتا ہے جو قوم یا جو ملک علم و تحقیق کی دنیا میں آگے ہے سبھی اس کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہی نہیں بلکہ اس کے نقش پا پر چلنے کو سعادت جانتے ہیں۔اس کے ساتھ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ مسلم ملکوں کے بہت سے نوجوان علم و فن کی دنیا میں ناموری حاصل کر کے اپنے ممالک اور اپنی ملت کی خدمت گذاری کرنے کی بجائے امریکہ و یورپ اور روس کو اپنا مسکن بنا لیتے ہیں جس کی بدولت یہ غیر مسلم ممالک سیاسی و اقتصادی اور علمی و فکری طور پر مسلم ممالک کو انہی کے نوجوانوں کی صلاحیتوں کی بدولت اپنے عفریت میں جکڑ لیتے ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلم نوجوان علم و معرفت کی گنجلک و باریکیوں سے نبرد آزمائی کے بعد اپنے ملک اور اپنی ملت کی خدمت کے لئے خود کو وقف کریں اگرچہ اس میں مادی منفعت کم حاصل ہو گی مگر بہت جلد دوسرے ممالک مسلمانوں کو اپنا مقتدا تسلیم کر لیں گے۔[2]

1۔ ایضاً، حصہ دوم، ص147-148

2۔ حدیث پاکستان، ص109-117

فصل دوم

دینی مدارس کے طلبہ کے اخلاق واوصاف اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل دوم

مدارس کے طلبا کے اخلاق واوصاف اور سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

دینی مدارس کے طلبہ کے اخلاق واوصاف بلند وعالی ہونے چاہیں کیونکہ انہوں نے دین کی دعوت کا فریضہ دنیا بھر کے لوگوں تک پہنچانا ہے ، کبر ونخوت، بغض وعداوت، غیبت وچغل خوری، کاہلی وتساہل پسندی جیسے امراض مضرہ سے نجات حاصل کرکے عجز وانکساری، جان فروشی وجفاکشی، محنت ولگن، محبت والفت کے پیکر ہونے چاہیں تاکہ سماج ان کو دیکھ کر کہہ اٹھے کہ اللہ والوں کی صفات عالیہ یہی ہیں، ایسا کیوں نہیں ہونا چاہیے ہادی عالمؐ کے طرز حیات کو قرآن نے اسوہ حسنہ قرار دیا اور آقائے نامدارؐ کے اخلاق عالیہ کا شاہد بھی خود قرآن حکیم ہے اور خود آنحضرتؐ کے ارشادات میں بھی اچھے اخلاق انفرادی واجتماعی زندگی میں اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ لہذا طالبان علوم نبوت کو سیرت رسولؐ اور سیرت صحابہ کرام واہل بیتِ اطہار اور اللہ والوں کی اچھی صفات کا ناصرف مطالعہ کرنا ہوگا بلکہ ان کو عملی طور پر اختیار بھی کرنا چاہیے۔

نوجوانوں کی پریشانی کی وجہ

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھا ہے کہ عمان کے وزیر اوقاف کامل الشریف اور سعودری عرب کے عالم شیخ احمد جمال اور مجھ سے ریڈیوں کے مکالمے میں سوالات کیے گئے کہ نوجوانوں کی پریشانی کی وجہ کیا ہے تو میں نے جواب دیا کہ زندگی کا تضاد، ایک وقت اتنی متضاد چیزیں دیکھتے ہیں، گھر کا نقشہ کچھ، باپ دادا کی روایت کچھ سنتے ہیں، اسکول وکالج میں کچھ پڑھتے ہیں، ادب ولٹریچر کچھ دیکھتے ہیں کہ اس میں دعوت کچھ اور ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر جو تفریح کے پروگرام سنتے ہیں وہاں کچھ کہا جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زندگی تضادات کا مجموعہ بن جاتی ہے اب ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلم ممالک کے نظام زندگی سے ان تضادات کا خاتمہ کیا جائے بصورت دیگر کنفیوژن کا شکار معاشرہ کبھی بھی ترقی نہیں کرسکتا۔[1]

علامہ اقبالؒ نے اہل علم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ

اے پیر حرم! رسم ورہ خانقہی چھوڑ	مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت	دے ان کو سبق خودشکنی خودنگری کا
توان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے	مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی	دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا[2]

1۔ نظام تعلیم، 18-19

2۔ ضرب کلیم، علامہ اقبال

محبوبیت و مسخر کرنے کا نسخہ

دینی مدارس کے فضلاء اور طلبہ کو معاشرہ میں اپنا امتیازی وعالی مقام پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر تین امتیازی صفات پیدا کر لیں۔ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وقت وحالات اور زمانہ کس قدر کروٹیں کیوں نہ لے لے اس کا اثر ان تین صفات کے حاملین کی مقبولیت کو کوئی مانند نہیں کر سکتا۔ پہلی صفت یہ ہے کہ طالب علم نافع بن جائیں۔ جب کسی کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ کسی انسان سے ان کو فائدہ فلاں فائدہ پہنچ سکتا ہے تو وہ انسان پہاڑ کی چوٹی یا صحرا کی دھول میں کیوں نہ چھپا بیٹھا ہو اس کو تلاش کر کے اس سے استفادہ حاصل کیا جائے گا۔ دوسری چیز استغناء و بے غرضی۔ طالب علم کو چاہیے کہ وہ بے غرض ہو کر دین کی دعوت کو فروغ دینے میں محو ہو جائے اور کسی سے کچھ بھی طلب نہ کرے تو خود انسانیت اپنا سب کچھ اس پر نثار کر دیگی۔ اس کے برخلاف اس نے مانگنے کا طریقہ اختیار کیا تو لوگوں کی نظروں میں اس کا مقام کم بلکہ ختم ہو جائے گا۔ تیسری چیز یہ ہے کہ طالب علوم عالی ہوں یا آلی ان میں کمال مہارت حاصل کرلے تب بھی معاشرہ اس کے گرد پروانوں کی مثل جمع ہو جائیں گے۔ چاہے وہ اس کی تشہیر نہ بھی کرے۔[1]

اپنی درس گاہ پر ناز

کوئی بھی بڑی سے بڑی یونیورسٹی و جامعہ خواہ جامعہ ازہر ہو جامعہ زیتونہ یا پھر یا معہ اسلامیہ مدینہ منورہ وغیرہ یا پھر عرب ممالک کے وہاں جا کر علم سے شناوری اور عبور حاصل ہو جائے گا تو یہ محض وہم ہے حقیقت یہ ہے کہ جن طلبہ نے اپنے اساتذہ اور اپنے تعلیمی ادارے پر فخر وناز کیا اور اس سے خود کو مرتبط کر لیا تو وہی طلبہ ملک وبیرون ملک اپنا انفرادی و امتیازی مقام تسلیم کرانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اسی ہندوستان میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے والوں کے قلم سے ایسی تصنیفات تیار ہوئیں ہیں کہ خود عرب ممالک کے علماء وادباء عزت واحترام اور محبت کے ساتھ ان کا مطالعہ کرتے نظر آتے ہیں۔ دینی مدارس کے طلبہ کو یہ بھی صفت اختیار کرنی چاہیے کہ طلبہ کے مابین محبت واخوت اور الفت کا رشتہ اس طور پر استوار ہو کہ انہوں نے ایک ماحول اور ایک تعلیم گاہ میں تربیت پائی اس لئے وہ ندوی فضلا ہیں یا دیوبندی یا علیگ کہ وہ اس نسبت پر فخر محسوس کرنے لگیں۔[2]

علمی طبقہ کو متاثر کرنے کی صلاحیت

دینی مدارس کے طلبہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ معاشرے میں جاری طعنوں پر کان دھننے کی بجائے قدامت پسندی کو اپنے لئے باعث عزت و فخر سمجھیں کہ دنیا کی سرعت وترقی اور مرعوبیت ومادہ پرستی کے باوجود اسلامی تعلیمات سے موئے انحراف کو ناپسند خیال کرتے ہیں البتہ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جس کی نظر ایوان اقتدار اور اعلیٰ مسندوں پر مرکوز ہے اور ان کا ایمان بالغیب، قرآن و حدیث اور سلف صالحین پر اعتقاد کمزور ہے، ایسے اہل علم کی فکر و نظر کو اسلامی تعلیمات پر پختہ کرنے کی صلاحیت پیدا کریں کہ علمی طبقہ کے دلوں میں یہ یقین راسخ ہو جائے زندگی کے ہر ہر قدم پر اسلام رہنمائی ورہبری کا ضامن ہے اس کے بغیر زندگی کا لطف حاصل کرنے عبث ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ

1۔ حدیث پاکستان، ص162 تا167

2۔ طالبان علوم نبوت، ص83-106

طلبہ اسلامی عقائد کی صحت پر عبور رکھتے ہوں، مطالعہ اسلام ان کا راسخ ہو اور اس کے ساتھ اچھے انداز سے دین کی دعوت دینے کی صلاحیت سے معمور ہوں۔[1]

استاد و شیخ کا فیض

دینی مدارس کے طلبہ کے لئے اس بات کو صدق دل سے قبول کرنا ضروری ہے کہ وہ بڑے یا چھوٹے تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کرنے سے کچھ بھی نہیں بن سکتا چاہے وہ دیوبند میں بڑھا ہو یا ندوۃ میں یا جامعہ ازہر و جامعہ زیتونہ میں بلکہ اہل علم کا فیض تبھی سر چڑھ کر بولتا ہے جب اس کا تعلق استاد و شیخ بعد از تعلیم قائم و دائم نہ رہے، طلبہ کے لئے ضروری ہے کہ ان کا تعلق فراغت کے بعد اپنے تعلیمی ادارہ اور اساتذہ و شیوخ سے قائم رہنا چاہئے اور ان کی زندگیوں کے عملی مظاہر کو اپنے سینے میں سمیٹنے کی کوشش کرنی چاہئے چونکہ سلف صالحین اور صحابہ کرامؓ کو جو کچھ دنیا میں شان امتیاز و اقبال مندی اور رضائے الٰہی حاصل ہوئی کہ انہوں نے وقت کی سپر پاور طاقتوں کے بخیے اڑادیئے اور تاتار و ایرانیوں، رومیوں اور فتنہ اکبری کا جنازہ نکال دیا تھا یہ سب اسی صحبت و تعلق کی دولت کا ثمرہ ہے کہ اب بڑے بڑے ادارے موجود ہیں مگر ان کا اثر ناپید و عنقا ہو چکا ہے چونکہ وہ پاکیزہ صحبت اور صالح و بے لوث تعلق مفقود ہو چکا ہے۔[2]

علوم دینیہ کی زمانہ سے مطابقت

دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ علوم دینیہ کی بقا کی کوشش کریں اور اس پر یکسوئی کے ساتھ عمل پیرا ہوں اور اسی میں اپنی سعادت گردانیں، اسی کے ساتھ ایک کام یہ بھی انجام دینا ہے ان کو کہ وہ علوم دینیہ کی زمانہ کے ساتھ تطبیق کی صورت اس انداز سے پیدا کریں کہ زمانے کے جائز و ضروری تقاضوں کی تکمیل کا درس ملتا ہوں اسی کے سبب زمانہ دین کی قیادت و سیادت میں سفر کرنے پر کمربستہ ہو جائے۔ موجودہ دور میں دینی علوم کی طرف التفات کا زوال ہے اور مساجد و مدارس کی کثرت ہو چکی ہے مگر تعلیم و تدریس کی صلاحیت والے کمیاب ہو گئے ہیں اس خلا کو پر کرنا طلبہ کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔[3]

عالم کو معلم ہونا چاہیے

دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو یہ بات ذہن نشین کرنی چاہیے کہ وہ دین کا علم حاصل کرکے عالم بن جائیں گے تو عالم کے لئے ضروری ہے کہ وہ معلم بھی ہو، جیسے حدیث نبویؐ میں بیان ہوا ہے کہ "**انما بعثت معلماً**"[4]۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں، علماء انبیاء کے نائب ہیں تو وہ بھی معلم ہوئے اور انبیاء کی وراثت کا بھی ذکر حدیث میں موجود ہے کہ وہ دینار و درھم کی بجائے علم کو چھوڑتے ہیں۔ حدیث نبویؐ ہے "**ان الانبیاء لم یورثوا دیناراً ولا درھماً ولکن ورثوا العلم** "[5]۔ علما انبیاء کے وارث ہیں تو ان پر ضروری ہے کہ وہ حسب ضرورت

1۔ طالبان علوم نبوت کا مقام، ص142-143

2۔ ایضاً، ص200-201

3۔ طالبان علوم نبوت، ص213

4۔سنن ابن ماجه،فضل العلماء و الحث علی طلب العلم،رقم الحدیث،229

5۔سنن ابوداود،کتاب العلم،باب فی فضل العلم،رقم الحدیث،3641

علم نبوی سے اپنے کو سیراب کریں۔ "فمن اخذہ بحظ وافر" جس شخص کو علم کی دولت دستیاب ہوگئی وہ بہت خوش قسمت ہے۔ طالب علم جو کہ متعلم ہے عالم بن کر وہ معلم بنے گا۔ اب وہ دین سیکھ رہے ہیں تو کل ان کو دین سیکھانا ہے اور ان کو معلم وداعی بن کر مسلم معاشرہ کی رہبری کا فریضہ نبھانا ہے کہ ان کو روزمرہ کے مسائل بتائیں گے، اصلاح معاشرہ کا انتظام کریں گے، شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین کرینگے، نکاح و طلاق، حقوق والدین و حقوق زوجین اور قرابتداروں سے خوش خلقی کا سبق پڑھانے کا فریضہ بھی انجام دینگے۔[1]

احساس ذمہ داری

طالبان علوم نبوت کے لئے ضروری ہے کہ اس میں ذمہ داری کا احساس مستحضر ہو وہ یہ کہ جس قدر جس کے پاس علم ہو گا وہ اسی قدر جوابدہ بھی ہے۔ علم سے متعلق اہم امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ ان کی جوابدہی دینا ہو گی کہ علم کی حفاظت کی ذمہ داری ادا کی جائے کہ وہ محفوظ رہے۔ علم کو موضوع تحقیق و جستجو بنانے کی ذمہ داری ہے کہ اس میں مزید ترقی پیدا ہو۔ علم کے مطابق عمل کرنے کی ذمہ داری ہے کہ وہ فائدہ مند ثابت ہو۔ علم کے طالب کو علم سے بہرور کرنے کی ذمہ داری ہے کہ وہ اچھی طرح سمجھ پائیں۔ علم کی نشرواشاعت کی ذمہ داری ہے تاکہ اس کا فائدہ عوام وخواص میں پھیل جائے۔ علم کے وارث افراد کی تیاری ذمہ داری جو اس کا سلسلہ جاری رکھنے کا انتظام کریں۔ اس کے ساتھ اہم ذمہ داری یہ بھی ہے کہ علم حاصل کرتے وقت اخلاص کی نعمت سے وابستہ اس ذمہ داری کے احساس کے ساتھ ہوں کہ یہ علم اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول کیا جائے۔[2]

تواضع وانکسار

علماء وطلبہ میں ایک نمایاں خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ غرور وخود پسندی کے مرض سے دور ہوں اور تواضع اور انکساری کو اختیار کرتے ہوں کیونکہ کوئی بھی انسان حاصل شدہ علم پر اترانے کا حقدار نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بہت کم علم عطا کیا ہے۔ قرآن میں ارشاد جل وعلا ہے کہ "**وما اوتیتم من العلم الا قلیلا**"[3] ترجمہ: مگر تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرا پایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ علم و علماء کا سلسلہ ازل سے شروع ہو کر ابد تک رہنے والا ہے کہ ہر انسان کچھ علم جانتا ہے اور کچھ سے ناواقف، ماضی وحال اور مستقبل کے علوم کے سینے میں کیا کیا راز پوشیدہ ومضمر ہیں اس سے ہر فرد واقف نہیں اس لئے اس پر اکڑنے کی ضرورت نہیں۔ علم میں انکساری و تواضع کا سبق حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کے واقعہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔[4]

خودداری

دینی مدارس کے طلبہ میں ایک امتیازی صفت یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنا رشتہ علم کے ساتھ جڑنے پر فخر محسوس کرے کہ دنیا کی تمام آسائشیں اور راحت علم کی دولت پر قربان کر دینے کے لائق ہے کہ اللہ کے فضل و کرم کی بدولت انسان کو علم کی نعمت میسر آئی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جس نے قرآن

1۔ طالبان علوم نبوت، حصہ دوم، ص93-94

2۔ تعلیم کی اہمیت، ص84

3۔ سورت بنی اسرائیل، 85/17

4۔ تعلیم کی اہمیت، ص87-88

کریم کا علم حاصل کیا پھر یہ خیال کیا کہ کسی اور کو اس سے بہتر نعمت ملی ہے تو اس نے اس چیز(علم) کو کمتر سمجھا جس کو اللہ تعالیٰ نے عظمت عطا کی ہے۔(احیاء علوم الدین)اللہ تعالیٰ کا فرمان عالی شان ہے کہ " مَن كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا **جمیعاً**"[1] ترجمہ:جو کوئی عزت چاہتاہے تو اسے معلوم ہوناچاہیے کہ عزت ساری کی ساری اللہ تعالیٰ کی ہے۔علماکا مقام و مرتبہ نبوت کے بعد سب سے بڑاہے اس مفہوم کو حضرت عمرو بن العاصؓ نے بیان کیاہے کہ جس نے قرآن کو پڑھا نبوت اس کے دونوں پہلوؤں میں داخل ہوگئی البتہ یہ بات الگ ہے کہ اس پر وحی نہیں آتی۔قرون اولیٰ میں قرآن کریم بغیر معانی ومفہوم اور احکام ورموز سمجھے اور غور وفکر کے صرف تلاوت کرلینا نہیں ہوتا تھابلکہ قرآن کو سمجھ کر پڑھاجاتاتھااس لیے اس دور میں عالم کو قاری ہی کہاجاتاتھا۔ابوالاسود کا قول ہے کہ علم سے زیادہ کوئی چیز معزز نہیں بادشاہ لوگوں پر حکمران ہیں جبکہ علماء بادشاہوں پر۔[2]

بد عملی کا انجام

دینی مدارس کے طلبہ و متعلقین پر لازم ہے کہ وہ حاصل شدہ علم پر عمل کریں بصورت دیگر بد عملی کا مضمرات سے بچنانا ممکن ہو جائے گا،بے عملی کے اثرات بد سے متعلق حضرت ابو درداءؓ کی روایت ہے کہ:

> "اللہ تعالیٰ نے اپنی کسی کتاب میں یا اپنے کسی نبی کے پاس وحی نازل کی کہ ان لوگوں سے کہہ دو جو غیر دینی مقاصد کے لیے دین سیکھتے ہیں،عمل نہ کرنے کے لیے علم سیکھتے ہیں اور آخرت والے عمل سے دنیاطلب کرتے ہیں،جو لوگوں کے لیے بکروں کی کھال(یعنی بے ضرر لباس) پہنتے ہیں لیکن ان کے دل بھیڑیوں کے دلوں جیسے ہوتے ہیں،جن کی زبانیں شہد سے زیادہ میٹھی لیکن دل ایلوے سے زیادہ کڑوے ہیں۔کیاوہ مجھے دھوکا دے رہے ہیں؟اور میرے ساتھ مذاق کر رہے ہیں؟میں اپنی قسم کھاتاہوں کہ انہیں ایسے فتنے میں ڈال دوں گا جس میں بردبار شخص بھی پراگندہ ذہن وششدر رہ جائے۔"[3]

یہاں سے یہ معلوم ہوتاہے کہ دینی علم حاصل کرنے والے کو باعمل ہوناچاہیے اور بد عملی وبد نیتی سے بچناچاہیے بصورت دیگر وہ گرفت الٰہی سے دوچار ہو جانے کا مستحق ہو گا۔

طلبہ میں صفات اربعہ

مولاناسید ابوالحسن علی ندویؒ نے پنجاب یونیورسٹی میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایاکہ طلبہ کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر چار صفات کو لازم پیدا کریں پہلی صفت یہ ہے کہ وہ سیرت کی تعمیر قرآن وسنت اور اسوہ رسولؐ کی روشنی میں کریں کیونکہ اس کے بغیر دینی دعوت دینے اور عملی زندگی میں بہت سی پریشانیوں اور مسائل کا سامنا کرنا پڑئے گا۔دوسری صفت یہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ نوجوان دوسروں کی بجائے خود اپنی ذات کی اصلاح کی فکر کریں،یعنی دوسروں کے عیوب کی جستجو نہ کریں بلکہ خود اپنے عیبوں کو ختم کرنے کی سعی کریں،کوئی کیا کر رہاہے اس سے اس کو فرق نہیں پڑناچاہئیے۔تیسری صفت یہ ہے کہ طلبہ اپنی زندگی میں منفی حصہ کو مثبت سے زیادہ نہ ہونے دیں کہ ہر وقت ہر ایک پر تنقید کرنے کا طرز عمل درست نہیں ہے جس قدر جتنا بھی علم حاصل ہو جائے اہل علم سے اس پر عمل شروع کرناچاہیے نہ کہ نکتہ چینی کی عادت اپنائی جائے۔چوتھی صفت یہ پیدا کرنا

1۔سورت فاطر،10/35

2۔ تعلیم کی اہمیت،ص93

3۔ تعلیم کی اہمیت،ص98

بھی ضروری ہے طلبہ کے لئے کہ وہ اپنا علمی وفنی مطالعہ وسیع اور عمیق کریں۔ کسی بھی شخصیت یا جماعت یا موضوع کا اسیر بننا مستحسن امر نہیں بلکہ حقائق زندگی کو سمجھنے کے لئے ہمہ جہتی مطالعہ کیا جانا چاہیے اور علوم وفنون کے تنوع کو سمجھنے کی سعی کرنی چاہیے۔[1]

فہم قرآن کی سعادت

قرآن کریم کے ساتھ اہل مدارس کا رشتہ مستحکم و قوی ہونا عظیم الشان سعادت مندی کا مظہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کائنات کی ہر شئے کا خالق ہے اس کے کلام کو پڑھنے اور سمجھنے کی توفیق انسان کو مل جائے، اس سعادت مندی پر انسان کو والہانہ وورفتگانہ انداز سے دیوانہ ہو جانا چاہیے کہ اللہ جل شانہ نے اس پر اپنا فضل وانعام لایزل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابی بن کعبؓ کو رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کا حکم ہوا ہے کہ ابی بن کعبؓ سے کہو قرآن پڑھو، اس پر حضرت ابی بن کعبؓ حیرت واستعجاب اور خوشی سے اس قدر نہال ہوئے کہ تڑپ اٹھے اور کہنے لگے کہ اللہ جل شانہ نے میرا نام لیا ہے "او سمانی ربی" اور بیہوش ہو گئے۔ دنیا کی راحت وسکون اور آسانی میسر نہ بھی آئے مگر قرآن کا فہم حاصل ہو جائے خواہ ارادتاً اس کو حاصل کیا جائے یا جبر واکراہً پھر بھی اس سے بڑی خوش بختی کی کوئی بات نہیں ہے۔[2]

1۔ حدیث پاکستان، ص128 تا129

2۔ پاجا سراغ زندگی، ص28-29

فصل سوم

عصر حاضر میں دینی مدارس کے فضلاء کی ذمہ داریاں اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر کا جائزہ

فصل سوم

عصر حاضر میں دینی مدارس کے فضلاء کی ذمہ داریاں اور سید ابوالحسن ندوی کی فکر کا جائزہ

عصر حاضر میں دینی مدارس کے طلبہ اور فضلاء کی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں یہ فصل قائم کی گئی ہے جس میں دینی مدارس کے طلبہ وفضلاء کی زمانہ جدید کے تغیر و تبدل کی روشنی میں پیدا ہونے والے حالات اور استفسارات و چیلنجز سے نبر د آزمائی کرنے کی ضرورت کو بیان کیا جائے گا اور اس کے ساتھ اس اہم امر پر بھی روشنی ڈالی جائے گی کہ طلبہ کو مسلم سوسائٹی میں جو مقام و مرتبہ حاصل ہے اس کو معاشرے کی صلاح اور فلاح کے لئے کیسے مؤثر انداز سے قائم رکھ سکتا ہے۔ طلبہ کی دین سے وابستگی کے معیار کو بھی ذکر کیا جائے گا۔ اس فصل میں بنیادی تصورات مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی آراء کو حاصل ہونے کے ساتھ مولانا کے معاصرین اہل علم کی فکر و آراء کو بھی حسب موقع بیان کیا جائے گا۔

نیت کی درستی

دینی مدارس کے طلبہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ دین کا علم حاصل کرنے میں نیت کا درست ہونا از حد ضروری ہے وہ صرف اور صرف رضا الٰہی کا حاصل کرنا ہے۔ اس کے بجز کوئی بھی خواہش ہو گی تو اس کے اثرات بد ظاہر ہونگے اور دارین میں ذلت صاحب علم کا مقدر بن جائے گی۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے "لوگوں کو فرمایا تھا کہ اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا جب تم ایسے فتنے میں مبتلا ہو جاؤ گے جو چھوٹے کو بڑا اور بڑے کو بوڑھا کر دے اور اس فتنے ہی کو سمجھا جانے لگے پھر کبھی تم اس کو بدل دو تو لوگ نکیر کرنے لگیں! لوگوں نے عرض کیا: ایسا کب ہو گا؟ ارشاد فرمایا: جب دیانت دار کم اور امراء زیادہ ہو جائیں گے، جب فقہاء کم اور علماء زیادہ ہو جائیں گے، اور جب غیر دینی مقاصد کے لیے دینی علم حاصل کیا جانے لگے گا اور آخرت والے عمل کے ذریعے دنیا طلب کی جانے لگے گی، (مصنف عبد الرزاق) "اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا :"جس نے کوئی ایسا علم حاصل کیا جس کے ذریعے اللہ کی خوشنودی حاصل کی جاتی ہے اور وہ دنیوی فائدہ کے لیے سیکھتا ہے تو وہ قیامت کے دن جنت کی خوشبو بھی نہیں پا سکے گا۔ (سنن ابو داؤد)"[1]

علم کی اشاعت

دینی مدارس کے طلبہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ علم کی نشر واشاعت کا اہتمام کریں جس کی تاکید احدیث سے ثابت ہے۔ حضرت زید بن ارقم کی روایت ہے:

> "رسول اللہ ؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو رونق بخشے جس نے ہم سے کوئی بات سنی اور اسے دوسرے تک پہنچا دیا بسا اوقات کوئی دین کا علم رکھنے والا جس کو بات پہنچاتا ہے وہ اس کے مقابلے میں زیادہ سمجھنے والا ہوتا ہے اور بسا وقات علم رکھنے والا سمجھدار نہیں ہوتا۔" (ابن حبان و بیہقی)

1۔ تعلیم کی اہمیت، ص116

اہل علم کو علم کی نشر واشاعت کا اہتمام کرنا چاہیے کہ اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے، جس علم کو چھپایا جائے گا اس میں کوئی بھلائی نہیں بعینہٖ اس طرح جیسے اس مال میں کوئی بھلائی نہیں جس کو خرچ نہ کیا جائے۔[1]

علم کے آداب

دنیا میں کوئی بھی فن وہنر سیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے مسلمہ انداز وطریقہ کو اختیار کیا جائے تو اسی طرح علم دین کا بھی امتیاز ہے کہ اس کو حاصل کرنے والا ادب واحترام اور مسلمہ طرق تعلیم کو اختیار کرکے ناموری پیدا کر سکتا ہے۔ مولانا محمد اشرف علیؒ نے لکھا ہے کہ اب وقت یہ آگیا ہے کہ طالب علم نہ پڑھنے سے پہلے پڑھتا ہے اور نہ پڑھنے کے بعد پڑھتا ہے یعنی مطالعہ وتکرار سے تہی دامن ہو گیا۔ قحط الرجالی کے اس دور میں اگر دینی علوم کے طلبہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اگر نفع پہنچانے والے بننا چاہتے ہیں تو ان کو تواضع اور انکساری کو اختیار کرنا ہوگا اور اساتذہ کا احترام، کتب اور تعلیمی ادارہ کی اشیاء کا احترام کرنا ہوگا، مطالعہ وتکرار کو معمول بنائیں اور ہر طرح کی برائیوں واور نافرمانیوں سے خود کو بچانا ہوگا کیونکہ امام شافعیؒ کے استاد نے نصیحت کی تھی کہ علم اللہ کا نور ہے اور اللہ کا نور کسی گناہگار انسان کو مل نہیں سکتا۔[2]

فضلاء مدارس کے کرنے کا کام

دینی مدارس کے فضلاء کرام اور طلبہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ خود کو علمی وفکری طور پر اس قدر مستحکم ومضبوط کریں کہ جس کے ذریعہ ان کی علوم وفنون پر کمال مہارت حاصل ہو جائے اور وہ دیگر ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے ساتھ فضلاء مدارس کو عربی زبان میں بھی تحریری وتقریری انداز میں عبور حاصل کرنا ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عالم عربی موجودہ دور میں استعماری سازشوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ عرب ممالک کے باسیوں کا دین پر سے اعتماد اٹھانے اور ان کو دنیا کی لے میں مصروف رکھنے کی منصوبہ بندی کی روک تھام کرنے کے لئے فضلاء مدارس دینیہ کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح فضلاء مدارس ہندوستان میں ہندوازم کے سدباب کے خلاف بھی اپنی ذمہ داری انجام دیں۔[3] (مسلم ممالک میں بھی الحاد ولادینیت اور مادیت کے جن کو بوتل میں بند کرنے کے لئے فضلاء کرام کا کردار اہمیت کا حامل ہے۔ راقم)

علمی حملوں کا جواب

دینی مدارس کے فضلاء ومتعلقین کا انسانی معاشرے میں اسلام ومسلمانوں کے خلاف ظاہر ہونے والی علمی سازشوں کا علمی انداز میں جواب دیا ہے۔ صلیبی حملوں اور تشکیکی ونفرت انگیز مواد کی مزاحمت کے لیے متعدد علمی ادارے بھی قائم کیے گئے ہیں۔ ہندوستان کے مصنفین کے علمی مواد کی شہرت دنیا بھر میں موجود ہے۔ یہاں تک مولانا رحمت اللہ کیرانوی (م 1308ھ / 1891ء) کی کتاب "اظہار الحق" کے بارے میں برطانوی جرائد میں رقم کیا گیا کہ "جب تک شائع ہو رہی ہے تب تک عیسائیت کی تبلیغ کو کامیاب کرنا ناممکن ہے"۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اپنی کتاب میں اناجیل میں موجود تضادات و خامیوں کو علمی اندز میں ثابت کیا۔ اسی طرح علامہ شبلی نعمانیؒ نے مصر کے مشہور مسیحی مصنف جرجی زیدان کی

1۔ تعلیم کی اہمیت، ص99

2۔ نشان منزل، ص65 تا68

3۔ عصر حاضر کا جدید چیلنج اور اہل مدارس کی ذمہ داری، سید ابوالحسن علی ندوی، ناشر صدیقی ٹرسٹ کراچی، پاکستان، س ن، 12-14

کتاب "تاریخ التمدن الاسلامی" کا علمی و کلامی انداز سے ایسا محاسبہ کیا کہ مصر کے مشہور مجلہ المنار کے مدیر علامہ سید رشید رضا بھی علامہ کی تعریف پر مجبور ہوگئے۔ علامہ شبلی نعمانی کی کتاب کا نام "الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی" ہے۔ برصغیر کے مؤلفین کے تحقیقی و تقابلی مطالعہ پر مبنی تالیفات کی مثال عرب ممالک میں بھی بمشکل مل پائے گی۔ متعدد مصنفین اسلام ہیں کہ ان کی کتب کو دنیا میں نمایاں خلعت ملا۔ علامہ شبلی کی "الجزیۃ فی الاسلام" مولانا سید سلیمان ندوی کے خطبات کا مجموعہ "خطبات مدراس"، مولانا عبد الماجد دریابادی کے انگریزی و اردو ترجمہ قرآن، تفسیر، "مشکلات القرآن" میں جدید معلومات و تحقیقات کی روشنی میں قرآن کا اعجاز کتب آسمانی پر فوقیت ثابت کرنا شامل ہے۔ اسی طرح مولانا عبد الباری ندوی کی کتاب "مذہب و عقلیات" وغیرہ کا شہرہ قائم رہا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فضلاء نے عرب ممالک میں قومی برتری کو ثابت کرنے کی کوششوں کے نتیجہ میں اسلامی تعلیمات کے فروغ اور ان پر عملداری میں جو پہلو تہی واقع ہو رہی تھی، استعماری یلغار اور اسلامی احکامات سے انحراف اور بیرون عرب سے یہودیت و نصرانیت اور لادینیت کی سازشوں کا جواب دینے کے لئے عربی زبان میں مقالات و جرائد اور کتب تالیف کر کے مثالی خدمت انجام دی کہ مادیت پرستی و تشکیکی حملہ کرنے والے ناکام ہوگئے۔ ندوۃ العلماء سے البعث الاسلامی، الرائد نے اپنے مقالات میں اور مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنو علمی انداز سے جدید حملوں کا محاسبہ کیا۔ اس سلسلہ میں مولانا محمد الحسنی کی کتب "الاسلام الممتحن" اور "الاسلام بین لا و نعم" کی تالیفات کا مطالعہ کرتے ہوئے کئی عرب مفکرین آبدیدہ ہوگئے اور راقم نے بھی دعوت اسلام کے لئے 72 کے قریب رسائل و خطابات عربی میں ضبط قلم کیے۔[1]

ضبط نفس / احترام قانون

مسلم نوجوانوں کے احوال کے مطالعہ و مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کشیدہ مسائل سے برسرپیکار ہیں کہ ان کو معمولی بات پر سیخ پا ہوتے اور قانون کو ہاتھ میں لیتے دیکھا جاسکتا ہے۔ اخبارات و ٹیلی ویژن پر اس کے چرچے ہیں کہ فلاں مقام پر طالب علموں یا تعلیم یافتہ گروہوں نے ایکسیڈنٹ یا جھگڑے کی وجہ سے گاڑیوں اور عمارتوں کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا ہے۔ اس میں اس بات کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا جاتا ہے کہ حقیقت میں قضیہ کیا ہے بلکہ بات سنی اور اس پر ادھم مچا دیا۔ تعلیمی اداروں کی بدنامی اور تعلیم یافتہ طبقہ کی زبوں حالی کے سبب مسلم معاشرہ کا تشخص بری طرح مجروح ہوتا ہے۔ یورپ کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے جائز حقوق کے لیے بھی نظم وضبط کی پاس داری، احساس ذمہ داری و قانون کی بالادستی کا زندگی میں لحاظ و پاس رکھتے ہیں اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا طریقہ احتجاج و خوشی دونوں میں ارتعاش و شوروغل نہیں ہوتا۔ دینی مدارس کے طلبہ پر بھی لازم ہے کہ وہ بشری تقاضوں کے سبب پیش آمدہ مسائل پر غم و غصہ میں انتہا درجہ تک پہنچنے سے اجتناب کریں بلکہ معاملہ فہمی اور بات چیت کے ذریعہ ہمہ جہتی مسائل کو نمٹائیں۔ ایسا کرنے سے انسانی معاشرہ میں بھی قانون کا احترام، احساس ذمہ داری اور تحمل و برداشت کی ریت چل پڑے گی جو معاشرے کی تعمیر و ترقی اور مستقبل کے لئے نیک شگون ہے۔[2]

تمدن کا بگاڑ

تاریخ انسانی کا عمق نظر سے مطالعہ کیا جائے برابر ہے کہ وہ تاریخ مسلمانوں کی ہو یا غیر مسلموں کی مگر اس میں ایک امر مشترک نظر آتا ہے کہ کوئی قوم جب بھی ہلاکت و پستی سے دوچار ہوئی ہے تو اس کی بنیادی وجہ معاشرتی تمدن کے بگڑ جانا سامنے آئے گی۔ اب بھی ہندوستان و پاکستان

1۔ عصر حاضر کا جدید چیلنج، ص6-9

2۔ تحفہ پاکستان، ص58-64

سمیت مسلم ممالک اور جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیے جن خرافات ورذائل کا ارتکاب موجب ہلاکت ہے اس کی معرفت حاصل کرکے ان سے نجات حاصل کی جائے۔ اس سلسلہ میں ایرانی ورومی تمدن کے بگاڑ کو سمجھنے کے لئے مولانا شبلی کی کتاب "الفاروق"، مولانا عبد الحلیم شرر کی کتاب "تاریخ اسلام" کا مطالعہ مفید ہوگا اور معلوم ہوگا کہ اس وقت کا انسانی معاشرہ ناقابل تصور الجھنوں میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اسی طرح تاریخ اخلاق یورپ اور الف لیلیٰ کی کہانی کا مطالعہ بھی عبرت کے نمونہ کے طور پر کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اطلبہ اور فضلاء موجب گرفت اسباب سے بچاؤ کے لئے پیش قدمی کرتے ہوئے تمام فاسد معاشرتی رسوم ورواج کے راستے میں روکاوٹ ڈالی ہوگی اور معاشرہ کو نیکی و بھلائی کی طرف راغب کرنے کے لیے بطور نمونہ بن کر اپنا کردار ان کے سامنے رکھیں۔[1]۔ قرآن کریم میں بھی ارشاد جل شانہ ہے کہ "**إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ**"[2]۔ ترجمہ: اگر تم علانیہ خیرات (خرچ) کرو تو بہتر ہے اور اگر چھپا کر ضرورت مندوں کی دستگیری کریں تو تمہارے حق میں یہ بہت بہتر ہے۔

عربی / اردو زبان کا تحفظ

برصغیر کے دینی مدارس کے طلبہ پر ضروری ہے کہ وہ زبانوں کی کثرت وفراوانی کے ماحول میں علوم اور فنون میں انفرادیت ویکتائی حاصل کرنے کے لیے کم از کم دو زبانوں پر عبور ضرور حاصل کریں۔ اگرچہ اپنی علاقائی وعالمی زبانوں میں مہارت حاصل کرنا بھی کچھ معیوب نہیں تاہم عربی اور اردو کو بطور خاص پڑھنے کا انتظام کریں۔ عربی زبان قرآن وسنت کو سمجھنے کا واحد ذریعہ ہے اور عربی زبان کو سمجھنے کے لئے صرف ونحو کا علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ لہٰذا اطلبہ ومدارس کے فضلاء علوم شرعیہ کی تفہیم کامل کے لئے عربی زبان[3] کو سیکھیں اور اس کو بطور لکھنے اور بولنے کے طور پر زندگی کا حصہ بنالیں تاکہ دین کا فہم حاصل کرکے اس کے نشرواشاعت کا عرب ملکوں میں بھی انتظام کر سکیں۔ جبکہ اردو زبان کا سیکھنا اس لیے ضروری ہوگیا ہے کہ برصغیر کا علمی ورثہ ماضی میں فارسی اور اب اردو کے اندر جس قدر دستیاب ہے کسی دوسری زبان میں نہیں اور اردو زبان برصغیر کی صرف زبان ہی نہیں بلکہ اس کے تہذیب وثقافت کی محافظ بھی ہے۔[4] جدید دور کے چیلنجز اور انگریزی زبان کو بند آنکھوں کے ساتھ قبول کرنے کی وجہ سے مسلمان معاشرے کی نئی نسل مغرب کے تہذیب وتمدن کی مقلد بنتی جارہی ہے جو مسلم معاشرہ کے مستقبل کے لیے بھیانک ثمرات کا موجب بن جائے گی۔ لہٰذا اطلبہ وفضلاء خود بھی عربی واردو زبان سیکھیں اور ان ہر دو زبانوں کو درجہ بدرجہ فروغ دینے کی کوشش کرکے اسلامی تہذیب وتمدن کی حفاظت کا ذریعہ بنیں۔

لہٰذا موجودہ دور میں دینی مدارس کے فضلا کی ذمہ داری پہلے سے بہت زیادہ بڑھ چکی ہے کہ اب وہ اپنا فرض منصبی ادا کرنے کے لئے فعال ہوں اور اسلام ومسلمانوں کی خدمت انجام دے کر رضائے الٰہی حاصل کرنے کی سعادت پائیں۔

1۔ تحفہ پاکستان، ص84-85

2۔سورت البقرة،271/2

3۔ علماء کا مقام، ص108

4۔ ہندوستانی مسلمان، ص191

یورپ میں استاد و شاگرد

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یورپ میں استاد و شاگرد کا باہمی تعلق عزت و احترام کو موجود نہیں ہے حالانکہ میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ یورپ میں داخلے کے لئے طالب علم سے دفتر میں پہلے ہی پوچھ لیا جاتا ہے کہ وہ کس استاد کو اپنا مربی و مشیر بنانا چاہتا ہے کہ اس کی ہدایات پر عمل کرکے وہ اپنے تعلیمی سفر کو جاری رکھ سکے۔ یہ طریقہ تعلیم بالکل اسی طرح کا ہے جیسے قدیم دینی نظام تعلیم میں طلبہ کا گروپ ایک خاص علم کے استاد سے استفادہ کرنے کے لئے حاضر ہوتے اور ان کی خدمت کرنے اور ان کے احترام و سکون کا لحاظ رکھنے کو معمول بناتے اور جو کچھ استاد علم میں سے عنایت کرتا اس کو لکھ لیتے یہاں تک کہ بعض طلبہ استاد کی خدمت گذاری میں اس قدر محو ہو جاتے کہ وہ اپنے استاد کے علم و عمل کو اپنے اندر جذب کر لیتے مگر افسوس اب اس کی کمی واقع ہو گئی ہے۔[1]

احساس کہتری کا خاتمہ

عصر حاضر میں ایک منظم منصوبہ بندی کے ساتھ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے ایمان و ایقان کو کمزور کرنے کی سعی کی جارہی ہے کہ اب میدانی جنگ کارگر نہیں جبھی مغرب نے مستشرقین کی پرورش کرکے ان پر گراں بہا خزانہ صرف کرکے صرف یہ کام ذمہ لگادیا ہے کہ وہ کسی طور پر مسلم نوجوان کا ایمان و ایقان اسلام پر سے اٹھ جائے اور وہ شریعت اسلامیہ کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگ جائیں۔ اس امر کی بدولت مسلم نوجوانوں میں بدعملی و بداعتمادی کا غلبہ ہوتا جارہا ہے کہ وہ اب یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ موجودہ زمانے میں زندہ رہنے کے لئے اسلام و دین کو الگ کرکے زندگی کے دھارے میں بہنا پڑے گا۔ مسلم نوجوانوں (بیک وقت عرب و عجم) پر ہے کہ تعلیم یافتہ جوان فرانس و یورپ، امریکہ کے فکری اسیر بنانے کا کام زور سے جاری ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی مدارس کے متعلقین اس مسئلہ کی نزاکت کا بغور جائزہ لے کر مدارس اور مدارس کے باہر کے معاشرہ کے تند و تیز سوالات کے کافی و شافی جوابات تیار کرنے کی سعی کریں۔[2]

معرفت ذات

دینی مدارس کے طلبہ کہ ذہن میں جو افسردگی و احساس محرومی جنم لے چکی ہے اس کے خاتمہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ خودداری و خودشناسی کا ہنر اپنی ذات میں پیدا کرے کہ دنیاوی مال و منال سے تہی دامنی یا کمی کے باوجود وہ اپنا سر فخر سے لندر رکھ سکتا ہے کہ اس کے سینے میں علوم نبوت موجزن ہیں اور اس سعادت سے بڑی کوئی سعادت نہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے کلام کی معرفت اور علوم نبوت کا ذوق و شوق حاصل ہو جائے۔ یہ بات بھی ذہن نشین ہونا لازم ہے کہ جب کوئی انسان اپنی نظر میں گر جاتا ہے تو اس کو زمانہ کبھی بھی عزت و عظمت کے مقام پر متمکن نہیں کرتا، ایک عربی شعر میں اسی کو بیان کیا گیا ہے کہ:

نفسک اکرمها فانک ان تهن　　　علیک فلن تلقی من الناس مکرما

1۔ نشان منزل، ص62-63

2۔ یورپ، امریکہ اور اسرائیل، ص14-15

اس میں شبہ نہیں کہ اہل مدارس حقیر نہیں ہیں البتہ ان میں پیدا ہونے والا احساس محرومی خود ناشناسی وخود فراموشی کی بدولت ہے کہ زمانہ کے روز بروز بدلتے تیوروں اور زمانہ کی برق رفتاری کو دیکھ کر نگاہیں متحیر ومتاثر ہوچکی ہیں جب اہل مدارس کے دل میں یہ یقین پیدا ہوجائے کہ دنیا کی ساری تیزی و سرعت اور ترقی فانی ہے اور انسان نے ابد الآباد کی طرف منتقل ہونا اور اس کی تیاری کی ضرورت ہے تو ضرور یہ مہیب سایہ حقارت بھی جھٹ سے ختم ہوجائے گا۔ شاعر نے خوب کہا ہے کہ

اور اگر باخبر اپنی شرافت سے ہو　　　تیری سپہ انس وجن، تو ہے امیر جنود[1]

مدارس کو غنیمت جانیں

مدارس دینیہ کے وجود کو غنیمت جاننے کی ضرورت ہے ان میں پڑھ لکھ کر ہی انسان ملک وبیرون ملک اپنا نام روشن کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اسی سے ملک کی بھی عزت ہوتی ہے، مدرسہ کی قدر کرنا ضروری ہے اور اس کے ساتھ اس کے احتیاج وضروریات کی تکمیل کی ذمہ داری ادا کرنا بھی لازم ہے کہ مدرسہ کو جس بھی مد میں ضرورت ہو تعمیرات، طلبہ کے وظائف اور اساتذہ کی تنخواہوں کے سلسلہ میں تعاون کرنا چاہئے، یہ بات ذہن نشین ہونی چاہئے کہ اگر کوئی ایک بھی طالب ایسا مدرسہ سے پڑھ لکھ کر عملی زندگی میں مصروف عمل ہوا اور وہ نا صرف اللہ ورسول اللہ ؐ کے نام سے واقف ہوا بلکہ اللہ اور رسول اللہ ؐ کے دین سے واقف کرانے میں سرگرم ہوا تو اس سے بہتر صدقہ جاریہ کوئی بھی نہیں۔[2]

اہل عرب کے اعتماد کو بحال کریں

عالم اسلام کو دین اسلام کا اولین پیغام اہل عرب کے طفیل حاصل ہوا اور عرب ہی کی سرزمین کا انتخاب دین اسلام کی نشو نما کے لئے مستقر بنا۔ عہد رفتہ کے ساتھ ہی وہی عرب جن کے احسانات کے بار گراں کے نیچے اہل عجم اور دنیا بھر کے مسلمان دبے ہوئے ہیں، افسوس آج وہی اہل عرب دینی دعوتی تحریکوں سے خائف اس قدر ہوچکے ہیں کہ ان کو یہ خوف امریکہ ویورپ اور اسرائیل سے بھی اتنا نہیں اور اس کے ساتھ اہل عرب کے نوجوانوں کا دین پر سے اعتماد اٹھادیا گیا ہے۔ اگرچہ اس کو بحال کرنے کی کوشش ندوۃ العلماء کے فضلا ومتعلقین نے کی ہے۔[3] ایسے میں دینی مدارس کا یہ کام ہے کہ وہ عربی زبان، انگریزی زبان کے زبان وبیان پر اس قدر عبور حاصل کریں کہ ان کی تحریر وتقریر میں شریعت اسلامیہ کی دائمی افادیت و ضرورت اور تاقیامت رہبری پرچم اسلام کے سائے میں کو بیان کیا جائے یہ سب سن کر اہل عرب کے سینوں میں شمع اسلام جو مندمل ہوچکی ہے پھر سے روشن ہوجائے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہوجائیں کہ ہمیں ہمارا سرمایہ واپس لوٹا دیا گیا ہے۔[4]

1۔ پاجا سراغ زندگی، ص103-104

2۔ طالبان علوم نبوت، حصہ دوم، ص105

3۔ جیسے محمد الحسنی ندوی کی کتاب "الاسلام بین لا ونعم"، اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے مضامین "الی الاسلام من جدید"، "أجاهلية بعد الاسلام أيها العرب؟"، "الی الراية المحمدية أيها العرب" وغیرہ کا شائع ہونے سے اہل عرب متحیر ہوئے کہ برصغیر کے مسلمان ان کو جرأت وبہادری سے اسلام کی جانب متوجہ اور عمل پیرا ہونے کی تلقین کررہے ہیں۔ ماخوذ۔ یورپ، امریکہ اور اسرائیل۔

4۔ یورپ، امریکہ اور اسرائیل، ص21-24

فقر کا خطرہ نہیں

دینی مدارس سے منسلک افراد کو اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ اس نے ان کو انبیاء و صلحاء کے راہ کا رہرو بنادیا ہے، اس کے ساتھ ضروری ہے کہ اہل مدارس دینی تعلیم کے تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے نماز کی پابندی، نوافل کا اہتمام، اپنے اخلاق کو درست کریں کہ زہد و استغناء اور صبر کو جزو زندگی بنائیں، اور یہ بھی ضروری ہے کہ علم و اخلاق کے آداب کو بھی اختیار کریں کہ ان کی ظاہری زندگی بھی اسلامی تعلیمات کا مظہر معلوم ہو سکے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اہل مدارس کے فقر و فاقہ سے دوچار ہونے کا اندیشہ دور دور تک نہیں تاہم ان کی بے رہروی و بھٹکنے اور بے قدری کا خوف لاحق ہے کہ دینی علم حاصل کر کے وہ علم کی بے توقیری کریں جس کے سبب ہمیشہ کی ناکامی ان کا مقدر بن جائے اسی امر کو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان کیا ہے " لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ "[1]۔[2]

اصلاح معاشرہ کی ذمہ داری

دینی مدارس کے طلبہ کو یہ ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ علم دین سے تعلق و رشتہ کی بدولت ان پر اللہ اور اس کے پیارے محبوب پیغمبرؐ کی جانب سے بھاری ذمہ داری یہ عائد ہے کہ وہ اصلاح معاشرہ کا فریضہ انجام دیں کہ انسانی سماج کو فکری و نظری، تعلیمی و تہذیبی، ثقافت و کلچر کے لحاظ سے جن منکرات، بدعات و خرافات، اور رسوم و رواج کے حملوں کا سامنا ہے ان کو مٹانے کے لئے اپنی جدوجہد صرف کرنا ہوگی۔ چونکہ دنیا اس امر پر مصمم ہے کہ مسلم ملکوں اور خود مسلمانوں کو مثل اسپین بنادیا جائے کہ وہ صرف نام کے مسلمان رہ جائیں یا پھر ان کی بیخ کنی کردی جائے کہ وہ اسلام سے وابستگی ظاہر کرنے میں عار محسوس کریں۔ طلبہ مدارس نے یہ اصلاح معاشرہ کا فریضہ انجام دیا، زہد و استغنا سے کام لیا تو اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت ہر موڑ پر دستیاب ہوگی اور یوں ملت اسلامیہ اپنا امتیازی تشخص برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ

مسائل کا استحضار

دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو چاہیے کہ دوران تعلیم آمدہ زندگی کے ہوشربا مسائل کا استحضار و ادارک کرلیں اور ان سے نبرد آزما ہونے کی اپنے اندر صلاحیت پیدا کریں کہ اگر کوئی بھی فرد ان سے نماز کے مسائل، زکوٰۃ کا نصاب و مصارف زکوٰۃ معلوم کرے تو وہ بتاسکتے ہوں اور اسی طرح حج کے ارکان و مسائل کا علم بھی ہونا چاہیے تاکہ اہل علاقہ وان کا قبیلہ اس بات پر فخر کرے کہ ہمارا بچہ دینی تعلیم حاصل کر کے قوم و قبیلہ اور گاؤں کی دینی خدمت ادا کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ یہ صلاحیت دوران تعلیم پیدا کرنے کی ہے کہ مسائل کی اساس و بنیاد اور اس کی باریکیوں اور وسعت کا علم محنت و یکسوئی کے ساتھ حاصل کرلیا جائے۔[3]

1۔سورت ابراہیم،7/14

2۔پاجا سراغ زندگی،ص30-31

3۔طالبان علوم نبوت، حصہ دوم، ص127

مسلک جمہور سے وابستگی

اہل مدارس و اہل دین کے لئے لازم ہے کہ وہ مسلک جمہور پر غیر متزلزل اعتماد کریں، ذہانت و لیاقت میں جس قدر بھی فائق ہو جائیں اور مسائل و امور کو سمجھنے اور حل کرنے کی خداد صلاحیت سے مالامال ہونے کے باوجود مسلک جمہور پر اعتماد اور وابستگی برقرار رہنی چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے جو کام لیا ہے دین کی خدمت کا اس کا مظہر دنیا کے دوسرے مذاہب کے پیرو میں تلاش کرنے سے بھی عنقا ہے۔ مسلک جمہور کو ترک کرنے اور اس کا مذاق اڑانے کے مضر اثرات مرتب ہونا یقینی امر ہے جبکہ مسلک جمہور کو اختیار کرنے اور ان کی خدمت دین کو تسلیم کرنے کی بدولت اللہ تعالیٰ کی آپ پر خصوصی عنایت ہوگی اور اس کی وجہ سے زندگی میں نصرت الٰہی و برکت نصیب ہونے کے ساتھ خاتمہ بالخیر کی دولت سے سرفراز ہونگے۔[1]

اپنا محاسبہ کریں

برصغیر کی اسلامی تحریکیوں کا ربط و تعلق امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی جماعت سے جوڑتا ہے۔ دیوبند و اہل حدیث اور ندوۃ وغیرہ کے متعلقین کو اپنا محاسبہ کرنا ہوگا کہ کیا ہم مراد اصلی جو دین تعلیم کی روح کا ہوتا ہے اس سے منحرف و دور تو نہیں ہو چکے کہیں قرآن کریم کی یہ آیت ہم پر صادق تو نہیں آتی " **أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ** "[2] کتاب کے بعض حصہ کو اختیار کر کے دوسرے حصہ کو فراموش تو نہیں کر چکے، جبکہ ہمیں تلقین تو سارے دین کو اس کی خصوصیات و کمالات کے ساتھ اختیار کرنے کی ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے برصغیر میں اسلامی علوم کو زندہ و جاوید روح کے ساتھ پیش کیا تھا یہ طرز عمل اسلامی تعلیمات کے عین مطابق تھا اسی کو آج بھی زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔[3]

1۔ طالبان علوم نبوت، ص218-219

2۔ سورت البقرۃ، 85/2

3۔ طالبان علوم نبوت، حصہ دوم، ص148

خلاصہ مقالہ

مقالہ ہذا" دینی مدارس کے نظام تعلیم کے بارے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر (تحقیق و تجزیہ)"ایم فل اسلامیات کی تکمیل کے لئے لکھا گیا ہے۔ راقم کی فحص و تحمیص کے مطابق مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور دینی مدارس کے نظام تعلیم پر منفرد کام مختلف زاویوں سے موجود ہے تاہم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر و آراء جو انہوں نے دینی مدارس کے نظام تعلیم سے متعلق قائم کی اس کا جائزہ مقالہ ہذا سے قبل موجود نہیں ہے۔ مقالہ ہذا میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تعلیمی و تدریسی اور دعوتی زندگی کے پس منظر میں ان کے علمی و عملی خدمات کی روشنی میں پیش کردہ فکر و تجزیہ دینی نظام تعلیم اس طور پر درج کیا گیا ہے کہ معلومات کا بنیادی مصدر مولانا کی کتب، اور مجموعہ خطبات کو سمجھا گیا تاہم موضوع مقالہ کی ہمہ گیریت و وسعت کے پیش نظر قرآن حکیم اور احادیث نبویہؐ سے استفادہ کرنے کے ساتھ مولانا کے پر اعتماد متعلمین اور دینی مدارس کے نظام تعلیم کے بارے میں متفکر و ماہرین تعلیم کی آراء کو بھی ثانوی حیثیت سے شامل مقالہ کیا گیا ہے۔ مقالہ تمہید، اور پانچ ابواب پر مشتمل ہے، تمہید کے دو حصے جبکہ پانچوں ابواب کے ہر باب میں تین فصلیں قائم کی گئی ہیں۔

مقالہ ہذا مقدمہ اور تمہید کے دو مندرجات کے ساتھ آغاز کیا گیا ہے۔ مقدمہ میں مقالہ کی ضرورت و اہمیت اور اس کے اغراض و مقاصد وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے اور تمہید کے پہلے حصہ میں تعلیم کی اہمیت و ضرورت کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اجاگر کیا گیا اور دوسرے حصہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے خاندانی، تعلیمی اور علمی و عملی سرگرمیوں کو پیش کیا گیا تاکہ مقالہ میں درج شدہ افکار کی افادیت اہل علم پر واضح ہو سکے کہ جن افکار و نظریات کو مقالہ میں پیش کیا گیا ہے وہ سطحی قسم کے نہیں بلکہ 70 سال سے زائد کی عمر دینی تعلیمی کے حصول اور فروغ میں صرف کرنے والے اور شرق و غرب کی عظیم جامعات و تعلیمی تحریکوں کی سرپرستی و نگرانی اور قربت رکھنے والے کی جانب سے پیش کیے گئے ہیں۔

مقالہ کے پہلے باب میں دینی مدارس کا ساتویں صدی سے بارہویں صدی تک کے ادوار کو بیان کیا گیا کہ ان میں دینی تعلیم کا نصاب تعلیم اور نظام تعلیم کیا تھا اور اس دور میں مدارس کے اساتذہ و طلبہ کے اخلاق و اوصاف کو بیان کیا گیا کہ دینی تعلیم کی تدریس کرنے والوں اور حاصل کرنے والوں کی سیرت کس قدر مثالی و مبنی بر ایثار تھی۔ اس باب میں علم کے فروغ میں اہم تعلیمی مراکز، علم و فن کے فروغ کا موجب بننے والی جگہوں (شہروں) کا بھی تذکرہ درج کیا گیا اور اہل علم کی رشحات علمی کو بھی موجزاً درج کیا گیا۔

مقالہ کے دوسرے باب میں اٹھارویں صدی اور اس کے بعد کے دور میں رائج نصاب تعلیم کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی افکار کی روشنی میں پیش کیا گیا کہ انہوں نے مدارس کے نظام تعلیم کے کن گوشوں کو مثالی سمجھا کہ وہ زمانہ کے تغیر کے ساتھ مفید و کارآمد ثابت ہوئے اور اس کے ساتھ علوم و فنون میں تغیر و تبدل، اخذ و تنسیخ اور اصلاح کا تذکرہ بھی درج کیا گیا کہ نصاب تعلیم کی جامعیت و افادیت مسلم رہے۔

مقالہ کے تیسرے باب میں دینی مدارس کے نظام تعلیم سے متعلق مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر کی روشنی میں درج کیا گیا کہ مولانا نظام تعلیم و مزاج تعلیم کو کیسا دیکھنے کے متمنی تھے کہ دنیا میں مسلمانوں کا نظام تعلیم بالادستی حاصل کرنے کے ساتھ اپنا امتیاز و انفرادیت کا لوہا منوا سکے۔ مولانا مدارس کے نظام تعلیم کو ہمہ جہت علمی و عملی تربیت کے ساتھ زمانہ کے چیلنجز کے مقابلہ کی صلاحیت طلبہ میں پیدا کرنے کا موجب ہونے کو بیان کیا گیا۔ مولانا نے نظام تعلیم میں جن اصلاحات کا تقاضا کیا ان کو بھی رقم کیا گیا۔

مقالہ کے چوتھے باب میں دینی مدارس کے اساتذہ کے علمی و عملی اور اخلاقی اوصاف اور مطلوبہ ذمہ داریوں کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر کی روشنی میں پیش کیا گیا۔ عصر حاضر میں دینی مدارس کے اساتذہ کے مثالی اخلاق اور علمی اوصاف کیا ہونے چاہیں جن کی بدولت طلبہ کی علمی تشنگی کی تکمیل اور غیر محسوس علمی و عملی تربیت کا انتظام بھی ہو جائے اور اساتذہ کا علمی و عملی اور معاشرتی کردار کو بھی بیان کیا گیا۔

مقالہ کے پانچویں باب میں دینی مدارس کے طلبہ کے علمی و عملی کردار اور اخلاقی اوصاف اور ان کا مطلوبہ کردار کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی روشنی میں پیش کیا گیا کہ طلبہ کو علوم وفنون سے کس قدر شغف ہونا چاہیے، اساتذہ سے کیا تعلق ہونا چاہیے، کن اخلاق حمیدہ کو اختیار کرنے اور کن اخلاق رذیلہ سے مجتنب ہونے کی ضرورت ہے۔ موجودہ زمانہ کی برق رفتاری اور اس کے بدلتے معیارات کو مد نظر رکھتے ہوئے خود کو کس طور پر مؤثر اور مقام عالی پر فائز کرنے کی ضرورت کو بیان کیا گیا۔ اس کے ساتھ یورپ کی جانب سے اسلام اور مسلمانوں پر ہونے والے حملوں کے سد باب اور دعوت اسلام کو خوبصورت پیرائے میں دنیا کے سامنے پیش کرنے کی صلاحیت کو زندہ کرنے کی اہمیت کا بیان موجود ہے۔ مقالہ کے آخر میں خلاصہ بحث، نتائج بحث، تجاویز وسفارشات اور فہارس کو بھی درج کیا گیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس مقالہ کی تسوید میں دینی مدارس کے نظام و نصاب تعلیم کی اہمیت و افادیت اور اس میں مطلوب ترمیم و تنسیخ کے عمل کو اختیار کرنے اور اساتذہ وطلبہ کے اوصاف اور ان کے کرداراور عصر حاضر کے چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کی استعداد پختہ کرنے کا داعیہ موجود ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کے جامع نظام تعلی کی تشکیل کی بدولت اپنی عظمت رفتہ کو بحال کرنے کا داعیہ پیدا ہو جائے۔

نتائج مقالہ

مقالہ کے موضوع "دینی مدارس کے نظام تعلیم کے بارے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر" (تحقیق و تجزیہ) پر تحقیقی و تجزیاتی کام نہایت مفید و مؤثر ثابت ہوا کہ اس کی بدولت دینی تعلیم کی افادیت و جامعیت کا علم حاصل ہوا کہ زمانہ کے تغیر و تبدل کے باوجود محسنین اسلام نے اسلام کے علوم و فنون کو کسی بھی دور میں کہنگی یا فرسودگی سے دوچار نہیں ہونے دیا بلکہ دینی تعلیم کے فضلاء کے بڑی بڑی تہذیبوں کو علمی و ثقافتی اعتبار سے شکست سے دوچار کر دیا تھا اگرچہ مسلمان سیاسی میدان میں روبہ زوال ہو چکے تھے۔ عصر حاضر میں یورپ اور اہل یورپ کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کی بدولت مسلم معاشرہ نے دینی تعلیم کے سلسلہ میں افراط و تفریط کا معاملہ روا رکھا ہوا ہے جس کے سدباب و خاتمہ کی ذمہ داری بھی اہل مدارس پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اس بار گراں کو اٹھانے کا انتظام کریں۔ مسلم معاشرہ کے نوجوانوں کی جانب سے تشکیک بھری نظروں اور زندگی سے اہل دین کے کٹ جانے کی سوچ و فکر کے سامنے سد سکندری اپنے وسعت علم اور تحقیق و جستجو کی بدولت قائم کریں۔ مقالہ ہذا کی تسوید میں منکشف ہونے والے اہم نتائج حسب ذیل ہیں:

1۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم عہد نبوی سے لیکر بارہویں صدی تک اپنے وقتوں کے تمام جدید تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا جس کی بدولت صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں امور سلطنت، حرب، اقتصاد و حضارت وغیرہ سبھی میں نمایاں اقدامات تکمیل کو پہنچے۔

2۔ مسلمانوں کے نصاب تعلیم میں دینی و عصری، جدید و قدیم کی تقسیم و تفریق بے اصل اور دین اسلام کی مکمل تفہیم نہ ہونے کا ثمرہ ہے۔

3۔ برصغیر میں رائج قدیم نظام تعلیم بہت سی خصوصیات کا حامل تھا جس میں دین برحق پر کامل یقین و عمل کے ساتھ وقت و حالات کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے دینیات (قرآن، حدیث اور فقہ) کی تعلیم کے ساتھ ان علوم ریاضی، طب، تاریخ اور جغرافیہ وغیرہ کی تعلیم کا اہتمام موجود تھا۔

4۔ قدیم نظام تعلیم سے فراغت حاصل کرنے والے اہل علم نے سیاست، معیشت، عدالت اور سول بیوروکریسی میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔

5۔ قدیم نظام تعلیم کے حامل اساتذہ و طلبہ اخلاص و ایثار، علم ذوق، قناعت، استغناء، باہم محبت و الفت اور عقیدت کی لڑی میں اس قدر پروئے گئے تھے کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا محال تھا۔

6۔ برصغیر کی تعلیمی تحریکوں اور تعلیمی اداروں کا تعارف مع ان کے فرق کو درج کیا گیا تا کہ مقالہ کا مطالعہ کرنے والوں پر اس کی افادیت و ضرورت مستحضر ہو جائے۔

7۔ عصر حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ دینی مدارس میں نظام و نصاب تعلیم اس طور پر مرتب کیا جائے کہ مسلم معاشرہ کا ربط و تعلق دین کے ساتھ مضبوط ہونے کے ساتھ زندگی کے دھارے سے جڑے رہنے کا سامان ہو جائے۔ یعنی مدارس میں علم دین کی تعلیم کے اہتمام کے ساتھ نفع مند جدید علوم سے استفادہ کیا جائے۔

8۔ دینی مدارس کے طلبہ کو قرآن اور علوم قرآن، حدیث اور علم حدیث اور اسلامی فقہ پر کامل مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے کہ مسلم معاشرہ کی حقیقی رہبری کا سامان تیار ہو سکے۔

9۔ دینی مدارس کے طلبہ کو عربی زبان میں لکھنے اور بولنے پر قدرت حاصل ہونی چاہیے تا کہ وہ عرب ممالک میں فروغ پاتے انحرافات و ارتداد قولی و عملی سے عرب اقوام کو بچا سکیں۔

10۔عہد حاضر میں اجتہاد کے دروازہ کو احتیاط کے ساتھ کھولنے کی ضرورت ہے کہ مسلم معاشرہ کو جدید مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لئے درست رہنمائی دی جاسکے۔

11۔صالح معاشرہ کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم بالغاں اور تعلیم خواتین کو غیر معمولی اہمیت دی جائے۔

12۔مسلم معاشرہ کی بہتر تعلیم وتربیت کے لئے ضروری ہے کہ جدید تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے لئے اسلامی اقامت خانے قائم کیے جائیں جہاں پر ان کی دینی تعلیم وتربیت کا اہتمام بھی کیا جائے۔

13۔دینی وعصری دونوں نظام تعلیم میں اصلاح کی ضرورت اور تدوین جدید کی حاجت سے انکار ناممکن ہے کہ ان سے فراغت حاصل کرنے والے باہم دست و گریبان نظر آتے ہیں۔اس بنا پر دینی مدارس کے نصاب و نظام کو اس طور پر دوبارہ مدون کیا جائے کہ ابتدائی دینی و عصری تعلیم ایک ساتھ دیئے جانے کا انتظام ہو اور بعد ازاں تخصص کے لئے الگ الگ شعبہ جات میں تعلیم حاصل کرنے کی استعداد طلبہ میں پیدا ہو جائے۔

14۔دینی مدارس میں علمی استعداد رکھنے والے ماہرین علوم دین کی عدم دستیابی و محرومی حرز جاں امر ہے اس لئے اساتذہ کرام طلبہ میں علم کا ذوق و شوق پیدا کرنے کا مکمل سامان وماحول تیار کریں۔

15۔مغرب کے نظام تعلیم کو یکسر حرف غلط قرار دینا درست نہیں تاہم مغرب کے نظام تعلیم سے صالح کو اختیار کرنا مفید عمل ہے اور فاسد اجزاء کو بیان کرنے کی بھی ضرورت ہے تا کہ مسلم نوجوان اس کے اثرات بد سے مامون ہو سکے۔

16۔دینی مدارس کے اساتذہ کا عقیدہ پختہ،تزکیہ و اصلاح،ان کی زندگی نمونہ عمل،قناعت پسندی ،رسوخ فی العلم،تعصب سے پاک، خوداحتسابی،وسعت مطالعہ،تضادات سے پاک،طلبہ میں دینی جذبہ وذوق پیدا کرنے ،حفاظت عقیدہ و شریعت کے جذبہ سے معمور ہونے کے ساتھ حقائق زمانہ کا ادارک رکھنے کے ساتھ مغرب کے حملوں سے نپٹنے کی صلاحیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

17۔دینی مدارس کے طلبہ کے ضروری اوصاف میں علم میں مہارت اور وسعت نظر، حصول تعلیم میں جان ومال کی قربانی دینے، مقصد زندگی کے تعین، اساتذہ سے والہانہ ربط و ذاتی تعلق ،حفاظت دین کا جذبہ،احساس ذمہ داری و خودداری،علم کے آداب و احترام،اساتذہ و درس گاہ کی قدردانی، تواضع وانکساری،اصلاح معاشرہ کے لئے مسائل کا استحضار،جدید علوم کے ماہرین پر اسلام اور اسلامی علوم کی حقانیت کو ثابت کرنے،جسمانی و روحانی اصلاح کے پیکر ہونے کے اوصاف کو بیان کیا گیا۔

18۔مغرب کے نظام تعلیم کی بدولت پھلنے پھولنے والے تشکیک اور استشراق کے راستے میں سد حائل کرنے کی تربیت مسلم نوجوانوں کو دینے کی ضرورت ہے۔

19۔دینی مدارس کے متعلقین کے اثرات کو معدوم کرنے میں مادیت پرستی کا بڑا دخل ہے کہ مدارس کے فضلا دنیا کمانے اور حاصل کرنے کو اپنی کامیابی سمجھنے لگے ہیں جبکہ رزق کا متکفل اللہ تعالیٰ اور دینی تعلیم کے حاصل کرنے کا مقصد ہرگز معیشت ورزق کمانے کا جذبہ نہیں ہونا چاہیے۔

20۔دینی مدارس کے اساتذہ وطلبہ کا مسلم معاشرہ کے ساتھ ربط و تعلق مضبوط و قوی ہونا چاہیے کہ وہ ناصرف خود عامل دینے ہونے میں سعادت مندی سمجھیں بلکہ اپنے بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کا مکمل اہتمام بھی کرتے نظر آئیں یہ جبھی ہو گا کہ اہل علم اور معاشرہ کے درمیان اعتماد کا تعلق اور باہمی الفت ومحبت ہو گی۔

سفارشات وتجاویز

مقالہ ہذا پر کام کرنے کے بعد مندرجہ ذیل تجاویز وسفارشات پیش کی جاتی ہیں:۔

1۔ مقالہ ہذا "دینی مدارس کے نظام تعلیم کے بارے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی فکر" (تحقیق و تجزیہ) کے موضوع پر اس سے قبل کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا تاہم مولانا کی علمی و دعوتی خدمات وغیرہ پر کام موجود ہے اور مدارس کے نظام و نصاب پر دیگر علمی شخصیات کے افکار پر کام بھی دستیاب ہے تاہم فحص و تمحیص کے بعد یہ علم حاصل ہوا کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اسی سالہ تدریسی و تعلیمی زندگی اور افکار پر اب تک کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عرب و عجم اور مغرب میں برابر علمی خدمات سرانجام دے چکے ہیں اسی بنا پر راقم نے مقالہ ہذا میں صرف برصغیر کے دینی مدارس کے متعلق مولانا کے افکار کو درج کیا ہے۔ تاہم مولانا کے پیش نظر عالمی حالات وماحول کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کا نظام تعلیم کیا ہونا چاہیے؟ اس موضوع پر تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح مولانا نے دینی مدارس کے نظام تعلیم میں جو اصلاحات کے سلسلہ میں نصاب کو حذف واضافہ کیا ہے اس کا بھی دیگر ماہرین تعلیم کی آراء کے ساتھ مقارنہ وموازنہ کرنے کی ضرورت ہے۔

2۔ دین مدارس میں نصاب و نظام تعلیم عہد نبوی کے نصاب و نظام تعلیم کے منہج پر مرتب کیا جائے تاکہ جدید وقدیم کے نبرد آزمائی کا خاتمہ ہو سکے۔

3۔ صحابہ کرام کا اشتیاق علمی اور انداز تعلیم و تعلم کو اساتذہ وطلبہ اپنا رول ماڈل بنائیں۔

4۔ قرآن وعلوم قرآن، حدیث اور علم حدیث اور فقہ واصول فقہ پر طلبہ کو مکمل مہارت حاصل کرنی چاہیے تاکہ جدید علوم کی جانب سے اٹھنے والے سوالات کا بآسانی جواب دیا جاسکے۔

5۔ دینی مدارس کے طلبہ کو اپنی علمی استعداد کو پختہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ دینیات کی تعلیم کا سلسلہ بہتر انداز سے جاری رہ سکے۔

6۔ علم دین کی تعلیم کا مقصد صرف معلومات کا حاصل کرنا نہیں ہونا چاہیے بلکہ معرفت حق کا ذریعہ سمجھنا اور اس کو اپنی زندگیوں میں نافذ کرنا چاہیے۔

7۔ دینی مدارس کے اساتذہ وطلبہ کو اعلیٰ علمی واخلاقی صفات کا حامل ہونا چاہیے تاکہ مسلم معاشرہ پر مثبت اثرات مرتب ہوں چونکہ معاشرہ باریک بینی سے اہل دین کا محاسبہ کرتا ہے اور بدعملی وبداخلاقی کی صورت میں دین واہل دین سے دوری اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

8۔ مغرب اور اقوام مغرب کی جانب سے تعلیمی و تہذیبی حملوں سے مسلم معاشرہ کو محفوظ بنانے کے لئے صالح اور مفید علوم سے استفادہ کرنے کی ضرورت ہے۔

9۔ مسلمان بچوں کی بہتر تعلیم وتربیت کے لئے اسلامی سکول سسٹم قائم کرنے کی ضرورت ہے جہاں پر دینی وعصری تعلیم کی یکساں تعلیم دی جائے اور ثنویت کے مقابلہ وحدت تعلیم کا تصور فروغ پائے۔

10۔ دینی مدارس کے اساتذہ وطلبہ کا اس بات پر کامل یقین ہونا چاہیے کہ رزق کا متکفل اللہ ہے اور دوسروں کو دیکھ کر اپنی معاشی کمزوری پر غمگین ہونے کی بجائے اس سعادت پر سر فخر سے بلند کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کی حفاظت و تعلیم کی سعادت ان کو حاصل ہوئی جس میں ان کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔

11۔ دینی مدارس کے اساتذہ وطلبہ کو عربی / اردو زبان وادب پر دستگیری حاصل کرنی چاہیے کہ اسلامی تعلیمات پر عرب و عجم کی اقوام کا اعتماد ویقین پیدا کرنے کے لئے دعوتی و تعلیمی خدمت بآسانی انجام دے سکیں۔

12۔ دینی مدارس کے متعلقین کو اپنا ربط و تعلق معاشرہ کے ساتھ استوار رکھنے کے لئے ہمہ جہتی جدید وسائل کو اختیار کرنا چاہیے کہ صحافت، سیمینارز، ورکشاپس کے ذریعہ سے معاشرہ میں اسلامی تعلیمات کو اختیار کرنے کے دنیوی واخروی ثمرات کو واضح کیا جاسکے۔

13۔ دینی مدارس کے فضلا کو فکر معاش سے گلو خلاصی حاصل کرنے کے لئے جدید فنون کی مہارت، خطاطی، کمپیوٹر، صحافت، طب و جراحت وغیرہ کی تعلیم بھی دی جانی چاہیے تاکہ وہ معاشرہ میں عزت نفس کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے ساتھ دین کی دعوت منتظمین و حکام ااور امراء کے خوف و خشیت ملامت کے بغیر کا انتظام واہتمام کرسکے۔

14۔ دینی مدارس کے متعلقین کے معاشرہ پر مثبت اثرات مرتب ہونے کے لئے ضروری ہے کہ علمی و فکری غذا حاصل کرنے کے ساتھ روحانی تربیت واصلاح کا بھی اہتمام کریں کہ اس کے بجز اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت حاصل نہیں ہوسکتی۔

15۔ دینی مدارس کے فضلاء کے فرض منصبی میں اہم عنصر یہ بھی ہے کہ معاشرہ کی اصلاح عقائد ثابت پر ایمان کو پختہ کرنے، عبادات کی اہمیت و ضرورت کو ثابت کرنے اور معاملات زندگانی کو شریعت کے مطابق گذارنے کی تلقین کریں اور رسوم ورواج اور بدعات وخرافات سے بچنے کی ہدایت کریں۔

فہرستِ آیات

مقالہ ہذا کی تسوید میں آیات بینات سے رہنمائی لی گئی ان کی تفصیل ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

200	85/2	سورت البقرة	أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ	.15
130	256/2	سورت البقرة	فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ	.16
132	19/59	سورت الحشر	وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ	.17
132	7/10	سورت یونس	إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ	.18
133	128/20	سورت طٰهٰ	قَالَ كَذَلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا وَكَذَلِكَ الْيَوْمَ تُنْسَى	.19
135	50/11	سورت هود	يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ	.20
135	5،8،9/71	سورت نوح	قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا، ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا، ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا	.21
136	60/8	سورت الانفال	وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ	.22
139	21/33	سورت الاحزاب	لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ	.23
149	4/68	سورت القلم	وَإِنَّكَ لَعَلَى خُلُقٍ عَظِيمٍ	.24
149	2/62	سورت الجمعه	هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ	.25
150	12/31	سورت لقمان	وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِلَّهِ	.26
150	39/17	سورت بنی اسرائیل	ذَلِكَ مِمَّا أَوْحَى إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ	.27
150	32/7	سورت الاعراف	قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ	.28
151	77/4	سورت النساء	قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ	.29
157	8/5	سورت المائده	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ	.30
158	6/49	سورت الحجرات	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ	.31
163	125/16	سورت النحل	ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ	.32
163	9/68	سورت القلم	وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ	.33
163	94/15	سورت الحجر	فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ	.34

169	9/59	سورت الحشر	وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ	35.
174	17/13	سورت الرعد	فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ	36.
178	90/12	سورت یوسف	إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ	37.
180	32/22	سورت الحج	ذَٰلِكَ وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ	38.
187	85/17	سورت بنی اسرائیل	وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا	39.
187	10/35	سورت فاطر	مَن كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا	40.
195	271/2	سورت البقرة	إِن تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ	41.
198	7/14	سورت ابراہیم	لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ	42.

فہرستِ احادیث

مقالہ ہذا کی تیاری میں جن احادیث سے استفادہ کیا گیا ہے وہ ذیل میں درج کی جا رہی ہیں۔

نمبر شمار	متن	کتاب کانام	حدیث نمبر	صفحہ نمبر
.1	منْ سَلَكَ طَرِيقًا يَبْتَغِي فِيهِ علْمًا سهَّل اللَّه لَه طَرِيقًا إِلَى الجنةِ	سنن ترمذی	2646	12
.2	مَن خرَج في طَلَبِ العِلمِ ، كان في سَبيلِ اللَّهِ حَتَّى يرجِعَ	سنن ترمذی	2647	12
.3	من طلب العلم كان كفارة لما مضى	سنن ترمذی	2648	13
.4	فضل العالم على العابد كفضلي على أدناكم	سنن ترمذی	2685	13
.5	الا إن الدنيا ملعونة ، ملعون ما فيها إلا ذكر الله وما والاه وعالم او متعلم	سنن ترمذی	2322	13
.6	وإن الملائكة لتضع أجنحتها رضاء لطالب العلم، وإن العالم ليستغفر له من في السموات ومن في الأرض حتى الحيتان في الماء، وفضل العالم على العابد، كفضل القمر على سائر الكواكب، إن العلماء ورثة الأنبياء، إن الأنبياء لم يورثوا دينارا ولا درهما إنما ورثوا العلم، فمن أخذ به أخذ بحظ و افر	سنن ترمذی	2682	13
.7	اغد عالماً، أو متعلماً، أو مستمعاً، أو محباً، ولا تكن الخامس فتهلك	مسند بزار	3626	14
.8	العالم والمتعلم شريكان في الأجر، ولا خيرفي سائرالناس	سنن ابن ماجه	228	14
.9	ياأَيُّهَا النَّاسُ عَلَيْكُمْ بِطَلَبِ الْعِلْمِ؛ إِنَّ لِلَّهِ رِدَاءَ مَحَبَّةٍ، فَمَنْ طَلَبَ بَابًا مِنَ الْعِلْمِ رَدَّاهُ اللَّهُ بِرِدَائِهِ	جامع بيان العلم وفضله	300	14
.10	إنَّ الملائِكَةَ لَتَضَعُ أجْنِحَتَهَا لِطالب الْعِلْمِ رِضًا بِما يَصْنَعُ	سنن ترمذی	2682	13
.11	وإن العالم ليستغفر له من في السموات ومن في الأرض حتى الحيتان في الماء	سنن ترمذی	2682	16،13
.12	لا حسد إلا في اثنتين رجل آتاه الله مالا فسلط على هلكته في الحق ، ورجل آتاه الله الحكمة فهو يقضي بها ويعلمها	صحيح بخاری	73	16
.13	نَضَّرَ اللَّه امْرءًا سمِع مِنا شَيْئًا، فبَلَّغَهُ كَمَا سَمعَهُ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أوْعى مِنْ سَامِعٍ	سنن ترمذی	2657	16

.14	مَنْ سُئِل عنْ عِلمٍ فَكَتَمَهُ، أُلجِم يَومَ القِيامةِ بِلجامٍ مِنْ نَارٍ	سنن ترمذی	2649	17
.15	فتعلمنا الإيمان قبل أن نتعلم القرآن، ثم تعلمنا القرآن فازددنا به إيمانا	سنن ابن ماجه	61	24
.16	ألا وإن في الجسد مضغة: إذا صلحت صلح الجسد كله، وإذا فسدت فسد الجسد كله، ألا وهي القلب	صحیح بخاری	52	114
.17	أُمِرْنَا اَنْ نُكَلِّمَ النَّاسَ عَلٰى قَدْرِعُقُوْلِهِمْ	حاشیہ شہاب علی تفسیر البیضاوی	ص:5/ 381	116
.18	العلماء ورثة الانبياء	سنن ترمذی	2682	13
.19	ثَلاثٌ مَن كُنَّ فيه وجَدَ حَلَاوَةَ الإيمَانِ: أنْ يَكونَ اللَّهُ ورَسولُهُ أحَبَّ إلَيْهِ ممَّا سِوَاهُمَا، وأَنْ يُحِبَّ المَرْءَ لا يُحِبُّهُ إلَّا لِلَّهِ، وأَنْ يَكْرَهَ أنْ يَعُودَ في الكُفْرِكما يَكْرَهُ أنْ يُقْذَفَ في النَّارِ	الجامع الصحیح البخاری	16	131
.20	شَرُّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ	سنن نسائی	1578	132
.21	لا تزال طائفة من امتي قائمة بامرالله ، لا يضرهم من خذلهم	مسند احمد	15596	133
.22	الجهاد ماض منذ بعثني الله إلى أن يقاتل آخر أمتي الدجال لايبطله جور جائر ولا عدل عادل والإيمان بالأقدار	سنن ابی داؤد	2532 ص:185/4	133
.23	مَنْ تَعَزَّى بِعَزَاءِ الْجَاهِلِيَّةِ، فَأَعِضُّوهُ، وَلَا تَكْنُوا	سنن نسائی	8813	140
.24	إنما بعثت لأتمم مكارم الأخلاق	سنن للبیہقی	20782	149
.25	إنَّ الأنْبِياءَ لَمْ يُورِّثُوا دِينارًا وَلا دِرْهَمًا و إنَّما ورَّثُوا الْعِلْمَ	سنن ابن ماجه	223	152
.26	الدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ	المسندالصحیح المختصرلنیسابوری	2956	152
.27	يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين و انتحال المبطلين وتأويل الجاهلين	البدع و النہی عنہا	1	154
.28	كفى بالمرء كذبا ، ان يحدث بكل ما سمع	مسند ابن الجعد	627	158
.29	لا تجتمع امتى على الضلالة	سنن ابن ماجه	3950	164
.30	الا وإن في الجسد مضغة إذا صلحت صلح الجسد كله ، وإذا فسدت فسد الجسد كله الا وهي القلب	متفق علیہ	52	175
.31	استودع الله دينک وامانتک وخو اتيم عملک	مشکاۃ المصابیح	2436	177

فہرستِ اعلام

مقالہ ہذا میں ذکر ہونے والے مشاہیر کے اسمائے کی تفصیل ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

.23	امام مالک بن انس(امام)711-795	147
.24	امان اللہ بنارسی (ہندوستانی عالم)وفات 1133ھ	51
.25	اورنگزیب عالمگیر (مغل بادشاہ)1618-1707ء	144،90،50
.26	بقراط(یونانی سائنسدان)460-370 قبل مسیح	77
.27	بوعلی سینا(ماہر طبیب)980-1037ء	77
.28	پروفیسر الیاس برنی(ہندوستانی عالم دین ومصنف)1890-1959ء	72
.29	پروفیسر خورشید احمد (ماہر تعلیم، اقتصادیات ومصنف)پیدائش 1932ء	39
.30	پروفیسر عبدالعزیز میمن (مصنف)1888-1978ء	147
.31	جالینوس(یونانی طبیب)پیدائش129ء	77
.32	جلال الدین اکبر (مغل بادشاہ)1542-1605ء	162،57،55
.33	نورالدین جہانگیر (مغل بادشاہ)1569-1627ء	163،159
.34	حاجی امداد اللہ مہاجر مکی(صوفی عالم)1817-1899ء	59،58
.35	حاجی محمد عابد(بانی دارالعلوم دیوبند)1834-1912ء	61
.36	حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ(صحابی رسولؐ)602-665ء	162
.37	حضرت ابوایوب انصاریؓ(میزبان رسولؐ)وفات 674ء	16
.38	حضرت ابودرداءؓ(انصاری صحابی)580-653	188
.39	حضرت ابوطلحہ انصاریؓ(صحابی رسولؐ)	169
.40	حضرت ابوھریرہ(مشہور راوی حدیث رسولؐ)	191،21
.41	حضرت آدمؑ علیہ السلام	19
.42	امام محمد بن ادریس الشافعی(امام)767-820ء	192،171
.43	حضرت امیر معاویہؓ(صحابی رسول، اموی خلافت)603-680ء	21
.44	حضرت جابر بن عبد اللہؓ(صحابی رسول)607-697ء	15
.45	حضرت جندب بن عبد اللہ (ابوذرالغفاری)صحابی رسول،652ء	24
.46	حضرت حسنؓ(نواسہ رسولؐ، جگر گوشہ بتولؓ)624-669ء	27
.47	حضرت حسن بصری(محدث وقاضی اور صوفی بزرگ)642-728ء	158،154
.48	حضرت خبیبؓ بن عدیؓ(انصاری صحابی)وفات625ء	170

.75	خیر النساء(والدہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)	28
.76	ڈاکٹر حمید اللہ(محدث ومفسر اور سیرت نگار)2002-1908ء	203،118
.77	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم(شاعر و محقق،ماہر اقبالیات)1959-1893ء	72
.78	ڈاکٹر ذاکر حسین(ماہر تعلیم،سابق صدر ہندوستان)1969-1897ء	155،72
.79	ڈاکٹر علامہ محمد اقبال(شاعر و فلسفی اور مصور پاکستان)1938-1877ء	101،98،86
.80	ڈاکٹر عبدالحلیم محمود(شیخ الازہر،مصر)1978-1910ء	68
.81	ڈاکٹر عبدالعلی حسنی ندوی(طبیب،ناظم ندوۃ العلماء)1961ء	65،55،32
.82	ڈاکٹر محمد عبدہ یمانی(سابق وزیر سعودی عرب)پیدائش1359ھ	40
.83	ڈاکٹر محمود احمد غازی(ماہر تعلیم،سابق وفاقی وزیر پاکستان)2010ء-1950ء	100
.84	ڈاکٹر مختار احمد انصاری(ماہر تعلیم،سابق صدر آل انڈیا مسلم لیگ)1936-1880	72
.85	ڈاکٹر مصطفیٰ الزرقاء(مشہور شامی عالم،فقہ)1999ء-1094ء	84
.86	ڈاکٹر یوسف قراچہ(مشہور ترکی عالم)	32
.87	ڈپٹی نذیر احمد دہلوی(ادیب)1912-1836ء	166
.88	راجہ داہر(سندھ وپنجاب کے آخری ہندو بادشاہ)712-661ء	49
.89	سر سید احمد خان(فلسفی،ماہر تعلیم،سیاستدان)1898-1817ء	70،65
.90	سقراط(یونانی فلسفی)399-469 قبل مسیح	77
.91	سلطان ابراہیم شرقی(جونپور کا بادشاہ)وفات862ھ	56
.92	سلطان شہاب الدین غوری(سلطنت غوریہ کا آخری بادشاہ)1206-1149ء	44
.93	سلطان محمود غزنوی(سلطنت غزنوی کا پہلا بادشاہ)1030-971ء	49،44
.94	سید اسماعیل شہید(مصنف و مصلح اور مجاہد)1831-1779ء	125،58،34
.95	سید جمال الدین افغانی(مصلح والہیات دان)1897-1838ء	71
.96	سید ضیاء النبی حسنی(نانا سید ابوالحسن علی ندوی)1242ھ	28
.97	سید عبدالرزاق بانسوی(بانی سلسلہ قادریہ رزاقیہ)1724-1638ء	59،58
.98	سید علی آزاد بلگرامی(مصنف و محقق)1911-1851ء	53
.99	سید علی ہمدانی(شاعر)1385-1314ء	90
.100	سید فخر الدین حسنی(دادا سید ابوالحسن علی ندوی)	28

.101	سید قطب الدین محمد المدنی (برصغیر میں ان کی بدولت حسنی سادات کو فروغ ملا) وفات 677ء	27
.102	سید قطب (مصر کے مشہور مفسر و ادیب اور سیاستدان) 1966-1906ء	35
.103	سید میر حسن (عالم دین، محدیث، استاد علامہ اقبال) 1929-1844ء	165
.104	حضرت سیدنا ابو بکر صدیقؓ (خلیفہ رسولؐ، سسر رسولؐ) 634-574ء	137
.105	شاہ پیر محمد لکھنوی (صوفی بزرگ) 1672-1619ء	58،51
.106	شہاب الدین محمد شاہ جہان (مغل بادشاہ) 1666-1592ء	44
.107	شاہ رفیع الدین دہلوی (مفسر و محدث) 1818-1750ء	50
.108	شاہ عبد العزیز دہلوی (محدث) 1823-1746	125،50
.109	شاہ عبد القادر دہلوی (مترجم قرآن) 1814-1753ء	50
.110	سید میر فتح اللہ شیرازی (صوفی بزرگ، عالم دین) 1589ء	86،57،50
.111	شاہ فیصل بن عبد العزیز آل سعود (سابق بادشاہ سعودی عرب) 1975-1906ء	38،31،30
.112	قاضی شہاب الدین دولت آبادی 849-761ھ	56
.113	تقی الدین احمد بن عبد الحلیم الحرانی (ابن تیمیہ)	171،162،154
.114	حسن احمد عبد الرحمن البناء (بانی الاخوان المسلمون) 1949ء-1906	30،29
.115	رضی الدین بھاگپوری (ادیب) 1081ء	145
.116	عبد الحق محدث دہلوی (محدث) 1642-1552ء	147،88،47
.117	عبد القادر جیلانی (بانی سلسلہ قادریہ) 1166-1078ء	158،154
.118	عزالدین ابن الاثیر (مؤرخ و محدث) 1233-1160ء	85،31
.119	علی بن حسام الدین المتقی (محدث کبیر) 975-875ء	144
.120	محب اللہ (صوفی بزرگ) 1648-1058ء	145،51
.121	محمد المجذوب (رکن الاخوان المسلمون شام) 1999ء-1907ء	40
.122	محمد طاہر پٹنی (محدث) 984-913ء	144
.123	محمد غوث گوالیار (صوفی بزرگ) وفات 970ء	58
.124	نصیر الدین چراغ دہلوی (صوفی بزرگ) 1356ء-1274	58
.125	یوسف القرضاوی (صدر اتحاد العلماء المسلمین العالمی) 1926ء	39
.126	صلاح الدین ایوبی (بانی ایوبی سلطنت) 1193-1138ء	91

.127	ظاہر بیبرس (بادشاہ مصر)1277-1233	92
.128	عبد القادر جرجانی (عالم نحو)484ھ	172
.129	علامہ ابن الجوزی (محدث، مفسر)1201-1116ء	158
.130	علامہ انور شاہ کشمیری (محدث، فقیہ)1934-1875ء	147،117،64
.131	علامہ سعد الدین تفتازانی (علم بیان وبلاغت کے امام)793-712ء	46
.132	علامہ رشید رضا مصری (تفسیر المنار کے مصنف)1935-1865	147
.133	علامہ سید مرتضیٰ زبیدی (محدث وماہر علم الانساب)1791-1732ء	92
.134	علامہ سید سلیمان ندوی (سیرت نگار و مؤرخ)1953-1884ء	193،170،149
.135	علامہ شبلی نعمانی (سیرت نگار و نقاد)1914-1857ء	193،166
.136	علامہ شیخ علی طنطاوی (شامی عالم، فقیہ اور ادیب)1999-1909ء	68
.137	علامہ عبد السلام ندوی (مصنف و مؤرخ)1955-1883ء	166،67
.138	علامہ مجد الدین فیروز آبادی (عربی لغت القاموس المحیط کے مصنف)1415-1329ء	145
.139	علامہ محب اللہ بہاری (قاضی القضاۃ سلطنت مغلیہ ہندوستان)وفات1708	145،51
.140	علامہ محمد اسد (سابق یہودی لیوپولڈ ویز، مصنف و مترجم، فلسفی)1992-1900ء	106
.141	علاؤالدین خلجی (بادشاہ دہلی، ہندوستان)1316-1266ء	49
.142	غازی محمود دھرم پال (سابق نام عبد الغفور، مرتد ہو کر دوبارہ مسلمان ہوا، متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ بت شکن، ترک اسلام، نخل اسلام وغیرہ)1960-1882ء	162
.143	غیاث الدین بلبن (بادشاہ دہلی، ہندوستان)1287-1216ء	49
.144	فیروز شاہ تغلق (بادشاہ دہلی، ہندوستان)1388-1309ء	49
.145	قاضی ضیاء الدین نیوتنی (ہندوستان میں سلسلہ قادریہ کے آٹھائیسویں امام و شیخ طریقت)1581-1519ء	47
.146	قاضی بدر الدین بن جماعہ (مسجد اقصیٰ و جامع ازہر کے خطیب)1333-1241ء	114
.147	قاضی سلمان منصور پوری (سیرت نگار)1930-1867ء	65
.148	قاضی عبد المقتدر دہلوی (عالم دین)791-702ھ	147،58
.149	خواجہ کمال الدین کشمیری (زین العابدین بادشاہ کی مذہبی رواداری کی پالیسی کی مخالفت کر کے کشمیر سے سیالکوٹ منتقل ہوئے)وفات1187ء	50

.150	لارڈ میکالے(سیکرٹری جنگ برطانیہ)1859-1800ء	106،61
.151	مامون الرشید(پانچویں عباسی خلیفہ)809-763ء	21
.152	عمادالدین محمد بن قاسم ثقفی(فاتح سندھ و مغربی پنجاب ہندوستان اور حجاج بن یوسف کا بھتیجا)715-695ء	49
.153	محمد شاہ تغلق(بادشاہ دہلی ہندوستان)1351-1290ء	49
.154	آل محمد علی خدیو(سلطنت عثمانیہ کے مصر و سوڈان میں آخری بادشاہ)	139
.155	مرزا مظہر جان جاناں(صوفی بزرگ و شاعر)1781-1699ء	151
.156	مصطفی السباعی(شامی عالم فقیہ و محدث)1964-1915ء	86
.157	مفتی تقی عثمانی(جید عالم و فقیہ،سابق جج سپریم کورٹ آف پاکستان پیدائش 1943ء	39
.158	مفتی شفیع عثمانی(تحریک پاکستان کے اہم رہنما)1976-1897ء	140
.159	مفتی محمد عباس لکھنوی(شیعہ مجتہد)1889ء-1809ء	146
.160	ملا احمد جیون(فقیہ و مفسر،صاحب نورالانوار)1718ء-1637ء	54،50
.161	ملا عبدالحکیم سیالکوٹی(عالم)1657ء-1561ء	57،54
.162	ملا ابوالفضل فیضی(بادشاہ اکبر کے نورتن میں سے ایک)1595ء-1547ء	159
.163	ملا ابوالفضل مبارک(بادشاہ اکبر کے نورتن میں سے ایک)1602ء-1551ء	159
.164	ملا محمود جونپوری(ماہر فلکیات)1652ء-1585ء	55
.165	ملا جلال الدین رومی(صوفی بزرگ،کلاسکی فارسی شاعر)1273ء-1207ء	117،49
.166	مولا قاسم نانوتوی(بانی دارالعلوم دیوبند)1880ء-1833ء	151،141،117
.167	مولانا ابوالاعلی مودودی(صاحب تفہیم القرآن)1979ء-1903ء	40،39
.168	مولانا ابوالحسن اشعری(بانی علم کلام)953ء-873ء	117،80
.169	مولانا ابوالکلام آزاد(ادیب و خطیب ہندوستان)1958ء-1888ء	170،148،75
.170	مولانا اشرف علی تھانوی(صاحب بیان القرآن اور بہشتی زیور)1943ء-1838ء	170،146،139
.171	مولانا اعزاز علی امروہی (نویں صدر دارالعلوم دیوبند)1955ء-1882ء	61،32،28
.172	مولانا تقی الدین ہلالی(مراکشی محدث)1987ء-1893ء	32،28
.173	مولانا ثناء اللہ امرتسری(مفسر و محدث)1948-1868ء	65
.174	مولانا حبیب الرحمن شیرانی(وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ)1926ء-1866ء	161،70،65

.175	مولانا حسین احمد مدنی (شیخ الاسلام، صدر جمیعت علماء اسلام ہند) 1957ء-1879ء	170،111،61
.176	مولانا حمید الدین فراہی (مفسر) 1930ء-1863ء	118،69
.177	مولانا خلیل احمد سہارنپوری (فقیہ و محدث) 1927-1852ء	147،63
.178	مولانا رحمت اللہ کیرانوی (صاحب اظہار الحق) 1854ء کو پیدا ہوئے۔	193،117
.179	مولانا رشید احمد گنگوہی (فقیہ و ماہر الٰہیات) 1905ء-1829ء	63،58
.180	مولانا زاہد الراشدی (ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ) 1948ء کو پیدا ہوئے۔	99
.181	مولانا سعید الرحمن الاعظمی (مہتمم دالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو) 1935ء	38
.182	مولانا سمیع الحق (شیخ الحدیث دارالعلوم اکوڑہ خٹک) 2018ء-1937ء	39
.183	مولانا سید سلمان حسینی ندوی (ریکٹر جامعہ سید احمد شہید ملیح آباد کٹولی لکھنو) 1954ء	32،5
.184	مولانا سید علی مونگیری (بانی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو) 1927ء-1846ء	117،78،67
.185	مولانا سید علی نقی مجتہد (شیعہ عالم) 1988ء-1905ء	147
.186	مولانا شبیر احمد عثمانی (مفسر و محدث اور تحریک پاکستان کے مؤید) 1949ء-1887ء	170،147،64
.187	مولانا ظفر احمد عثمانی (مفسر و فقیہ اور تحریک پاکستان کے مؤید) 1974-1892ء	140
.188	مولانا عبد الباری فرنگی محلی (تحریک خلافت کے حامی) 1926-1878ء	193،72
.189	مولانا عبد الحق حقانی (صاحب تفسیر حقانی، بانی دارالعلوم اکوڑہ خٹک) 1267ھ کو پیدا ہوئے	65
.190	مولانا عبد الحلیم شرر (صحافی و ادیب) 1926-1860ء	194
.191	مولانا عبد الحی حسنی ندوی (مؤرخ و سوانح نگار، ناظم ندوۃ العلماء لکھنو) 1929ء-1869ء	166،151،144
.192	مولانا عبد الشکور فاروقی لکھنوی (دفاع صحابہ پر نمایاں کام کیا) 1962ء-1877ء	29
.193	مولانا عبد القادر بدیوانی (مفتی اعظم ہند سلطنت مغلیہ) 1615ء-1540ء	54
.194	مولانا عبد القادر رائے پوری (مشہور صوفی بزرگ) 1962ء-1873ء	32،29
.195	مولانا عبد الماجد دریابادی (مفسر و فلسفی) 1977-1892ء	193،98
.196	مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادی (صوفی بزرگ) 1895-1893ء	181،124،59
.197	مولانا محمد الیاس کاندھلوی (بانی تبلیغی جماعت) 1944ء-1885ء	91،63
.198	مولانا محمد حسین آزاد (شاعر و ادیب) 1910ء-1830ء	166
.199	مولانا محمد رابع حسنی ندوی (صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء) 1929ء کو پیدا ہوئے۔	38،32،30

.200	مولانا محمد زکریا کاندھلوی (صاحب کتاب فضائل اعمال) 1983ء-1898ء	170،147،63
.201	مولانا محمد سالم قاسمی (مہتمم دارالعلوم دیوبند وقف) 2018ء-1926ء	38
.202	مولانا محمد علی جوہر (بانی تحریک خلافت) 1931ء-1878ء	72،23
.203	مولانا محمد یوسف کاندھلوی (صاحب کتاب حیاۃ الصحابہ) 1965ء-1917ء	170
.204	مولانا مسعود عالم ندوی (ماہر عربی زبان وادب) 1954ء-1910ء	92
.205	مولانا مناظر احسن گیلانی (مفسر ومحدث اور مصنف) 1956ء-1892ء	170،147،123
.206	مولانا یعقوب نانوتوی (محدث ومفسر، فقیہ اور مہتمم دارالعلوم دیوبند ہندوستان) 1884ء-1833ء	61،32،29
.207	مولانا یوسف بنوری (بانی جامعہ علوم اسلامی بنوری ٹاؤن کراچی) 1977-1908ء	140
.208	مولانا احمد علی لاہوری (مفسر قرآن) 1962-1887ء	118،32،29
.209	مولانا نظام الدین سہالوی (ماہر تعلیم، بانی نصاب درس نظامی) 1748ء-1677ء	95،86،75
.210	مولوی اسماعیل میرٹھی (جدید اردو ادب کے معروف شاعر) 1917-1844ء	28
.211	نواب صدر یار جنگ (رہنما تحریک پاکستان) 1944ء-1905ء	70
.212	نواب صدیق حسن خان (مفسر ومحدث) 1890-1832ء	92
.213	نواب محسن الملک (آل انڈیا مسلم لیگ کے بانیوں میں سے) 1907-1837ء	70
.214	نواب وقار الملک (آل انڈیا مسلم لیگ کے پہلے جنرل سیکرٹری) 1917ء-1841ء	70

فہرستِ اماکن

مقالہ ہذا میں مذکور اسماء ممالک، شہروں اور علاقوں کو ذیل میں درج کیا جارہا ہے۔

146،31	بیروت (لبنان کا دارالحکومت)	.23
یہ نام پچپن بار ذکر ہوا مقالہ میں۔	پاکستان (ایشائی اسلامی ملک)	.24
64	پٹنہ (ہندوستان)	.25
34	پشاور (پاکستان)	.26
79،75	ترکستان (قازکستان کا شہر)	.27
91	ترکمانستان (وسطی ایشائی ملک)	.28
166،153،95،78،34،32	ترکی (اسلامی ملک)	.29
59	تھانہ بھون (ہندوستان)	.30
141	تیونس (افریقی اسلامی ملک)	.31
56	جزیرہ انڈمان (خلیج بنگال، بحر ہند کا جزیرہ)	.32
31	جنیوا (**سویٹزر لینڈ** کا دوسرا بڑا شہر)	.33
145	جونپور (ہندوستان)	.34
189،155،122،101،80،65،62	چین	.35
62،29	حجاز مقدس، سعودی عرب	.36
146،72،64	حیدرآباد (ہندوستان)	.37
79،75	خراسان (ایران کا پرانا صوبہ)	.38
145	دارفورا (سوڈان کا علاقہ)	.39
139،68،49،40،36،31،7	دمشق (شام کا دارالحکومت)	.40
171،151،17،63،58،50،49،48،46	دہلی (ہندوستان)	.41
49	دیبل (کراچی، پاکستان)	.42
38،31،20	دیوبند (ہندوستان)	.43
64	ڈابھیل (ہندوستان)	.44
139	ڈھاکہ، بنگلہ دیش کا دارالحکومت	.45
69،64،54	رام پور (ہندوستان)	.46
64	راندیر (ہندوستان)	.47
181،61	روس	.48

19	روم(اٹلی کا دارالحکومت)	.49
69	سرائے میر(ہندوستان)	.50
171،137	سمرقند(ازبکستان کا شہر)	.51
46	سنبھل(ہندوستان)	.52
49	سندھ(پاکستان کا صوبہ)	.53
63	سہارنپور(ہندوستان)	.54
40	سوڈان(افریقی ملک)	.55
36،2	شام(عرب اسلامی ملک)	.56
18	طلیطلہ،ہسپانیہ کا شہر	.57
91،68،45	عراق(عرب اسلامی ملک)	.58
155،152،71،70،68،65،4	علی گڑھ(ہندوستان)	.59
84	عمان(عرب اسلامی ملک)	.60
171	غرناطہ(اسپین کا ایک شہر)	.61
44	غزنی،افغانستان	.62
41	فلسطین(عرب اسلامی ملک)	.63
61	قازان(روس کا شہر)	.64
18	قاہرہ،مصر کا دارالحکومت	.65
49،18	قرطبہ،ہسپانیہ کا صوبہ	.66
41،39	قطر(عرب اسلامی ملک)	.67
137	قلعہ الحمراء(ہسپانیہ)	.68
140،39	کراچی(صوبہ سندھ کا دارالحکومت)	.69
31	کشمیر(ہندوستان)	.70
148،64،34	کلکتہ(ہندوستان)	.71
64	کیرالا(ہندوستان)	.72
54،50،47	گجرات(ہندوستان)	.73
58	گوالیار(ہندوستان)	.74

50،49،47	لاہور(صوبہ پنجاب کادارالحکومت)	.75
38	لبنان(عرب اسلامی ملک)	.76
68،58،38	لکھنو(ہندوستان)	.77
171،89،31،2	لندن(برطانیہ کادارالحکومت)	.78
64	مالابار(ہندوستان)	.79
56	مالٹا(بحیرہ روم میں جزائر پر مشتمل ملک)	.80
34	مانسہرہ(پاکستان)	.81
31	متحدہ عرب امارات(عرب اسلامی ملک)	.82
69	مدھیہ پردیش(ہندوستان)	.83
137	مدینۃ الزھراء(اسپین کے بادشاہ کا مقر)	.84
184،40،31،20،17	مدینہ منورہ، سعودی عرب	.85
159،145،141	مراکش(افریقی اسلامی ملک)	.86
یہ نام ستر بار ذکر ہوا مقالہ میں۔	مصر(عرب اسلامی ملک)	.87
31	مکہ مکرمہ(سعودی عرب)	.88
86،50،49	ملتان(پاکستان کا شہر)	.89
106،51،22	الٰہ آباد(ہندوستان)	.90
یہ نام ایک سو پانچ مرتبہ ذکر ہوا مقالہ میں۔	ہندوستان، ایشیائی ملک	.91
64	ویلور(ہندوستان)	.92
38،117،92	یمن(عرب اسلامی ملک)	.93
204،203،197،196	یورپ	.94
14	یونان، یورپی ملک	.95

فہرستِ مصادر و مراجع

مقالہ ہذا کی تیاری میں جن مصادر و مراجع سے استفادہ کیا گیا ہے ان کتب کی تفصیل ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

القرآن الکریم

الاحادیث النبویہ والشریفہ

1. اسلام اور نظام تعلیم، مولانا آفتاب علی۔ ادارۃ المعارف کراچی، اگست 2011ء
2. اسلام کے قلعے، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی
3. اسلامی علوم کے میدان میں اسلام کا انقلابی و تعمیری کردار، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، 1988ء
4. اسلامی ملکوں میں نظام تعلیم و تربیت، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی
5. اسلامی نظام تعلیم، مولانا ریاست علی ندوی، الفیصل ناشران و تاجران کتب لاہور
6. اسلامیات اور مغربی مستشرقین و مسلمان مصنفین، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی
7. اعضان اربعہ، مولانا ولی اللہ فرنگی محلی
8. اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں، اختر راہی، بزم اقبال کلب لاہور، طبع اول 1978ء
9. امریکہ میں صاف صاف باتیں، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی
10. انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی
11. پاجا سراغ زندگی، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی
12. پاک ہندو کے نظام تعلیم و تربیت، مولانا مناظر احسن گیلانی، مکتبہ رحمانیہ لاہور
13. پرانے چراغ، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی
14. تاریخ التعلیم، میجر باسو
15. تاریخ دعوت و عزیمت، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی
16. تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ، (مترجم: عبدالحی خواجہ، مشفق خواجہ)، المیزان ناشران و تاجران کتب، اردو بازار، لاہور
17. تحریک ندوۃ العلماء، مولانا سلمان حسینی ندوی، جمعیت شباب اسلام لکھنو انڈیا، دسمبر 2012ء
18. تحفہ پاکستان، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی
19. تحفہ دکن، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام۔ لکھنو، 1403ھ / 1983ء

20. تعلیم کی اہمیت سنت نبویہ کی روشنی میں،علامہ یوسف القرضاوی،ترجمہ ابومسعود اظہر ندوی،اسلام بک ڈپو لاہور، طبع اول،1998ء

21. تعلیمی سال کے آغاز پر طلبہ سے خطاب،سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی

22. تعمیر انسانیت،سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی

23. تفسیر کبیر،امام فخر الدین رازی،دارالکتب تہران،ایران

24. جنۃالمشرق،سید عبدالحی حسنی ندوی

25. حالات کا نیارخ اور علماء کی ذمہ داری،سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو،انڈیا،1418ھ /1998ء

26. حدیث کا بنیادی کردار،سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی

27. حیات شبلی(سیرت علامہ شبلی نعمانی)سید سلیمان ندوی،دارالمصنفین اعظم گڑھ انڈیا،طبع جدید،2008ء

28. درس گاہ صفہ کا نظام تعلیم وتربیت،تفسیر عباس،زاویہ پبلشر لاہور

29. دریائے کابل سے دریائے یرموک تک،سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی

30. دعوت فکر وعمل،سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات نشریات اسلام لکھنو،انڈیا،طبع دوم144ھ /2003ء

31. روداد چمن،سید محمد الحسنی ندوی، مجلس صحافت ونشریات،ٹیگور مارگ ندوۃ العلماء لکھنو انڈیا،طبع دوم 2013ء

32. سوانح قاسمی،سیرت مولانا قاسم نانوتوی،مناظر احسن گیلانی،مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور

33. طالبان علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں،سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی

34. عصر حاضر کا جدید چیلنج اور اہل مدارس کی ذمہ داری،صدیقی ٹرسٹ، کراچی

35. علماء کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں،سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی

36. الفاروق،علامہ شبلی نعمانی،دارالاشاعت اردو بازار کراچی، 1991ء

37. مآثرالکرام،سید علی بگرامی

38. مدارس اسلامیہ کی ضرورت واہمیت،سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی

39. مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش،سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی

40. مسلمانوں کے موجودہ مسائل ومشکلات،سید ابوالحسن علی ندوی

41. مغرب میں کچھ صاف صاف باتیں،سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی

42. مغربی تعلیم کی مخالفت کیوں؟پروفیسر سید محمد سلیم،ادارہ تعلیمی تحقیق لاہور، 1991ء

43. ملت اسلامیہ کا مقام وپیغام "سید ابوالحسن علی ندوی،مرتب طلبہ بھٹکل دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو، انڈیا،1426ھ /2005ء

44. منتخب التواریخ،سید عبدالقادر بدیوانی،مرکز تحقیقات رایانہ ای قائمہ اصفہان،ایران

.45 منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی

.46 ندوۃ العلماء ایک تعلیمی تحریک، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی

.47 نذرانہ عقیدت، سید فضل ربی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی

.48 نزہۃ الخواطر، سید عبدالحی حسنی ندوی، دارالاشاعت کراچی

.49 نشان منزل، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی

.50 نظام تعلیم پر مغربی رجحانات اور اس میں تبدیلی کی ضرورت، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی

.51 ہمارا تعلیمی نظام، مفتی تقی عثمانی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، 1415ھ

.52 ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟، مولانا سید سلمان حسینی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی

.53 ہندوستان کا نصاب درس اور اس کے تغیرات، حکیم سید عبدالحی حسنی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، 2006ء

.54 ہندوستانی مسلمان، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی

.55 یادایام بعنوان تاریخ گجرات، سید عبدالحی حسنی ندوی

.56 یورپ، امریکہ اور اسرائیل کی حقیقت، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی

.57 Guide to Modern Wickedness

.58 Islam at the crossroad

.59 My Life, A Fragment